قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ2014، قیمت -/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

امیر خسرو اور یوم اردو

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:16، شمارہ:03، مارچ 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر
ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2
خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3
انٹرویو
حمید سہروردی سے مصاحبہ — عبدالحی 6
کور اسٹوری/ امیر خسرو
امیر خسرو دہلوی: رزم و بزم کی بے مثل ہندوستانی شخصیت — ظ انصاری/ ابوالفیض سحر 8
'ہندوی' کا نقاش اول: امیر خسرو — گوپی چند نارنگ 13

امیر خسرو: شیریں زبان ... — کرشن بھاوک 17
امیر خسرو سے متعلق اہم واقعات — حسن الدین احمد 22
زبان و تعلیم
زبان کی تدریس اور بچوں کا ادب — سلیم شہزاد 24

مولانا محمد حسین آزاد — نعمان خان 27
کونسل کا ورکشاپ
کمپیوٹر اساتذہ کا تربیتی ورکشاپ — شاہد اختر 29
ادبی مباحث
افسانچوں کی عالمی گونج — ایم اے حق 32
امداد امام اثر کی انگریزی شاعری — امتیاز عالم 35
خراج عقیدت
بڑا ہے درد کا رشتہ — ابوالکلام قاسمی 39
اب کوئی نہیں آتا ہے یہاں — ویرونود چھابڑا / ترجمہ: صبیحہ انور 44
مشاہیر ادب
ذوق کا نظریہ تعلیم — محمد طیب شمس 48

انتخاب کلام ذوق 49
ہماری مطبوعات
خفیہ بیوی — ملا رموزی 52
ہم نے جنھیں بھلا دیا
مخمور دہلوی — فاروق ارگلی 56
دوسری زبانوں سے
پتول بابو فلمی اداکار (بنگلہ کہانی) — ستیہ جیت رے / ترجمہ: عظیم اقبال 60
صحت
شہد ایک قدرتی غذا اور لاجواب دوا — محمد سفیان 65

سائنس و ٹکنالوجی
ای-اردو بکس — عبدالقدوس 67
کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 71
عالمی اردو نامہ
عالمی خبریں — ادارہ 79
خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80
اشتہار
DAVP

ہماری بات

حضرت امیر ابوالحسن یمین الدین خسرو، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی وہ عظیم الشان شخصیت ہیں جن پر جتنا ناز کیا جائے اتنا کم ہے۔ وقت اور تاریخ کے گھومتے ہوئے چاک پر جن بنیادی عناصر کی گندھی ہوئی مٹّی سے اس یگانۂ روزگار تہذیب کو ایک دل آویز شکل ملی ہے، ان سبھی میں امیر خسرو کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور رہا ہے، اور اسی لیے طوطیِ ہند کا خطاب ان پر سب سے زیادہ پھبتا ہے۔ شاعری ہو یا تذکرہ نویسی، کلاسیکی موسیقی ہو یا لوک سنگیت، شاہی درباروں کے تکلفات ہوں یا خانقاہی زندگی کے فقیری آداب، دنیاوی علوم ہوں یا فلسفۂ روحانیت وتصوف یہاں تک کہ شمشیر زنی ہو یا آلاتِ موسیقی کا ارتقا... ادب، تہذیب اور ثقافت کے تقریباً ہر مقام پر امیر خسرو ہندوستانی زندگی کو سجاتے سنوارتے نظر آتے ہیں۔

والد اُن کے ترک تھے، ماں خالص ہندوستانی اور پیر و مرشد، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین جیسے مایہ ناز صوفی جو ہندوستانی عوام کے مزاج اور فکری رجحان کی مسلم سلطانوں اور بادشاہوں سے کہیں زیادہ گہری سمجھ رکھتے تھے۔ ان عوامل نے جس شخصیت کو جنم دیا وہ شخصیت صرف امیر خسرو ہو سکتے تھے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے، جو اس ملک کو لوٹنے کھسوٹنے کے نہیں بلکہ یہیں رہنے اور بسنے کے ارادے سے آئے تھے، عوامی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں، باہمی اشتراک سے بھی بڑھ کر ایک طرح کے تہذیبی 'منتھن' کو تحرک دیا تھا۔ لسانی سطح پر اس منتھن سے جو اَمرت نکلا اس کا دوسرا نام 'اردو' ہے۔ لفظ ترکی زبان کا۔ دودھ مادر ہند کا۔ انگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سیکھنے تک، ابتدائی پرورش صوفی سنتوں کے ہاتھوں، جن میں پیش پیش تھے حضرت امیر خسرو۔ وہی خسرو جو ترکی، فارسی، عربی اور سنسکرت کے ماہر تھے مگر عام بول چال میں وہی عوامی زبان استعمال کرتے تھے جو اس زمانے میں 'ہندوی' کہلاتی تھی اور بعد کو جسے اردو کا نام دیا گیا۔ امیر خسرو کا اصل شعری سرمایہ فارسی میں ہے لیکن اپنے ہندوی کلام سے انھوں نے اردو شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ اس تعلق سے انھیں اردو کا پہلا بڑا شاعر مانا جانا چاہیے۔ اسی سبب سے پچھلے دنوں قومی اردو کونسل نے ان کے یوم پیدائش 3 مارچ (1253) کو 'یوم اردو' کے طور پر منانے کی تجویز حکومت کے سامنے رکھی، اور خوشی کی بات ہے کہ حکومت نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔

لیکن امیر خسرو کے یوم ولادت کو 'یوم اردو' کے طور پر منانے کا فیصلہ صرف اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ ملی جلی تہذیبی قدروں میں یقین رکھنے والے امیر خسرو اور اردو دونوں اُسی سکّے کا دوسرا رخ ہیں جس کا نام ہندوستان ہے۔ ہندوستان یعنی وہ سرزمین جو کرۂ ارض پر تہذیبی وثقافتی تنوع واشتراک اور سیکولرزم کا واحد سب سے بڑا جغرافیائی خطہ ہے۔ اردو یعنی وہ زبان جسے اس کی مادر وطن ہندوستان سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

زیر نظر شمارے میں اس مرتبہ 3 مارچ کے تعلق سے ہماری کور اسٹوری کا موضوع حضرت امیر خسرو ہیں۔ اس میں ہم نے کوشش کی ہے کہ نہ صرف امیر خسرو کے سوانح اور ان کے فکری رجحانات کا احاطہ ہو جائے بلکہ اردو زبان وادب کے سیکولر کردار کی تشکیل اور سماجی سروکار کے ساتھ ادب کی ہمہ گیری پر اصرار کے تعلق سے ان کی تخلیقات کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی قاری کے سامنے آ جائیں۔ امید ہے 'اردو دنیا' کی اس کوشش کو شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

جمال نصرت

روشنی، 509/148، پرانا حیدرآباد، لکھنؤ

جنوری میں ہی فروری کا شمارہ مل گیا یعنی آپ کی محنت کلینڈر کے بدلنے سے پہلے نیا رسالہ مل جائے۔ بہت بہت شکریہ۔ یہی حال بچوں کی دنیا کا بھی ہے۔ مالیگاؤں کے کتب میلے میں 87 لاکھ کا کاروبار ہوا جو اردو کے لیے خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہے۔ اسی ماہ عشرت علی صدیقی صاحب، کمال احمد صدیقی، فاروق شیخ، ظفر عدیم اور مظہرالحق صاحب پر بروقت مضمون فراہم کر کے اردو دنیا نے بڑا کام کیا ہے۔ اس بار غلام ربانی تاباں اور جاں نثار صاحب پر جو گوشے آئے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ 'تبصرہ و تعارف' کا سلسلہ بھی بہت معیاری ہے۔ یوں تو 15 روپے میں اتنی خوبصورت کوئی بھی چیز نہیں ہوسکتی آپ اگر روپیہ 20 بھی کردیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

الحاج شفیق احمد

استاد مدرسہ انوارالعلوم، رام نگر، ضلع بارہ بنکی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' شمارہ فروری 2014 کے سرورق پر خوبصورت کتابت سے لکھا ہوا کل ہند اردو کتاب میلہ 2014 مالیگاؤں نیز میلے سے متعلق چھپی ہوئی مختلف مواقع کی خوبصورت تصاویر کے علاوہ خصوصی گوشے کے تحت جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں کی خصوصی تصویروں کے ساتھ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اردو دنیا ایک معیاری رسالہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن طباعت میں بھی بے مثال ہے۔ شبنم گورکھپوری سے اشفاق احمد کا لیا گیا انٹرویو بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ شبنم صاحب نے بجا فرمایا کہ کہنے کو سب کہتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیب گنگا جمنی ہے لیکن اس تہذیب کے زیر اثر اردو زبان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کور اسٹوری میں شامل مضامین بہت خوب ہیں، امتیاز وحید نے اپنے مضمون 'کل ہند اردو کتاب میلہ مالیگاؤں' کا آنکھوں دیکھا حال بہت ہی پر اثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اردو کونسل کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے تیسرا علاقائی اردو کتاب میلہ صوبہ مہاراشٹر کے اردو ادب نواز شہر مالیگاؤں میں منعقد کیا۔ اردو کتابوں کی فروخت کا اب تک سب سے بڑا ریکارڈ قائم ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی اس طرح کے میلے منعقد کیے جانے کی ضرورت ہے۔

قومی اردو کونسل جس طرح سے فروغ اردو کے لیے غیر معمولی جدوجہد کر رہی ہے انشاءاللہ مستقبل قریب میں اس کے دور رس نتائج حاصل ہوں گے۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے مالیگاؤں اردو لائبریری کو کونسل کی جملہ مطبوعات تحفہ میں دیا جانا بہت ہی بہتر قدم ہے۔ 'سرزمین ہند کا اردوستان مہاراشٹر' مضمون عبدالعلیم صدیقی نے بہت ہی اچھا لکھا ہے۔ خصوصی گوشہ کے تحت سبھی مضامین بہت خوب ہیں۔

کرشن بھاوک

201-A گلی نمبر 18-K، گورونانک نگر، پٹیالہ

'اردو دنیا' کا شمارہ حسبِ معمول مکمل آب و تاب کے نظر نواز ہوا ہے۔ دونوں بلند پایہ و مایہ ناز شعرا غلام ربانی تاباں و جاں نثار اختر کے فن اور شاعری کو کل آٹھ مضامین میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنے از حد محبوب شاعر تاباں کا یہ شعر ان کی آزاد فطرت و شخصیت کا غماز اور لوگوں کے لیے نصیحت آموز ہے۔ ''عافیت سفینوں کی سیلِ آب میں معلوم / بات یہ ہے کچھ مانجھی سر پھرے بھی ہوتے ہیں۔'' (مجموعہ 'غبارِ منزل')

جاں نثار اختر کی شاعری کی عمدگی، شائستگی اور عظمت کو خدیجہ آئین نے 'گھر آنگن' مجموعہ سے متعلق مضمون میں نہایت خوبی سے نشان زد کیا ہے۔ انھیں یہ بات بھی بتانی تھی کہ اس مجموعے پر اختر صاحب کو 'نہرو کلچرل سوسائٹی ممبئی' نے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اس شاعر کی تمام تر خصوصیات کی ایک وجہ ان کا مقبولِ عام استاد شاعر امیر مینائی کے شاگرد جناب مضطر خیرآبادی کا فرزند ہونا بھی ہے، کیونکہ بطور شاعر مضطر کی ایک مکمل غزل (جس کا مطلع 'نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں')، کو بہادر شاہ ظفر کے نام سے غلطی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ جاں نثار اختر کی رگوں میں بھی والد شاعر کا خون فقط دوڑتے پھرنے سے کہیں زیادہ بقول غالب لہو بن کر ٹپکتا تھا۔

خدیجہ کے اس معیاری مضمون میں 'سولھا سنگار' کے مغالطے سے ایک محولہ رس کا نام تین بار غلطی سے 'سنگھار' لکھا گیا ہے، جبکہ صحیح املا ہے 'شرِ نگار'۔ اسی طرح یوپی کے مہوبا قصبے کے 'پر مردی دیو' نام کے بادشاہ کے ایک درباری شاعر جگنِک نے 'پرمال راسو' عرف آلھا کھنڈ' نام سے ایک عوامی داستاں رقم کی تھی، جس میں مہوبا کے جن دو بہادر سرداروں کی شجاعت کا عوامی قصہ رقم کیا گیا تھا، ان میں 'آلھا' نام تو خدیجہ آئین نے بالکل صحیح دیا ہے، لیکن دوسرے جنگی فوجی کا نام 'رُودل' (ص 32) نہ ہو کر 'اوُدل' تھا۔ اسی مضمون میں 'یہ پھول' کی جگہ 'یہ بھول' (ص 32) الفاظ درکار تھے۔

راشد انور راشد کا اختر سے متعلق مضمون ان کے دیگر مضامین کی طرح بے حد معیاری ثابت ہوا ہے۔ صرف ایک غلطی کی نشان دہی کر رہا ہوں۔ ص 27 پر 'کریہہ' لفظ کا صحیح املا میری دانست میں 'کریہ' درکار تھا۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں، تاکہ سند رہے کہ مجھ جیسے حقیر طالب علم 'اردو دنیا' جیسے اپنے عزیز جرائد کا مطالعہ کتنے انہماک سے مشمولات میں کاملاً مستغرق ہو کر کیا کرتے ہیں۔''

عابد سہیل

(لکھنؤ)

اردو دنیا کے تازہ شمارے میں عشرت علی صدیقی مرحوم پر خلیل صاحب کے مضمون میں چند غلطیاں راہ پا گئی ہیں، جن کی تصحیح ضروری ہیں۔ عشرت صاحب نے بی اے 1926 میں نہیں 1936 میں کیا تھا۔ انھوں نے صحافتی زندگی کا آغاز 'پیغام' (پیام) سے نہیں ہفت روزہ 'ہندستان' ('ذ' اور 'س' کے درمیان 'و' کے بغیر) سے کیا تھا اور یہ کہ 'پیام' لکھنؤ سے نہیں حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔

ساجد اشرف

A 03، اولڈ ایس پی ایس، جے این یو، نئی دہلی

گزشتہ چند برسوں میں 'اردو دنیا' نے آپ جیسی با صلاحیت اور اردو زبان و ادب دوست جیسی شخصیت کے باعث اپنے معیار کو اور بھی بلند کر لیا ہے۔ اس رسالے کی اہمیت و افادیت کئی معنوں میں مسلم ہے۔ اس کا اندازہ پہلی ہی نظر میں اس کے ہر ایک قاری کو ضرور ہو جاتا ہے۔ تازہ شمارے میں اداریہ کے ساتھ ساتھ کور اسٹوری کے تمام مضامین عمدہ و معلوماتی ہیں۔ اس شمارے میں سیدہ جعفر نے اپنے مضمون 'اردو کے پہلے صاحب دیوان کی محبوبہ' میں بھاگمتی کا ذکر کیا ہے۔ دراصل بھاگمتی کی حقیقت کے سلسلے میں ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' اور اس مثنوی کا سبب تالیف اس بحث کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس ضمن میں اگر محمد قلی قطب شاہ کی 'بارہ پیاریوں' کو زیر نظر رکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر حقیقت میں بھاگمتی محمد قلی کی محبوبہ تھی تو اس کا ذکر ان کی 'بارہ پیاریوں' میں ضرور ہوتا اور سب سے پہلے ہوتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ بھاگمتی کا قطعی وجود نہیں ہے۔ بھاگمتی کے ہونے یا نہ ہونے میں دو باتیں ہو سکتی ہیں، پہلی بات تو یہ کہ اگر واقعی بھاگمتی محمد قلی کی محبوبہ تھی تو وہ ان بارہ پیاریوں کی سی محبوبہ نہیں تھی جو فقط ان کے بھوگ ولاس اور کمال ذوق رنگین شاعری کا ساماں ہو بلکہ بھاگمتی کی حیثیت اس کے برعکس ایک باعزت اور با وقار محبوبہ کی رہی ہوگی۔ جسے وہ اپنے قلب و جگر میں بسائے ہوئے تھے، اور وہیں رکھنا چاہتے تھے۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی زندگی میں اس نام کی کسی بھی معشوقہ کا گزر نہیں ہوا تھا، ساتھ ہی 'قطب مشتری' میں مشتری کے علاوہ بھاگمتی سے منسوب شہر، محل وغیرہ کے پس پردہ بھاگمتی کی کوئی حقیقت نہیں۔ انٹرویو میں راغب اختر نے ہمیں یاور عباس جیسی معتبر شخصیت سے اچھے انداز میں متعارف کرایا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مشمولات بھی قابل مطالعہ ہیں۔

محمد منتصر عباسی

نظام پور، گورکھپور

'اردو دنیا' بہت شوق سے ہر ماہ پڑھتا ہوں۔ قابل مبارکباد ہیں وہ سارے اراکین جو آپ کی ماتحتی میں اس رسالے کی ڈیزائننگ، کمپوزنگ و پرنٹنگ وغیرہ میں دل و جان سے لگے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلے کے مقابلے میں اس وقت یہ رسالہ بہت دیدہ زیب، ہر طرح کے ذوق و شوق سے آراستہ اور Eye catching ہو گیا۔ اتنی کم قیمت میں اتنا اچھا رسالہ میں سمجھتا ہوں کہ دوسرا کوئی منظر عام پر نہیں ہے۔ اللہ اِس رسالے کو اور ترقی دے اور قومی اردو کونسل ہمیشہ دائم و قائم رہے۔

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا 480001 (مدھیہ پردیش)

جنوری 2014 کا شمارہ ملا۔ انسان کا وجود کیا معنی رکھتا ہے اس احساس نے فن کاروں کو خدا سے مکالمہ کے لیے مہمیز کیا۔ ان مکالموں میں فکر و فن کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ شجاع خاور نے فن اور بیان کی ایک خاص سطح قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ فارسی ادب سے اردو میں جتنی بھی اصناف شامل ہوئی ہیں ان تمام اصناف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم شعرا نے بھی داد سخن وری دے کر اردو شاعری کو مالا مال کر دیا۔ اردو شاعری میں نعت رسول بیان کرنا ایک محبوب اور روحانی مسرت حاصل کرنے کا موضوع رہا ہے۔

غلام سرور ایک بے باک صحافی، ممتاز سیاست داں اور بے لوث سماجی خدمت گار تھے۔ ان کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف تھی۔ وہ حق کی آواز بلند کرنے سے نہیں چوکتے۔ کیفی اعظمی نے اپنی انقلابی، سماجی اور سیاسی شاعری سے الگ ہٹ کر فلمی گیتوں میں بھی ایک نمایاں حیثیت بنائی۔ ان کے گیت آرٹ و ادب کا حصہ بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ خاص نمایاں نظر آتا ہے۔

ظفر انصاری ظفر

اسسٹنٹ پروفیسر، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

آپ کی انتھک کوشش اور محنت کی وجہ سے اردو دنیا کا معیار روز بروز اپنی بلندیاں طے کر رہا ہے۔ جنوری 2014 کا شمارہ بھی نہایت ہی عمدہ اور معیاری ہے۔ سراج احمد انصاری کا مضمون نوآبادیاتی ادب اور پس نوآبادیاتی رجحان کے علاوہ صالحہ زریں، علی احمد فاطمی، تسنیم بانو اور منیر حسین حرہ کے مضامین بھی عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ رسالے کا وقت پہ نکلنا اس امر کی دلیل ہے کہ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اپنی ذمے داری کو بہ حسن و خوبی نباہ رہے ہیں۔ ان کی انتظامی صلاحیت کی دلیل یہ بھی ہے کہ قومی کونسل کے ذریعے اردو زبان کا فروغ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہو رہا ہے۔

عبیدالرحمن

روم نمبر 42 اولڈ، برہمپترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 2014 پیش نظر ہے۔ کور اسٹوری 'ہمارا آئین، ہماری جمہوریت' کو موضوع بنا کر تحریر کیے گئے مضامین نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ایک عام قاری کو ان مضامین کے ذریعے ہندوستانی آئین، نظام اور جمہوریت کے متعلق واقفیت حاصل ہوگی، نیز اسے ملک کے شہری ہونے کے ناطے اپنے جائز حقوق سے متعلق آگاہی ہوگی۔ ادبی کالم میں سیدہ جعفر نے 'اردو کے پہلے صاحب دیوان کی محبوبہ' عرق ریزی سے لکھا ہے اور محققانہ سعی کی ہے۔ اسی کالم کے تحت محمد ارشد جمال کا مضمون 'اردو شاعری میں علم جراحت کے مشمولات' وقیع اور فکر انگیز ہے۔ اس کے علاوہ شمارے میں شامل 'نیوکلیائی اتفاق' اور 'سائبر دنیا کے اسرار' علمی مضامین ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے 'فکر و تحقیق : نیا افسانہ نمبر' مختصر طور پر عمدہ تجزیہ کیا ہے، جو موصوف کی تنقیدی بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔

نثار احمد صدیقی

معرفت جنتا میڈیکل، اسٹور، اولڈ کریم گنج، گیا، بہار

'اردو دنیا' کا نیا شمارہ ملا، حسب سابق سرورق معنی خیز اور دل آفریں ہے۔ سرورق کے تحت مضامین بھی اچھے اور معلوماتی ہیں۔ ادبی انٹرویوز سے اردو ادب کے کئی ریسرچ اسکالرز استفادہ حاصل کر رہے ہیں، اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ اردو دنیا ایک مکمل رسالہ ہے، اور یہ اب تک اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے ہے۔

خوشبو خاں

مرار پور، گیا، بہار

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ شمارے کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رسالہ دنوں دن ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ رسالہ میرے کمپیوٹر ڈپلوما پروگرام کے دوران مجھے ملتا تھا، کورس مکمل کرنے کے بعد اب میں اس رسالے کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں۔ جنوری کے شمارے میں کور اسٹوری کے

خطوط

تحت آپ نے بے حد معلوماتی مضامین شائع کیے ہیں۔ خواجہ عبدالمنتقم، انظار عالم اور عبدالحی خاں کے مضامین میں ایسے اعداد و شمار ہیں جن پر اردو میں کم مواد ملتا ہے۔ سیدہ جعفر، مقصود دانش، عمیر منظر، صالحہ ذریں اور مظہر حسنین کے مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ رسالے کی ڈیزائننگ، ترتیب و تزئین بھی قابل ستائش ہے۔ تعلیم و تربیت اور نئے موضوعات پر مضامین کی شمولیت کو یقینی بنائیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر، راجیہ سبھا، نئی دہلی

C-501، روز ووڈ، اپارٹمنٹس، میور وہار، نئی دہلی

'اردو دنیا' کے دسمبر 2012 کے شمارے میں بھی متعدد گراں قدر اور معلوماتی مضمون شائع ہوئے جس کی اشاعت کے لیے آنجناب باعث صد تہنیت و تبریک ہیں۔ حسب ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے: اردو ہندی کا لسانی رشتہ، قاضی عدیل عباسی ایک معروضی جائزہ، خاکہ نگاری اور مرزا فرحت اللہ بیگ، مشاہیر ادب کے تحت: درگا سہائے سرور جہان آبادی، صحافت کے تحت: نامہ نگار، تاریخ ابن خلدون کی اہمیت— صحت ایسی اہم چیز پر بھی بڑا مفید مضمون ہے۔

نئے سال جنوری 2014 کا شمارہ بھی اپنی امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اس کے حسب ذیل گراں قدر اور فاضلانہ مضامین بہت پسند آئے: بھارت کا آئین اور دساتیری مہم، ہندوستان کا وفاقی نظام، اردو نعت گوئی اور غیر مسلم شعرا، اردو شاعری میں علم الجراحت— مشاہیر ادب کے تحت: قاضی عبدالغفار، نوآبادیاتی ادب اور پس نوآبادیاتی رجحان ہیں۔

مصطفیٰ ندیم خاں غور

پلاٹ نمبر 4، زرینہ منزل، ورنداون کالونی

قدیم جالنہ، ضلع جالنہ (مہاراشٹر)

'اردو دنیا' دسمبر 2013 میں 'اردو ہندی کا لسانی رشتہ' پڑھا۔ پسند تو آیا مگر بات یہ ہے کہ اکثریت کے دماغوں میں اتنی نفرت بھر دی گئی ہے کہ وہ اردو کا نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے بلکہ اسے سیدھا سیدھا ہندی کہتے ہیں۔ ہماری بات کے ذیل میں آپ نے لفظی اور غیر لفظی زبان کی عمدہ تفہیم کی ہے۔ بالخصوص جسمانی تاثرات (Body language) کے تحت جسمانی وضع قطع آنکھوں کی کیف و کیفیت بعد ازاں تنفس و آواز کے زیر و بم کو جس عمدگی سے زبان کی اساس کے طور پر سمجھایا گیا ہے یہ بس آپ ہی کا حصہ ہے۔ کوراسٹوریز میں آپ چاہے جتنی پاسداری، یکجہتی اور رواداری کا بکھان کریں یہ بات بہرحال ذہن نشین ہونی چاہیے کہ جب تک اردو والے دلوں میں گھر نہیں کر لیتے ان کی زبان کا نام تک ہونٹوں سے ادا نہ ہوگا اور نہ ہی یہ تحریر میں رقم ہوگی۔ اس شمارے کے تمام تر مشمولات درخشاں ستاروں کے مانند ہیں۔ بہن ریشما انجم کا مضمون بعنوان 'انٹرنیٹ سے کمائی کے جائز طریقے' مثل مہ رخشندہ ہے کہ ہر مستحق کی راہیں روشن ہو جائیں۔ لگتا ہے کہ 'اردو دنیا' کا یہ عالمگیر قافلہ منزل مقصود پر پہنچ کر ہی دم لے گا۔

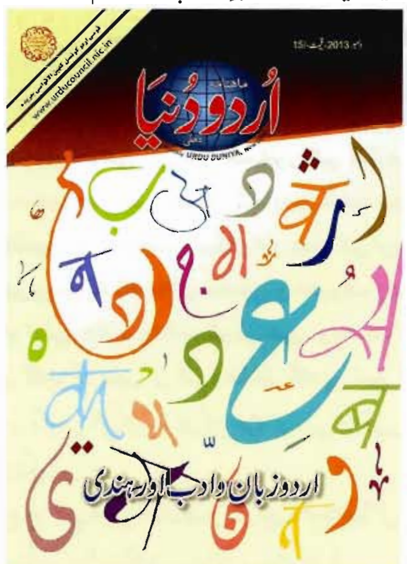

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، ضلع نظام آباد،

(آندھرا پردیش)

دسمبر 2013 کا اردو دنیا کا شمارہ وقت پر ملا۔ سرورق کے حروف تہجی سے اندازہ لگ گیا کہ اردو زبان و ادب اور ہندی میں کتنی قربت اور اختلاط و ارتباط ہے۔ اس طرح کے مضامین سے اردو اور ہندی والوں کو قریب کرنے کا موقع مل گیا اور شکوک و شبہات دور ہوگئے۔ آپ کی بات کالم میں کئی قارئین جن میں دانش ور بھی ہیں، اس کالم کی اشاعت سے اردو دنیا کی کیفیت و کمیت اور خوبیوں و خرابیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کالم تنقیدی کیفیت کا اظہار ہے۔ اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے پروگرام کے تحت موجودہ صورت حال کے بارے میں وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی رپورٹ میں سروشکشا ابھیان، کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ، UGC، جن شکشا سنستھان شامل ہیں لیکن ان میں اقلیتوں کے طلبا و طالبات کی نمائندگی صرف صفر کے برابر ہے لہٰذا ان اسکیمات کے تحت مذکورہ تعلیمی اداروں میں اقلیتوں کی نمائندگی کو یقینی بنائیں تاکہ وہ اس طرح کے تعلیمی ثمرات و پروگرام سے بہرہ ور ہو سکیں۔

مناظر حسین

مڈل اسکول، لکشمی پور، چاکند، گیا

'اردو دنیا' دسمبر 2013 معمول کے مطابق جمال بک ڈپو گیا سے خرید کر پڑھا۔ آپ سب کی کاوشوں نے اسے بلاشبہ بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ مذکورہ شمارہ اردو زبان و ادب اور ہندی پر مشتمل ہے جو اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں کو خوش سلیقگی اور خوش اسلوبی سے واضح کرتا ہے۔ اس نوع کے تمام مضامین لائق مطالعہ اور وقیع ہیں اور بار بار پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تمام قلم کاروں کو میری پرخلوص مبارک باد!

شمس الاسلام فاروقی کا مضمون 'پانی سے علاج ایک قدرتی طریقہ' ایک منفرد اور قیمتی مضمون ہے۔ اس طرح کے مضامین اردو رسائل میں خال خال نظر آتے ہیں۔ براہ کرم اس طرح کے ایک دو مضامین ہر شمارہ میں شائع کریں جس سے عوام و خواص دونوں مستفید ہوں۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

'اردو دنیا' دیکھ کر اور 'ہماری بات' پڑھ کر لگتا ہے کہ اردو زبان ختم ہونے والی زبان نہیں ہے بلکہ تابندہ رہے گی۔ تمام اردو رسائل و جرائد میں 'اردو دنیا' کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

انوار فلک

ابن تیمیہ چندن بارہ، مشرقی چمپارن بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا شمارہ اکتوبر 2013 پہلی بار دیکھا اور پڑھا تو بے ساختہ دل سے صدا نکلی، ہاں! یہ رسالہ نہایت دلکش ہے۔ اس کے اندر آفتاب اردو آب و تاب سے چمکتا ہے اور ادبی بادِ نسیم پوری رعنائی سے تازگی بکھیرتی ہے۔ اس کے سارے مشمولات اپنے اندر معنویت اور علوم کا بحر بیکراں سموئے ہوئے ہیں۔ تاہم اداریہ، انٹرویو، ادبی مباحث، شخصیات، کریئر گائڈ، صحت اور رسائل و اخبارات اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

گزارش

کالم آپ کی بات آپ سبھی قارئین کا کالم ہے۔ اس کالم میں ہم آپ کے مشوروں اور شمارے کے حوالے سے آپ کی آرا کو شائع کرتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ شمارے کی تعریف و توصیف کے علاوہ شمارے میں شائع شدہ تحریروں پر صحت مند تنقید کریں تاکہ قلمکار حضرات اپنی تحریر میں مزید بہتری لا سکیں اور ہم بھی اردو دنیا کو اور خوبصورت اور اعلیٰ معیار کا رسالہ بنا سکیں۔ (ادارہ)

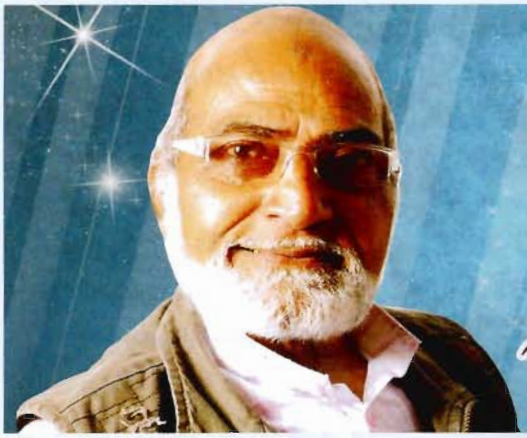

عبدالحی

پروفیسر حمید سہروردی سے مصاحبہ

حمید سہروردی جدید اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہوں نے شاعری بھی کی ہے اور ان کی نظموں کا مجموعہ شش جہت آگ بھی شائع ہوچکا ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر بھی تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں۔ ان کی کتابوں پر مہاراشٹر بنگال اور بہار کی اردو اکادمیوں نے اعزازات دیے ہیں۔ 1960 کے بعد جدید تخلیقی منظرنامے میں حمیدسہروردی کا نام کافی مقبول و معروف رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں عجیب و غریب فضا اور پیچیدگی نظر آتی ہے جو قاری کو اپنی جانب راغب کرتی ہے۔ ریاست کرناٹک کے ادبی تخلیقی منظرنامے میں ان کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ پیش ہے گلبرگہ میں ان کی رہائش گاہ پر لیے گئے انٹرویو کے کچھ اقتباسات۔ (ادارہ)

عبدالحی: اپنی تعلیم اور پرورش کے متعلق مختصراً بتائیں؟

حمیدسہروردی: گلبرگہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر بی اے تک کی تعلیم گلبرگہ ہی میں ہوئی۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑا یونی ورسٹی اورنگ آباد دکن سے ہوئی۔ ڈاکٹریٹ کے نگراں ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ تھے اور موضوع تھا 'جوگندر پال شخصیت اور افسانوی فن'۔ والدین اور دادا حضرت نے بہتر سے بہتر انداز میں پرورش کی اور میری تعلیم پر خاص توجہ کی۔

ع ح: ادب کیا ہے؟

حمیدسہروردی: ڈاکٹر عبدالحی صاحب آپ نے ایک اچھا سوال پوچھا ہے، میں نے اپنی کتاب 'بین السطور' میں لکھا تھا ادب ایک طرح کا ذہنی ہنگامہ ہے جو انسان کے خارج اور باطن میں پیدا ہونے والے تلاطم کو سلیقے اور ترتیب سے صفحۂ قرطاس پر روشن اور منزہ کرتا ہے۔ کوئی بھی بشری علم دانش وبینش کے درون اور بیرون خانوں سے طلوع ہوکر کئی آفتابی کرنوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ادب تخیل کے ذریعے نئے نئے پیکر، نئے نئے استعارے، نئی نئی علامتیں اور نئے نئے مناظر و مظاہر کو وجود دے کر انسانی ذہن کو مبہوت و حیرت زدہ کرتا ہے اور حقیقت کی ان تعبیروں کے ذریعے انسانی خوابوں کی تدبیریں بدل دیتا ہے۔ ادب الفاظ کے مقررہ اور طے شدہ معنوں سے ماورا ہوتا اور ہمہ جہت معنوں کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کی یہ تعریف بآسانی زندگی کی ترجمانی ہوسکتی ہے اور شعوری و لاشعوری طور پر یہی کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے اور اگر ایسا بھی کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ ادب خود ایک زندگی نامہ ہے۔

ع ح: آپ کو جدید افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام حاصل ہے آپ کن افسانہ نگاروں سے متاثر رہے اور کیوں؟

حمید سہروردی: میں نے پریم چند سے لے کر جوگندر پال کے ہم عصروں تک کم وبیش سبھی افسانہ نگاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں حتمی طور پر تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں شعوری اور لاشعوری طور پر کن سے زیادہ یا کم متاثر رہا ہوں۔ میں منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال کو پسند کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے اثرات بھی میرے افسانوں پر رہے ہیں۔

عبدالحی: آپ کے افسانوں کا ایک الگ اسلوب اور انداز رہا ہے پراَسرار فضا سازی میں آپ کا جواب نہیں اس کی کوئی وجہ اس تعلق سے بتائیں؟

سہروردی: آپ نے جو سوال کیا ہے کہ میرے افسانوں کا اسلوب الگ ہے اور میرے افسانوں میں پراسرار فضا سازی بھی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ شعوری طور پر نہیں کیا ہے بس کوئی خیال، کوئی موضوع ذہن میں آتا چلا گیا اور میں لکھتا چلا گیا۔ یہ سب کچھ افسانے کی تکنیک اور موضوع کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ شعور یا لاشعور میں یہ بات ضرور رہتی ہے کہ تخلیقی زبان ہو، موضوع تو فن پارے کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔ پھر زبان و بیان میں وحدتِ تاثر ہو تو قاری کو فن پارہ متوجہ کرتا ہے۔

ع ح: آپ کے سامنے افسانوی ادب کی روشن روایت رہی ہے آپ نے افسانوں میں روایت کی پاسداری کی ہے یا کچھ الگ کہنے کی کوشش کی ہے؟

حمید سہروردی: ہر لکھنے والا ادبی روایت کی پاسداری کو ملحوظ رکھتا ہے اور اس کی خواہش یہ بھی ہوتی ہے روایت میں توسیع کرے اور کہیں ضروری ہو یا تجربے کے طور پر انحراف اور اختلاف کرتا چلا جائے یہ سب کچھ میرے افسانوں میں موجود ہے۔ میں یہاں یہ صراحت اور وضاحت بھی کرتا چلا جاؤں کہ میں نے جدیدیت کے رجحان کے ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ شاید اس وقت جدیدیت سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بس دوستوں نے ہیئتی تجربوں اور زبان کی شکست و ریخت کو جدیدیت کا حصہ تصور کیا اور افسانوں کو جدیدیت کے رجحان کے تحت سمجھ کر ذہنی تعصّبات سے بھی کام لیتے رہے مگر اس سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

ع ح: اردو افسانے میں افسانچہ اور پوپ کہانی کو شامل کیا جارہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

حمید سہروردی: ہر دور میں ہر صنف میں تجربے ہوتے رہتے ہیں جس میں صنفی تقاضوں کے ساتھ تخلیقیت ہو تو افسانچہ اور پوپ کہانی وغیرہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر کاغذ اور روشنائی کا زیاں ہوتا ہے۔ افسانہ خود مختصر ہے اور کیا مختصر ہونا چاہیے۔ ادب میں بہت ساری چیزیں، تخلیقی اور غیر تخلیقی شامل ہوتی ہیں جس تخلیق میں فن پارہ کی صورت گری روشن ہوگی وہ محفوظ رہے گا، پوپ کہانی کا معاملہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کا ہے۔ نہ اس کی کوئی تعریف

ہے اور نہ ہی کوئی جواز، افسانچہ تو مختصر ترین ہے۔ پوپ کہانی مختصر بھی ہوگی اور طویل بھی، افسانہ سے مختلف کیا ہے؟

ع ح: موجودہ افسانے کی صورتِ حال پر آپ کہنا ہیں گے؟

حمید سہروردی: موجودہ افسانے کی صورتِ حال خوش گوار ہے۔ بہت سے نئے پرانے لکھنے والے ہیں جو خوب سے خوب تر لکھ رہے ہیں۔ سلام بن رزاق، انور قمر، فیروز عابد، انیس رفیع، حسین الحق، شوکت حیات، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، معین الدین جینا بڑے، خالد جاوید، بیگ احساس، مشرف عالم ذوقی، نورالحسنین، عارف خورشید، عظیم راہی، صدیق عالم، سید احمد قادری، م ناگ، مقصود اظہر وغیرہ، معین الدین جینا بڑے، خالد جاوید اور صدیق عالم کے افسانے ذہن وقلب میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔ فکر انگیزی بھی ان کے یہاں خوب ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے کئی افسانے نئے موضوعات اور حادثوں پر لکھے ہیں۔ بڑے بے باک افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانہ موضوع کے نیا پن کی وجہ سے متوجہ کرتا ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں پر اظہارِ خیال پھر کبھی—

ع ح: آج اردو زبان اپنے ہی گھر میں اجنبی ہوگئی ہے یا بے اعتنائی کا شکار ہے کیا آپ میرے اس سوال سے متفق ہیں؟

حمید سہروردی: جی! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تقسیم وطن کے فوراً بعد اُردو زبان پر آفت آن پڑی۔ اردو والوں کی نفسیات پر کچھ اس طرح حملہ ہوا کہ یہی زبان ہے جو ملک کی تقسیم کا باعث بنی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اسی زبان نے آزادی کی جدوجہد میں اہم رول ادا کیا ہے۔ تقسیم سے پہلے انگریزوں نے اردو زبان کو تقسیم کرنے کا کام کیا تھا۔ تقسیم کے بعد برادرانِ وطن نے مسلمانوں پر دباؤ ڈالا اور اردو کی جو سرکاری مراعات تھیں ان سے اردو والوں کو محروم رکھنے کی سازش رچی۔ یہ اس طرح اردو والوں کو نفسیاتی طور پر کمزور کرنے کی کوشش کی گئی جو اردو کے مراکز تھے خاص طور پر یوپی سے اردو کا خاتمہ کردیا۔ لیکن زندہ اور طاقت ور زبان جو عوام کے مزاج کا حصہ بن گئی ہے وہ ختم نہیں ہوسکتی، یوپی میں اسکولوں سے اردو کو خارج تو کردیا گیا مگر وہ دینی مدرسوں میں جاری رہی۔ یوپی میں زبان کو نقصان پہنچایا گیا۔ چند برسوں بعد اردو زبان سرکاری مدارس کی سطح پر مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں تیزی سے ترقی کرتی جارہی ہے۔ جب کہ ان ریاستوں میں انگریزی اسکول بھی بڑی تیزی

کوائف: حمید سہروردی

نام: عبدالحمید سہروردی

قلمی نام: حمید سہروردی

آمد: یکم جون 1947 (گلبرگہ، کرناٹک)

تعلیم: ایم اے، پی ایچ ڈی (اردو)

ملازمت: سابق صدر شعبۂ اردو وفارسی گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ

کتابیں: ریت ریت لفظ (افسانے) عقب کا دروازہ (افسانے) بے منظری کا منظر نامہ (افسانے) بین السطور (تنقید) شش جہت آگ (نظمیں)

اعزازات: نثری خدمات ریاستی ایوارڈ برائے 2003، بیسٹ افسانہ ایوارڈ کرناٹک اردو اکادمی بنگلور غالب ایوارڈ غالب کلچرل ایسوسی ایشن بنگلور محمود سعید ایوارڈ برائے فکشن (مجلس ادب بنگلور)

پتہ: سائبان، زبیر کالونی، ہاگر گا کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ 585104 (کرناٹک)

سے کھولے جارہے ہیں۔ انگریزی میڈیم کے اسکول سے نہ صرف اردو کو نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ ریاستی زبانوں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ 1970 کے بعد ریاستی سطح پر اردو اکادمیوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ چند اردو اکادمیوں کا بجٹ بھی اچھا خاصا ہے۔ اب اکادمیوں کا کام ہے اس کا نفع بخش مقصد کس طرح تلاش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ NCPUL اردو کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو حکومت کا ادارہ ہے۔ ابتدا سے ہی فعال رہا ہے ان دنوں زبان کی فروغ اور ترویج کے بہت سارے امکانات پر غور کررہا ہے۔ یہاں تک کہ روزی سے جوڑنے کی بہتر کوششیں بھی جاری ہیں۔ دیر سویر اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ مایوسی کی بات نہیں ہے پُر امید رہنا چاہیے۔ مختلف ٹی وی چینل بھی محدود سطح پر سہی اردو زبان وادب کے پروگرام تیار کررہے ہیں۔

ع ح: اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کا احساس؟

حمید سہروردی: میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ پر امید رہنا چاہیے اس کے لیے ہر سطح پر فعال اور متحرک رہنا پڑے گا۔ نہ صرف اردو کا مستقبل، حال کو پیش نظر رکھ کر ہی مستقبل کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے سارے تعلیمی، ادبی منصوبے مضبوط ہوں اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ جب تک اردو اسکول میں رائج نہیں ہوگی وہ دور تک کا سفر نہیں کرسکے گی۔ بولی جانے والی زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ مستقبل کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے یہ صرف اردو کی حد تک نہیں ہے بلکہ ملک کی تمام زبانوں کا تشویش ناک مسئلہ ہے۔ انگریزی میڈیم کے اسکول ہر زبان کے مستقبل کے لیے چیلنج ہیں۔

ع ح: اردو زبان کو ترقی یا روزگار سے جوڑنے کی باتیں کی جاتی رہی ہیں اس سلسلے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

حمید سہروردی: اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔ اردو کے پرائمری ہائی اسکول بلکہ بارہویں تک مہاراشٹر میں اردو اسکول اور جونیئر کالج ہیں۔ جونیئر کالج کے طلبہ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز میں داخلہ لے رہے ہیں۔ مولانا آزاد قومی اردو یونی ورسٹی بھی بڑی فعالیت کا ثبوت دے رہی ہے۔ مختلف نصابات ترتیب دیے جارہے ہیں۔ اس کے باوجود، ایسا لگتا ہے کہ روزگار کا مسئلہ ذرا بڑھا ہی ہے۔ NCPUL نے تو کمپیوٹر ٹکنالوجی کا جال پھیلا دیا ہے۔ اردو والے روزگار کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ دیکھیے کس حد تک روزگار کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ جہاں اردو والوں کی آبادی 10 تا 15 فی صد ہے وہاں کے علاقائی دفاتر میں اردو جاننے والے اسامیوں کا تقرر کرنا چاہیے۔ بہرحال یہ دور جمہوریت کا ہے۔ سیاسی اور اخلاقی دباؤ اور اثرات ضروری ہیں۔ اردو والوں کی سیاسی بیداری ضرور رنگ لائے گی۔ سیاسی وعدوں سے اس قدر تجربے کار ہوگئے ہیں کہ اب قائد کو خادم ہی بنا کر چھوڑیں گے۔ اردو کا مسئلہ تہذیبی نہ ہوکر سیاسی ہوگیا ہے اب سیاسی حربے استعمال کرنے ہوں گے۔ اردو اکادمیوں میں بیدار ذہن، ہمدرد اور دیانت دار افراد کا تقرر کرنا چاہیے اور اہل اردو کو چاہیے کہ وہ باتیں کم کریں اور کام پر زیادہ توجہ دیں۔

■

Dr. Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

ظ انصاری/ ابوالفیض سحر

امیر خسرو دہلوی

رزم و بزم کی بے مثل ہندوستانی شخصیت

سات سو سال پہلے (694ھ) 42 برس کی عمر میں اپنا تیسرا اور سب سے ضخیم دیوان مرتب کرنے کے بعد امیر خسرو دہلوی نے کہہ دیا تھا کہ یہ 'غرۃ الکمال' ہے۔ تب تک خسرو کے ہزاروں اشعار درباروں، محفلوں، گلی کوچوں، ہاٹ بازاروں میں گائے جا چکے تھے، والیانِ حکومت اُن کی قربت کے آرزومند رہنے لگے تھے اور گاؤں گاؤں شہرت ومقبولیت پہنچ چکی تھی۔

امیر خسرو فی الوقت دنیا کے پانچ ملکوں میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور تاجکستان (سوویت یونین)

پانچ کے عدد کو نہ جانے، ان سے کیا پراسرار نسبت ہے کہ:

72 برس کی پُرآشوب، ہنگامہ طلب اور مصروف زندگی میں وہ پانچ بادشاہوں کے درباری رہے۔ پانچ فرمائشوں پر انھوں نے ایسی پانچ تاریخی مثنویاں لکھیں کہ ان کا جواب آج تک نہ لکھا جاسکا۔ یکے بعد دیگرے پانچ دیوان مرتب کیے، ان سے پہلے فارسی کے کسی شاعر کو یہ توفیق نہ ہوئی تھی۔ اخلاقی اور افسانوی مضامین کی پانچ مثنویوں کا خمسہ مکمل کیا جس میں 17900 شعر ہیں۔ ان کے بعد سے نسل در نسل 'خمسہ' لکھنے کا رواج چل پڑا۔

انھوں نے بیک وقت پانچ زبانوں میں طبع آزمائی کی، جن میں تنہا فارسی کے کم وبیش پانچ لاکھ شعر چھوڑے۔

نثر میں رسائل کے پانچ دفتر 'رسائلِ الاعجاز' لکھ کر یکجا کردیے جو آج بھی تہذیبی تاریخ کے لیے معلومات کا سرچشمہ ہیں۔

پانچ شہروں میں انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ گزارا، کبھی خوشی سے کبھی ناخوشی سے۔

اور اپنے زمانے تک کے پانچ علوم وفنون کی تمام ترقیوں سے آگاہی، بلکہ معرفت حاصل کی۔ آج امیر خسرو کا مطالعہ کرنا، اُن کی یاد تازہ کرنا، محض ایک بڑے شاعر، پچھلی دنیا کے ایک اہم مصنف، فنکار سے آگاہی یا لطف اندوزی ہی نہیں — بلکہ ہندوستان کے موجودہ ہزار سال دور کی پہلی مرکزی سلطنت، کل ہند نظام حکومت کے تانے بانے اور اس کی قوت کے راز معلوم کرنا بھی ہے۔ شمس الدین التتمش کے تسلط (1220) سے لے کر محمد تغلق کی تخت نشینی (1325) پورے سو سال وہ کون سا دستِ غیب تھا جو ہندوستان کو سیاسی جبر اور تہذیبی سماجی اختیار کے ساتھ ایک رشتے میں پروتا بھی گیا اور اسے روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت کی حیثیت سے بچائے بھی رکھا۔

امیر خسرو کی سیرت اور بصیرت کی تلاش میں ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اس نقطۂ اتصال پر براجمان ہیں جہاں اسلام کی چھ صدیاں اُن سے آگے گئیں اور چھ صدیاں ان کے بعد گزریں۔ تب تک کے سیاسی تہذیبی حالات میں اسلام کی اثراندازی اور اثرپذیری کا رنگین، بھرپور اور جاندار منظر جو امیر کی تحریروں اور سرگرمیوں سے ہم پر کھلتا ہے وہ ہمیں آج کے حالات کا تقابلی مطالعہ کرنے میں اور مستقبل کے ہندوستان اور اسلام کے باہمی رشتے جاننے میں مدد دیتا ہے—

وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین جو افغانستان سے ربط ضبط رکھتا تھا، سمرقند کے نزدیک شہر کش سے جو دو سو برس بعد شہر سبز کہلایا چنگیز خانی خونخوار حملوں میں بے وطن ہوا اور بلخ میں آبسا جو اس وقت تک زبردست قلعہ بند اور تہذیبی مرکز شمار ہوتا تھا۔ 1220 میں ایک زبردست منگول فوج خود چنگیز خاں کی سالاری میں سمرقند اور بخارا کو تباہ اور مسمار کرکے بلخ کی طرف بڑھی اور اگلے سال 1200 مسجدوں اور 200 حماموں کے اس عظیم شہر میں بھی

کوئی چراغ جلانے والا نہ رہا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کے ایک 'ہزارہ' شاخ کے پناہ گزیں سردار، حملے کے وقت یا حملے سے پہلے بلخ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ پنجاب اور دریائے سندھ کی وادی اس وقت چنگیزی خونخواری سے سہمی ہوئی تھی۔ دہلی کے ہوشیار، موقع شناس سلطان شمس الدین نے خوارزم شاہی ترک سپہ سالار جلال الدین کو نہ صرف یہ کہ مدد دینے سے انکار کردیا بلکہ حیلے حوالوں اور فوجی تدبر سے پنجاب میں اس کی سرگرمیاں توڑ دیں اور یوں اپنے سرحدی علاقے کو خوف ناک جنگی میدان بننے سے بھی بچا لیا اور اپنے یہاں ادھر کے اجڑے ہوئے بہترین شہسواروں کو ملازمت یا پناہ دینے کی راہ بھی ہموار کرلی۔ سیف الدین محمود انھی میں سے ایک تھے۔ چند سال معمولی خدمتوں پر رہنے کے بعد انھیں متھرا سے ایٹہ جانے والی شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی قصبے (عرف مومن آباد) میں چھوٹی سی جاگیر دے دی گئی۔ غالباً افغانوں سے دور کی قرابت کو مدنظر رکھا گیا، یا پھر اس شورہ پشت علاقے میں جہاں افغانوں کی تین گڑھیاں تھیں مرکزی حکومت نے اپنا وفادار نگہبان بٹھادیا۔

سیف الدین محمود کی شادی ایک سیاہ فام ہندوستانی امیر عمادالملک کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی جو شوہر کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی اکثر پٹیالی میں رہی، چار بچے ہوئے، 3 لڑکے، ایک لڑکی۔ یمین الدین محمود ان میں منجھلے تھے، جو 1252 (651ھ) میں پیدا ہوئے اور بعد میں اپنے تخلص اور موروثی خطاب 'امیر' کے جوڑ کی بدولت امیر خسرو کہلائے۔

پس منظر کی یہ ہلکی سی تفصیل اس لیے ضروری ہوگئی ہے کہ بعض لوگ انھیں 'بلخی معروف بدہلوی' لکھتے ہیں، بعض ان کے والد کو 'شمسی غلام' حالانکہ امیر خسرو کے اپنے بیانات اور معاصر تاریخیں اور تذکروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

یمین الدین نے صرف سات برس کی عمر تک باپ کو دیکھا، وہ بھی وقفوں سے، کیونکہ وہ جنگی معرکوں پر باہر جاتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی خانہ نشین امیرزادی ماں کو، ماموں کو، نانا کو دیکھا، جانا، اُنھی سے باپ کے قصے سنے ہوں گے کہ وہ لکھتے ہیں:

''گویائی جو انسان کی بہترین صفت ہے اُنھیں غیب سے جی بھر کے ملی تھی، مگر خاموش پسند آدمی تھے.. ترک صفت سوتے میں فرشتہ ہوتے ہیں مگر میرے باپ جاگتے میں فرشتہ تھے، ایسے نیک چلن تھے کہ کالی آنکھوں

والی حور کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتے...''

اس سے کہیں زیادہ تفصیل اپنے نانا کے بیان میں دی ہے جو ایک سو تیرہ برس کے ہوکر مرے۔ تب خسرو تیس سال کے تھے۔ نانا عمادالملک کے بارے میں

امیر خسرو کی سیرت اور بصیرت کی تلاش میں ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اس نقطۂ اتصال پر براجمان ہیں جہاں اسلام کی چھ صدیاں اُن سے آگے گئیں اور چھ صدیاں ان کے بعد گزریں۔ تب تک کے سیاسی تہذیبی حالات میں اسلام کی اثراندازی اور اثرپذیری کا رنگین، بھرپور اور جاندار منظر جو امیر کی تحریروں اور سرگرمیوں سے ہم پر کھلتا ہے وہ ہمیں آج کے حالات کا تقابلی مطالعہ کرنے میں اور مستقبل کے ہندوستان اور اسلام کے باہمی رشتے جاننے میں مدد دیتا ہے

بتاتے ہیں کہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک تھے۔ ستر سال عارض ممالک (سکریٹری محکمہ رہے بخشی گری) دو سو ترک غلام، دو ہزار ہندو (پیدل) اور دو ہزار سوار ان کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔

خسرو ننھیال میں پلے تھے، ننھیال سے عشق تھا، اسی کے تربیت یافتہ اور طرف دار ثابت ہوئے۔

جس علاقے میں رہے وہ برِج (یا بُرج بھاشا) کے لیے سَنَد کا درجہ رکھتا ہے۔ کرشن نگری ہونے کے باعث برج کے گیت اور بھجن اپنی مٹھاس، وسعت، نفاست میں ادبی شان اختیار کرچکے تھے۔ نانا کا قیام دہلی میں تھا، بڑی حویلی، باہر خدمت گاروں اور رشتہ داروں کے مکانات باپ کے انتقال کے بعد خسرو اکثر دہلی آئے گئے۔ ان کی مکتبی تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ اچھی صحبت بھی یہیں میسر آئی۔ طبیعت میں بچپن سے کھلنڈراپن تھا۔ ''دودھ کے دانت گرتے وقت منہ سے موتی جھڑتے تھے۔'' بھری محفل میں شعر سنانے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ 1227 تک انھوں نے آزادی اور بے فکری کے دن گزارے۔ شعر کہے، سنائے، داد پائی اور ذی علم دوستوں (مثلاً تاج الدین زاہد) کے کہنے پر ایک دیوان 'تحفۃ الصغر' کے نام سے تیار کردیا۔

جب وہ اپنی عمر کے 20ویں سال آزادانہ تلاش معاش کے لیے نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک اچھا خاصا دیوان اُن کے ساتھ تھا۔ چھوٹتے ہی سلطان کے شاہ خرچ بھتیجے علاء الدین کیشلو خاں (کشلی خاں یا ملک چھجو) نے اپنے دربار کی زینت بنایا۔ کول (علی گڑھ) اس کی جاگیر میں تھا۔ وہاں بھی اس کے ہمرکاب جاتے ہوں گے۔ تاہم شروع سے ہی اس کی نظر میں چڑھے اور آئے دن کی بخششوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ محفل اُن کے دم سے رونق پاتی اور وہ محفل کی خاطر، نہ صرف غنائی شعر لکھتے بلکہ اس کی نغماتی ادائیگی کی تیاری بھی کرتے۔ سنگیت کی چاٹ اُنھیں پڑ چکی تھی۔

خسرو، ملک علاء الدین کشلی خاں کے ہاں شاعر خاص بن کر دو سال رہے۔ یہ وہ نوجوان تھا جس کے باپ اور چچا (بلبن) غلام کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئے تھے۔ امیر خسرو کو اپنا یہ پہلا ممدوح بے حد پسند تھا۔

دوسرا سخی جس نے اپنی بے نیازانہ طبیعت اور عالی ظرفی میں نام پایا۔ خود بادشاہ کا بڑا بیٹا بغرا خاں تھا۔ ایک بار وہ اپنے چچازاد بھائی کے مکان پر اپنے خاص شعروں اور علمائے وقت (شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر) کو ساتھ لیے ہوئے مہمان تھا۔ محفل جمی، سب نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خسرو اپنی وجاہت، اپنے کلام اور ادائیگی، دونوں سے چھا گئے اور ان پر اشرفیاں بھی برسیں اور بغرا خاں نے اٹھنے سے پہلے انھیں طشت بھر کر 'نقرۂ خام' بھی دیا۔ خسرو کی چاندی ہوگئی لیکن کشلی خاں کے چہرے کا رنگ بدل گیا— اور برتاؤ ایسا بدلا کہ

... خواست کہ مرا نشانۂ بلاسازد... خیال آں ہم دردلم بگزشت... چوں تیر بجستم و چلّہ کردم و برعزم خدمت

ملوک سامانی، راہ سامانہ پیش گرفتم..''

بِکشلی خاں کے غصے کا تیر لگنے سے پہلے ہی وہ تیر کی طرح نکلے اور سیدھے بغرا خاں کے پاس سامانہ پہنچ گئے۔

ناصرالدین بغرا خاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنا لیا۔ مزے میں گزرنے لگی۔ یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی ہوگی اور اس کے لوک گیتوں کی لے— جو ہندوستان اور خراسان دونوں کے سنگیت سے الگ اپنا بانکپن رکھتی تھی۔

اُن کے مراتب بلند ہوتے جا رہے تھے کہ ناگاہ بنگال میں وہاں کے بلبنی گورنر طغرل نے بغاوت کر دی۔

بغرا خان کو حکم ہوا کہ پنجاب کی فوج لے کر بنگال کی طرف بڑھے۔

1279 میں لکھنوتی— جو بنگال کے گورنر کا صدر مقام تھا، دہلی اور پنجاب کی فوج کی تلواروں سے سرخ ہوگیا۔ معاصر ادب اور تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنوتی (موجودہ مرشدآباد) میں سرِ بازار پھانسیاں اور ٹکٹکیاں لگائی گئیں، مشتبہ ملازموں اور ملزموں کو بیل اور گدھے کی کھال میں بھروایا گیا اور اتنی دہشت پھیلائی کہ خود شہزادہ بغرا خاں تھرا گیا۔ اسے گورنر مقرر کر کے 'خبرداری اور بے رحمی' برتنے کی نصیحتیں کر کے جب بلبن کئی مہینے بعد واپس ہونے لگا تو خسرو بھی واپس آنا چاہتے تھے۔ قتل و غارت گری کا یہ منظر اور پھر بنگال کی مرطوب آب و ہوا— جی نہ لگا۔ بغرا خاں نے روک لیا۔ پھر بھی وہ چھ مہینے کے اندر اندر ماں اور عزیزوں سے ملنے کا عذر کر کے دہلی چلے آئے۔

تیسرا اپنے دور کا سب سے بڑا فیاض ملک امیر علی سر جاندار (یا جامہ دار) بھی جو حاتم خاں کے نام سے مشہور ہوا خسرو کا منتظر تھا، لیکن شاعر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد قا آن ملک صاحبِ نظر بھی ہے، اقبال مند بھی، سپہ سالار بھی اور ولی عہد بھی، اسی سے ربط قائم کیا جائے۔ 1280 میں وہ ملتان سے دہلی آیا تو امیر پٹیالی سے دہلی پہنچے۔ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلام سنایا، شہزادے نے انھیں اور ان کے امیر دوست امیر حسن 'سجزی' کو چن لیا۔ ملتان پہنچ کر ان کی وہ قدر دانی ہوئی جو اندازے سے بڑھ کر تھی۔

پنجاب اور سندھ دونوں کے لیے ملتان مرکزی فوجی مقام، علما، صوفیا، شعرا اور عراق و عرب کے موسیقاروں کا گڑھ تھا۔ شہزادہ ذی علم بھی تھا، بہادر بھی، شاعری اور موسیقی دونوں کا رَسیا۔ میدانِ جنگ اور محفلِ رنگ و آہنگ دونوں میں بے مثل شخصیت کے ہونہار شہزادے کا دربار دہلی کے ان دونوں شعرائے کے لیے اہم تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر نے اپنا دوسرا دیوان 'وسط الحیوٰۃ' ترتیب دیا، یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو ہندوستانی موسیقی سے جوڑا۔ جو آگے چل کر قول (قلیانہ) کہلایا، یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوک گیتوں کے لیے استعمال کیا، یہیں انھوں نے عربی اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور 23 قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے۔ جو تب تک

کسی کے لیے نہ لکھے تھے۔

خسرو کچھ دن دہلی میں اور پھر ماں اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔ دہلی کے درباری حالات پر اُن کی نظر رہتی تھی۔ امرا نے سازش کر کے بغرا خاں کے بڑے بیٹے معزالدین کیقباد کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے کینہ پرور اور سازشی مشیر کار ملک نظام الدین سے خسرو کا دل نہیں ملتا تھا۔ اس سے کتراتے رہے اور بالآخر اپنے وقت کے تیسرے لکھ لٹ قدر دانِ علم امیر علی سر جاندار حاتم خاں کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا کے بعد اودھی بول چال کا یہ علاقہ، رام بھگتی کی سرزمین اپنی لوچدار تہذیب خوش حالی اور نزاکت و نفاست کی بدولت انھیں پسند تو آیا مگر وہ زیادہ دیر تک دہلی سے زیادہ دور نہیں رہنا چاہتے تھے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ والدہ کی جدائی ستا رہی تھی، یہ بھی ہوگا، لیکن کئی سبب اور بھی تھے۔

حاتم خاں نے روکنا چاہا اور انھوں نے جانے کی ضد کی تو اودھ سے دہلی ایک مہینے کا سفر خرچ اشرفی بھرے دو تھال دے کر رخصت کیا۔ یہاں پہنچے ابھی دو دن گزرے ہوں گے کہ بادشاہ نے بلا بھیجا اور فرمائش کی کہ باپ بیٹے کی ملاقات جو خونریز جنگ کے بجائے شفقت و محبت میں بدل گئی، ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کے وہ خود گواہ ہیں صلے میں اتنا 'زر' دینے کو تیار ہوں کہ عمر بھر کوئی احتیاج نہ رہے۔

'زمہرزر' (شاہی اشرفی) اور 'خلعت شاہی' شاعر کی موزونیِ طبع پھر کیا تھا۔ یہ کام فوری شروع ہوا۔

وہ تب تک اسی دن کے آرزومند تھے، خوش خوش گھر آئے۔ خود کو دوستوں، عزیزوں، یہاں تک کہ 'جن و انس' سے روپوش کر کے اعتکاف کیا اور پورے چھ مہینے بعد (رمضان 688ھ) 1288 کے آخر میں 3944 شعروں کی مثنوی 'قران السعدین' مکمل کر کے اور نقل کرا کے پیش کر دی۔ یہ مثنوی ان کی تمام تصانیف میں کئی حیثیتوں (خصوصاً فنی اور سماجی حیثیت) سے نہایت اہم ہے۔

ایک تو خسرو کے فن کی شوخی پھر مثنوی ایسی کہ تب تک رزم، بزم، تاریخی تفصیلات، اندرخانہ، شہری، فنون اور صنعتوں حرفتوں کا ایسا مرصع اور مکمل نقشہ کبھی کسی نے نہ کھینچا تھا، اہل دربار اور خود بادشاہ عش عش کر گئے۔

سال نہ گزرا تھا کہ معزالدین کیقباد کے منشا کے خلاف اور ترک امرا کے منصوبوں کو شکست دے کر ایک خلجی امیر فیروز شاہی لقب جلال الدین اختیار کر کے بہاپور (موجودہ نئی دہلی) سے بادشاہی قصر کیلوگڑھی آیا۔ اتفاق سے خسرو نے اس کی مدح میں بھی قصیدہ لکھا تھا، معلوم نہیں امیر خسرو کی شادی کب اور کہاں ہوئی لیکن (689ھ) 1290 میں ان کے ہاں پہلا بیٹا تولد ہوا اور اس کا نام مسعود رکھا گیا۔

خسرو دو سال جم کر دہلی میں بیٹھے، اسی زمانے میں خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ پر آمد و رفت بڑھی۔ اِنھی دنوں اپنا سب سے اہم دیوان 'غرۃ الکمال' صاحب نظر اور بزرگ دوستوں، مولانا شہاب الدین، قاضی سراج،

تاج الدین زاہد اور علاء الدین علی شاہ کے مشورے اور مدد سے ترتیب دیا۔ بعد میں ایک تفصیلی دیباچہ بڑھایا۔

پہلا دیوان تھا جس پر 'شیخ الشیوخ عالم نظام الدین کی مدح، خدا اور رسول کے فوراً بعد اور بادشاہ کی مدح سے پہلے آتی ہے۔ تیسرا دیوان ہونے کے باوجود اس میں بھی اپنی غزلیں شامل نہیں کیں اور دیباچے کے خاتمے پر اپنے بدلے ہوئے موڈ کی فکری پرچھائیں یوں ڈالی:

''افسوس، صد افسوس کہ'' ان چند شعبدوں میں، جھوٹ کی اس پوٹ میں اپنی عمر کی نفیس ترین سانس خالی کردی— اور عمر عزیز ان پر ضائع کردی۔ شعر سے میرے ہاتھ وہی آیا جو گرد و غبار سے آدمی کی مٹھی میں آتا ہے۔ اس خبط کے مارے اندھیرے میں کے بہت سے چلائے، اب چاہوں کہ ہاتھ دھولوں (دامن پاک کرلوں) تو میں ہوا سے ہاتھ بھی نہیں دھوسکتا۔ یہ محض دل کے ارمان تھے ''کہ سخن نام بر بندہ فرض است''... کفر و زندقہ میں اتنی فکر (یعنی فکرِ سخن) صرف کردی، اسے کسی اچھے کام میں لگانا چاہیے تھا۔ ''یعنی در عالمِ وحدانیت مصروف شدے...''

اب تک انھوں نے کیریئر اور امارت کی تلاش کی، طشتِ زر کی امید رکھی، شاعرانہ مقبولیت چاہی، غزلیں لہک لہک کر سنائیں اور خوش آواز گانے والوں اور گانے والیوں کو تربیت دے کر سنیں اور سنوائیں، گیت سنگیت، ناچ رنگ، جام و دلارام کی محفلوں میں جی بھر کے رت جگے کیے، سفر کیے، کنیزیں رکھیں، زبان، قلم اور تلوار تینوں کی تیزی منوائی، میدانوں اور جنگلوں کی چلچلاتی دھوپ، رَن میں بجتے کھانڈے اور بہر حال رزم و بزم کہیں سے منہ نہیں پھیرا اور اب عمر کے چالیس سال پورے کرکے وہ ماضی کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں— مگر ایک ہی سانس میں پورا موڑ کاٹنا ان کے سے مزاج اور تاریخی حالات کو منظور نہ تھا۔

دلوں کے بادشاہ، درویشوں کے درویش، چشتی سلسلے کے چوتھے پیر اور دن بھر روزہ رکھنے پر بھی جوانوں کے جوان خواجہ نظام الدین، خسرو سے عمر میں کوئی 18 برس بڑے تھے۔ پہلے بھی اُن کے نانا کی ڈیوڑھی سے اُٹھائے جاچکے تھے۔ ہر طرح کی آزمائشوں سے ثابت قدم گزر چکے تھے، خسرو کی شخصیت اور شاعری کے دلدادہ تھے، ان کا کلام انھی کی زبانی سنتے اور داد دینے کے عادی تھے— مگر اب خسرو اُن کے فقیری دربار میں حاجت مند کی طرح پہنچے تو عالم ہی کچھ اور ہوگیا۔ قربت و خلوت کے جس مقام پر روز کے آنے والے بلکہ سچے مرید نہ پہنچتے تھے، خسرو وہاں پہنچ گئے اور دن بھر کی روداد مزے مزے میں سنانے لگے۔

نظامی کی مثنویاں نظام الدین کو سناتے سناتے خسرو خود دل و جان سے 'نظامی' ہوگئے۔

'مطلع الانوار' پہلی کوشش۔ تصوف و اخلاقیات کے موضوع پر تھی، کچھ خشک رہی۔ 'شیریں خسرو' میں پورا ڈرامہ تھا، 3 کردار، شہزادہ، شہزادی، نوجوان انجینئر، عاشق کا نام، خسرو نے اس میں اپنا رنگ طبیعت زیادہ کامیابی سے دکھایا، اور اسے پھیلایا بھی زیادہ۔ جب تیسری مثنوی 'مجنوں لیلیٰ' لکھ رہے تھے (1299) چہیتی ماں اور چھوٹے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ مثنوی میں جہاں دردِ الفت یا غمِ فرقت کا بیان آگیا، شاعر پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ عجب نہیں جو کاغذ پر آنکھیں نہیں، آنسو ٹپکائے ہوں۔ چوتھی 'آئینہ سکندری' نظامی گنجوی کی دونوں مثنویوں (سکندر نامہ بری و بحری) کا سامنا کرتی ہے اور ہے بھی اُن دونوں سے مختصر۔ لیکن ان کی پانچویں 'ہشت بہشت' واقعی بے مثل، رواں دواں، خوشگوار اور گہری مثنوی ہے۔ علامۂ دہر، مولانا جامی (متوفی 898ھ)— جنھوں نے ایک جملے میں دوٹوک فیصلہ دیا تھا کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ ہندوستان سے باہر کی دنیا نے خمسے کے میدان میں ان کا لوہا مانا، سو برس آگے نظامی ہیں، سو برس پیچھے جامی اور نوائی۔ البتہ ہندوستان میں خسرو کا نام تاریخی مثنویوں نے، ان کے دوہوں، گیتوں اور غزلوں نے پھیلایا۔

جب وہ اپنی عمر کے 20ویں سال آزادانہ تلاش معاش کے لیے نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک اچھا خاصا دیوان اُن کے ساتھ تھا۔ چھوٹتے ہی سلطان کے شاہ خرچ بھتیجے علاء الدین کیشلو خاں (کشلی خاں یا ملک چھجو) نے اپنے دربار کی زینت بنایا۔ کول (علی گڑھ) اس کی جاگیر میں تھا۔ وہاں بھی اس کے ہمرکاب جاتے ہوں گے۔ تاہم شروع سے ہی اس کی نظر میں چڑھے اور آئے دن کی بخششوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ محفل اُن کے دم سے رونق پاتی اور وہ محفل کی خاطر، نہ صرف غنائی شعر لکھتے بلکہ اس کی نغماتی ادائیگی کی تیاری بھی کرتے۔ سنگیت کی چاٹ اُنھیں پڑچکی تھی

امیر خسرو ان تمام واقعات کے عینی گواہ ہیں، لیکن یہ محض اتفاقی امر نہیں کہ علاء الدین جیسے اولوالعزم حکمراں پر انھوں نے کوئی تاریخی مثنوی تصنیف نہیں کی۔ وہ اس کی مدح تو جی جان سے کرتے ہیں، مگر 'کمالِ فن' کے اظہار میں پہل نہیں کرتے۔ اُسے کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

علاء الدین نے دغا اور دولت سے دہلی کی وسیع سلطنت قبھائی تھی، اور پورے بیس سال اسے دلیری، ہمت، سخت گیری اور انتظامی قابلیت کے ساتھ چلایا۔

علاء الدین خلجی اُن کے لیے محض ایک بادشاہ نہیں رہا بلکہ اولوالعزمی، پامردی، بے رحم انصاف اور زبردست وسیع سلطنت میں رعایا کے جان و مال کی حفاظت کا نشان بن گیا۔ وہ اس کی کفایت شعاری کو اوّل اوّل بخل سمجھے، کچھ کبیدہ خاطر رہے، پھر انھوں نے اس پالیسی کی قدر و قیمت جانی، اُسے سراہا اور صرف قصیدوں میں، خمسہ کی مثنویوں کی تمہید میں نہیں، بلکہ (عہدِ علائی کو بارہ برس جانچنے اور سمجھنے کے بعد) اپنے قلم کا پہلا نثری کارنامہ 'خزائن الفتوح' لکھ کر پیش کردیا جو پیچ دار اور کسی حد تک مبالغہ آمیز استعاروں کے باوجود علاء الدین کے دور میں شمالی اور جنوبی فتوحات کے واقعات کی ایسی منہ بولتی تصویر تھی کہ اس کا نام ہی 'تاریخ علائی' پڑ گیا۔

پھر ہندوستان کے سیاسی افق نے رنگ بدلے، بساط جہاں بانی پر نئی چال میں نئے نقشے ابھرے اُدھر قصرِ ہزار ستون میں سلطان علاء الدین کی آنکھ بند ہوئی، اِدھر ملک نائب (چیف سکریٹری) سیہ فام کافور نے بڑے شہزادے خضر خاں کی آنکھیں نکلوا لیں (جو بحکم سلطانی گوالیار کے قلعہ میں نظر بند تھا) اور سات سال کے بچے کو تخت نشین کرکے خود عنانِ حکومت سنبھالی۔ کم سن شہزادے شہاب الدین کی ماں جاتھیا پالی رائے رام دیو کی بیٹی تھی۔ اس سے نکاح کرکے کافور نے غالباً بادشاہ کے سوتیلے باپ کا سا اعتبار حاصل کرنا چاہا۔ خضر خاں کا ہم عمر، سوتیلا بھائی مبارک قید کردیا گیا— اور جب اس کو اندھا کرنے کے لیے 'چار پیک' (باڈی گارڈ) بھیجے گئے، وہ شہزادے کے حامی بن کر پلٹ پڑے اور محل میں گھس کر ملک نائب کا ہی خاتمہ کردیا۔ چند روز بعد 18 اپریل 1316 (24 محرم 716ھ) کو یہی مبارک خاں، قطب الدین کا لقب اختیار کرکے تخت نشین ہوا۔

یہ تین مہینے امیر خسرو پر، بے نیازانہ جینے کے باوجود، کتنے سخت گزرے ہوں گے، اندازہ ہوسکتا ہے۔ ملک کافور اور خضر خاں دونوں ان کے ممدوح رہ چکے تھے، دونوں معتوب ہوئے۔ کئی اور ممدوح اور قدردان اُردَب میں آگئے۔

خسرو کی عام مقبولیت اور خاص سرپرستی نے ان کے حاسد اور دشمن بھی پیدا کردیے تھے۔ خصوصاً سعد منطقی اور عبید شاعر— دونوں دربار کے حاضر باش تھے اور فوجی مہموں میں بھی جایا کرتے تھے۔

خواجہ نظام الدین، جن کی درگاہ پر اب خسرو قریب قریب ہر شام بعد مغرب حاضر رہنے لگے تھے۔

خواجہ نظام الدین بے حیل حجت ہر ایک کو مریدی میں بھی قبول کرتے تھے، بعد عشا خسرو کی زبانی شہر بھر کی خبریں اور دربار کے حالات سنتے تھے، ہر ایک نو وارد سے اسی کے ذوق کے مطابق گفتگو اور اس کی دل جوئی کرتے تھے، ان کی محفل میں ہر شام 'سماع' ہوتا جس میں مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہوتے، فارسی، اودھی، پنجابی اور برج بھاشا میں کلام سنایا جاتا۔ لوگ سردھنتے، درویش اور اہل دل جوش میں کھڑے ہوجاتے اور وجد یا حال کی کیفیت میں دائرہ بنا کر حرکت کیا کرتے تھے۔

اگرچہ چشتی سلسلے کے بعض پیروں نے اور اکثر پیروؤں نے اپنی آزادانہ معاش کے لیے حلال پیشے اپنائے۔ زمین پر کاشت کی، تجارت کی، حرفت اختیار کی، لیکن خواجہ کی خانقاہ صرف 'فتوح' (نذر نیاز کی آمدنی) پر چلتی تھی۔ تاہم بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومت وقت سے کوئی سیاسی یا معاشی امداد نہ لی جائے، بلکہ ممکن حد تک بے تعلقی برتی جائے۔

ملک غازی غیاث الدین تغلق کو یہ کانٹا کھٹکنے لگا تو دربار میں خواجہ کی طلبی ہوئی کہ وہ بادشاہ اور معترض علما کی موجودگی میں اپنی پوزیشن صاف کریں۔

خواجہ نے بھرے مجمع میں وضاحت کی کہ مشائخ اور درویشوں کے قدیم دستور کے علاوہ حدیث نبوی بھی اس کی تائید میں نکلتی ہے۔

اِنَّ لِنَفسِکَ عَلَیکَ حَقًّا

(تم پر تمھارے نفس یا جسم کا حق ہے)

یعنی جب طبیعت اور جسم پوری چوٹ کھا جائے تو ان کا حق ہے کہ سماع سے قوت و تازگی حاصل کریں...

''چوں زمانے از سماع بیاساید باز او بر کارے بہ برند''

ایک عالم وقت مولانا علم الدین نے، جو گواہ یا منصف کی حیثیت سے موجود تھے، خواجہ کی تائید کی یہ کہہ کر کہ... ''جو دل سے سنتے ہیں ان کے لیے حلال ہے، اور جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لیے حرام۔''

بحث کے بعد بادشاہ نے خواجہ کو جانے کی اجازت دے دی، نہ سماع کو منع کیا، نہ اس کی کھلی اجازت دی، مگر خواجہ کا یوں اپنے مذہبی اور شہری وقار کے ساتھ رخصت ہونا اسے ناگوار ضرور گزرا۔

رفتہ رفتہ یہ ناگواری (ہنوز دہلی دور است، والے) اس مشہور واقعے تک پہنچی کہ بادشاہ نے خواجہ نظام الدین کو (1324) میں کہلوادیا کہ وہ میری واپسی سے پہلے دہلی چھوڑ دیں اور خود بڑا لشکر لے کر بنگال کی طرف روانہ ہوا۔ امیر خسرو اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ 'تغلق نامہ' مکمل کرنے کے بہانے یا بوڑھاپے کا عذر کرکے امیر خسرو ترہت میں ٹھہرے بغیر دہلی کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے۔ ان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ خواجہ نظام الدین کہا کرتے تھے کہ خسرو میرے بعد جیے گا نہیں اور خواجہ کا وقتِ آخر قریب تھا۔

اکتوبر 1324 کی آخری تاریخوں میں (ورنہ نومبر کے شروع میں) اس نئے محل کی چھت گری جس کے نیچے فتح مند باپ نے اپنے سعادت مند بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا تھا۔ پچھلے دو بادشاہوں کی طرح وہ بھی چار سال کی حکومت کے بعد آناً فاناً دنیا سے رخصت ہوا۔

چند روز بعد 18 ربیع الآخر 1325 کو نظام الدین نے امیر خسرو کو یاد کیا اور ایک صوفی نصیر الدین محمود (چراغ دہلی) کو خلافت کا خرقہ اور سلسلہ دار اپنے چاروں خواجہ بزرگوں کے تبرکات سپرد کرکے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

امیر خسرو اپنے پیر کے دل و جان میں اتنے بسے ہوئے تھے کہ ''شریعت کی اجازت ہوتی تو وہ قبر میں انھیں ساتھ سلاتے''، لیکن خلافت کے خرقے انھیں مریدوں کو عطا ہوئے جن کی تمام زندگی اس کی نذر ہوچکی تھی۔ خسرو اس مسلک کے ماننے والے تھے، مخلص تھے، وہ ان کی روحانی تسکین کا سرچشمہ اور فکر و نظر کی روشنی تھا— مگر وہ ان کی کل کائنات نہیں تھا۔ وہ اس کے سوا بھی موجود تھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بادشاہانِ وقت نے انھیں سراہا، قریب رکھا، فرمائشیں کیں، لیکن شاعر اور فن کار ہی مانا، کوئی سیاسی یا فوجی منصب یا صوبے کی حکمرانی عطا نہ کی۔ وہ اس کا پرزہ ہوکر نہیں رہ گئے۔

امیر خسرو اپنے دور کی ذہنی اور سیاسی سماجی تحریکوں اور اداروں سے باخبر اور علاقہ مند ضرور رہے، لیکن کسی ایک حالت یا حکومت سے اتنے بندھے نہیں کہ نظام حکومت کے زیر و زبر ہونے میں یا اداروں کے نشیب و فراز میں خود بھی بہہ جاتے، گم ہوجاتے— وہ موجوں میں رہ کر موجوں سے نکلنا جانتے تھے۔ تماشے میں شریک ہوکر تماشائی کی نظر برقرار رکھتے تھے۔ اپنے چار دیوانوں کی جو خانہ بندی انھوں نے کی تھی، وہی زمانے کے انقلابات اور اتفاقات، اداروں اور حلقوں کی بھی ہوگی۔

حدِ نظر سے آگے تک پھیلی ہوئی یہ دنیا ان کے نزدیک ہر ایک حد بندی سے آزاد تھی۔

اسی میں ان کی شاعری کی رنگارنگ تہوں کا، نغمے کا، مجاز و حقیقت کا لطف اندوزی کا دور لافانی قوت د دل کشائی کا راز چھپا ہوا ہے۔

انھوں نے ایک صبح خواجہ نظام الدین کو زینے سے اترتے دیکھ کر، ان کی شب بیدار آنکھوں کو خطاب کیا تھا:

تو شبانہ می نمائی بہ برِ کہ بودی امشب؟

کہ ہنوز چشم مستت اثرِ خمار دارد

خسرو کی 'چشم مست' میں بھی 'تلخ و شیریں راتوں' کے خمار کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، جس روز اور جس تاریخ کو محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کا انتقال (یا وصال) ہوا، چھ مہینے بعد ٹھیک اسی دن، اسی تاریخ (18 شوال 725ھ، 1325) کو امیر خسرو نے سوگواروں کے لباس میں تضادوں بھری دل کش دنیا کو خیرباد کہا اور اپنے پیر کی پائنتی دفن کردیے گئے۔

■

ماخذ: خسرو شناسی، مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر، چوتھی طباعت 2010، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

گوپی چند نارنگ

'ہندوی' کا نقاش اوّل

امیر خسرو

امیر خسرو کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے اور ان سات صدیوں میں وہ ہماری لوک روایت یا لوک ساہتیہ کا حصہ بن گیا۔ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر چڑھنے سے اس میں اصلاح و تصریف ضرور ہوئی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ امیر خسرو سے منسوب کلام کے کئی حصے اصلی ہوں، لیکن کئی حصے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن کا بعد میں اضافہ ہوگیا ہو۔ اس لیے ایسے کلام کا جائزہ لینے میں تاریخی اور لسانی دونوں طرح کی شہادتوں پر نظر رکھنی ہوگی۔

سب سے پہلے اس مخلوط ہندوی کلام کو لیجیے جو امیر خسرو کے ان مستند فارسی مجموعوں میں ملتا ہے جن کی تدوین خود امیر خسرو نے کی تھی:

(1) آری آری ہمہ بیاری آری
ماری ماری برہ کہ ماری آری

امیر خسرو نے اسے دیباچہ غرۃ الکمال میں ابہام کی ذیل میں پیش کیا ہے ''باز ایہامی دیگر بربست کردہ ام کہ یکطرف ہمہ ہندوی فی افتد'' ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا ہے کہ یہ شعر ''فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا ہوسکتا ہے۔'' اس کے برعکس ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو:

مارے مارے، برہ کے مارے، آرے

ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں طرح سے بامعنی ہے۔ اگر مارے، آرے پڑھا جائے تو ضمیر محذوف مذکر ہوگی، لیکن یہ فارسی سے دور ہوجائے گا جب کہ اگر یائے معروف سے پڑھا جائے تو ضمیر محذوف مونث ہوگی یعنی خطاب برہن سے ہوگا جو قرین قیاس ہے۔ اس شعر میں فعل کا ڈھانچہ غور طلب ہے۔ 'آری' میں آنا مصدر سے آ اور 'ماری' مارنا سے صاف اُن عناصر کا پتہ دے رہے ہیں جو بعد میں کھڑی بولی سے مخصوص ہوگئے۔

(2) رفتم بہ تماشائی کنارِ جوئے
دیدم بلبِ آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہای زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ 'دُر دُر موئے''

'در دموئے' یعنی مردار دور ہو، عورتوں کے روزمرہ سے تعلق رکھتا ہے، اور کھڑی کے علاقے میں آج بھی یوں ہی بولا جاتا ہے۔

(3) گجری کہ تو در حسن و لطافت چوہی
آں دیگ دہی، برسر تو چترشہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد
ہرگاہ بہ گوئی کہ 'دہی لیہودہی'

اس میں 'لیہو' برج ہے۔ خسرو کا بچپن پٹیالی ضلع ایٹہ میں گزرا تھا جو برج کا علاقہ ہے، عین ممکن ہے یہ بچپن کا اثر ہو، یا چوں کہ دلی کی زبان پر برج کا اثر رہا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہو یا پھر خسرو نے گجری کی اصل اور لہجے کی رعایت سے 'لیہو' کہا ہو۔

(4) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے
از دست و زبان چرب او وادیلے
خالے برخش دیدم و گفتم کہ تل ست
گفتا کہ 'برونیست دریں تل تیلے'

چوتھا مصرع واضح طور پر کھڑی کے محاورے 'ان تلوں میں تیل نہیں' کا ترجمہ ہے۔ تل، تیل اور تیلی ہندی علاقے کی تمام بولیوں میں ملتے ہیں۔

(5) ہندو صنمے کزو رُخم شد کاہی
در وا کہ ندارد زغم آگاہی
گفتم ز بست کارِ منِ خستہ برآر
درخندہ شد و گفت کہ 'ناہی ناہی'

'ناہی ناہی' ناہیں ناہیں یا نہیں نہیں کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

(6) حجام پسر بخوبی و رعنائی
دے آئینہ بنمود بداں زیبائی
گفتم صنما در برت آیم، نایم
فریاد برآورد کہ 'نائی نائی'

(7) ہندو بچہ دیدم چو شکر سرتاپا
حیراں کنمش چو بینمش سرتاپا
با او گفتم کہ ہندو از چیست بگو
ہر موے خطش گفت کہ 'مورے بابا'

'مورے' برج ہے اور 'بابا' پورے ہندی علاقے میں عام ہے۔

(8) تنبولیِ من چو مجلسِ بادہ کنم
آئینہ دل ز زنگِ غم سادہ کنم
یک لحظہ اگر بمن سپاری دل خود
از نقلِ تو برگِ عیش آمادہ کنم

اس میں تنبولی اور سپاری ہندی علاقے کے لفظ ہیں اور برگِ عیش سے پان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ اس مجموعے میں جوگی پسر اور سناسی (سنیاسی) پسر پر بھی رباعیاں ہیں۔

(9) مثنوی تغلق نامہ جو امیر کی تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری مثنوی ہے، اس میں ذیل کے ہندوی اجزا آئے ہیں:

دگر ہر مارد بیری مار و پر مار   سخنِ شان 'مار مار' وسر بسر 'مار'
بہ زاری گفت 'ہے ہے تیر مارا'   یکے از راوتاں 'ہارِ' گہر بود

(2)

دوسری شق میں ہم امیر خسرو سے منسوب اس

ہندوی کلام یا اس کے اجزا کو لیں گے جو متاخرین کی کتابوں میں امیر خسرو سے منسوب کیے گئے ہیں۔ اس میں سب سے قدیم وہ دوہا ہے جو وجہی دکنی کی سب رس (1045ھ) میں ملتا ہے۔

(1) پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ
منجہ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

میں، ڈلی، تیرا، جلتی، گیا، تیرے سب کھڑی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

(2) ڈاکٹر گیان چند جین نے لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا (ترتیب 1175ھ) سے امیر خسرو کا ایک دوہا نقل کیا ہے۔ ہاشم دکنی کے ترجمے میں ہندی تصورِ عشق کا ذکر کرتے ہوئے شفیق نے امیر خسرو کا ایک فارسی شعر اور اسی مضمون کا ان کا دوہا لکھا ہے:

خسرو اور عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ می سوزند جان خویش را
خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوے
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئے

اس دوہے میں ایسی، جیسے، پرائے، جل جل واضح طور پر کھڑی کے عناصر ہیں۔

(3) روایت ہے کہ ذیل کا دوہا امیر خسرو نے اپنے پیرو مرشد نظام الدین اولیا کے انتقال کی اندوہناک خبر سن کر کہا تھا:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہوندیس

ڈارے اور بھئی برج ہیں۔ باقی سارا دوہا صاف ستھری کھڑی بولی ہے۔

(4) جواہر خسروی میں ذیل کے دوہے کو بھی امیر خسرو کا کہا گیا ہے:

خسرو رین سوہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ

ڈاکٹر وحید مرزا کا کہنا ہے ''ان دونوں دوہوں میں کوئی شہادت ایسی نظر نہیں آتی جو روایت عام کی تکذیب کرتی ہو۔'' جاگی، پی اور کے، کی کھڑی کے ہیں، اور دوسرے مصرعے میں میرو، پیو کو، دوؤ بھئے برج ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی لکھا ہے کہ ان چاروں دوہوں کو خسرو سے منسوب کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

(5) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے امیر خسرو کا ذیل کا دوہا نقل کیا ہے:

شیام سیت گوری لے جمت بھئی انیت
ایک پل میں پھر جات ہیں جوگی کا کے میت

اس دوہے کو سوائے ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے کسی نے نقل نہیں کیا اور انھوں نے اپنے ماخذ کی نشان دہی بھی نہیں کی۔ اس کا پہلا مصرع بے معنی ہے اور شاید بے جوڑ بھی ہے۔ ہمیں ڈاکٹر صفدر آہ سے اتفاق ہے اور اس دوہے کو امیر خسرو کا تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

(6) وجہی کے بعد تاریخی ترتیب سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کا دوسرا اہم ماخذ میر تقی میر کا نکات الشعرا ہے (1165ھ) اس میں ذیل کا قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے۔

زرگر پسرے چو ماہ پارہ — کچھ گھڑیے سنوارئے پکارا
نقد دلِ من گرفت و بشکست — پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ایک مصرع فارسی میں ہے اور دوسرا اصاف کھڑی میں، نیز موضوع بھی امیر خسرو کی مستند رباعیات پیشہ وران جیسا ہے، اس لیے اس کی اصلیت پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

(7) تیسرا ماخذ ملا عبدالباسط امیٹھوی (متوفی 1167ھ) کی کتاب منارالضوابط ہے جس کا ذکر جناب سید مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اس میں ذیل کا ایک شعر اور ایک رباعی امیر خسرو سے منسوب کی گئی ہیں:

گفتم کہ دریں خانۂ ماموں تو مانم
گفتا کہ دریں خانہ، بلائے ست ممانی
داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات
لالہ غلام روے تو صد برگ زیرپات
ہر برہمن کہ دید رُخ خوبت اے صنم
زنار راست لکد زد بہ روے لات

خط کشیدہ الفاظ فارسی اور ہندوی دونوں میں معنی دیتے ہیں اور ان میں ایہام ہے۔ نیز حکایت اور بات، لالہ اور صد برگ، برگ اور پات اور لکد اور لات کا ساتھ ساتھ آنا بھی لطف رکھتا ہے۔ ماموں، ممانی، بات، لالہ، پات، برہمن، لات ہندی علاقے کے الفاظ ہیں۔

(8) تاریخی اعتبار سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کا چوتھا اہم ماخذ قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعۂ نغز (اختتام 1221ھ 1806) ہے، جس میں امیر خسرو کی مشہور غزل 'زحالِ مسکیں مکن تغافل' کے پانچ اشعار درج کیے گئے ہیں جنھیں بعد میں محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں شامل کیا، اگرچہ آبِ حیات کا متن بعینہ وہی نہیں۔ محمود شیرانی نے مجموعۂ نغز کو مرتب کر کے 1933 میں شائع کیا جب کہ وہ اپنی کتاب پنجاب میں اردو 1928 میں شائع کرا چکے تھے، اور اس میں اس غزل کے اشعار مجموعۂ نغز قلمی نسخے ہی سے لیے ہوں گے، لیکن اس میں بھی متن بالکل وہی نہیں۔ یہاں اس غزل کا متن مجموعۂ نغز سے پیش کیا جاتا ہے۔

زحالِ مسکیں (مکن) تغافل دو راہ نیناں ملائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نہ لیو گاہے لگائے چھتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف زمان وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق آں مہ کہ روز محشر بداد مارا فریب خسرو
پست من کہ دورا ہے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مجموعۂ نغز کا مندرجہ بالا متن ہی اس غزل کا قدیم ترین متن ہے۔

اشپرانگر کے 1852 کے جس مضمون کا ذکر ڈاکٹر صفدر آہ نے کیا ہے (جس کی تفصیل پہیلیوں کی ذیل میں آگے آئے گی) اس میں اشپرانگر نے اپنی تحریر قائم کے حوالے سے شروع کی ہے اور لکھا ہے کہ ''قائم نے خسرو کے دو شعر پیش کیے ہیں، کوئی پہیلی درج نہیں کی۔ میں قائم کے اشعار میں سے ایک شعر پیش کرتا ہوں اور وہ پوری غزل درج کرتا ہوں جس سے دوسرا شعر لیا گیا ہے۔'' اس کے بعد خسرو کی غزل 'زحالِ مسکیں مکن تغافل' اور ان کا قطعہ 'زرگر پسرے' نقل کیا ہے۔ تذکرہ مخزن نکات قائم مرتبہ مولوی عبدالحق میں مذکورہ غزل کا کوئی شعر نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اشپرانگر کے سامنے مخزن نکات کا جو نسخہ تھا، اس میں موجودہ نسخے سے زیادہ مواد تھا۔ 1966 میں ڈاکٹر اقتدا حسن کی ادارت میں مخزن نکات لاہور سے دوبارہ شائع ہوا۔ اس میں مخزن کے نسخۂ انجمن کے علاوہ قلمی نسخۂ انڈیا آفس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر انڈیا آفس والا نسخہ وہی ہے جو شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں اشپرانگر کے پیش نظر رہا ہے تو اس میں امیر خسرو کی مذکورہ غزل کا وہ شعر ضرور ملنا چاہیے چنانچہ مطبوعہ نسخۂ لاہور میں یہ شعر صفحہ 7 پر موجود ہے:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم اے جاں نلیوہ گاہے لگائے چھتیاں

(9) فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے:

ہندو بچۂ ہیں کہ عجب حسن دھرے چھے
بروقتِ سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ''ارے رام ترک کائیں کرے چھے

اس کا انداز بھی امیر خسرو کے ان توصیفی قطعات و رباعیات کا ہے، جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، پھور جھرے برج کا انداز ہے، جھرے پچھے، کرے پچھے راجستھانی کی یاد دلاتا ہے۔

اب آخر میں امیر خسرو کے اس ہندوی کلام کو لیجیے جس کی حیثیت ماہرینِ امیر خسرو کی نظر میں مشتبہ رہی ہے، لیکن یہ کلام اپنی ہر دلعزیزی کی بدولت نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ متنازع فیہ 'خالق باری' ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس سب کا سمیٹنا اور نظم کا تجزیہ کرکے موافق اور مخالف آرا پر محاکمہ کرنا الگ مضمون کا محتاج ہے۔

ڈاکٹر اشپرانگر کی پیش کردہ وہ چار پہیلیاں جو جواہر خسروی میں بھی ملتی ہیں۔ یہاں پیش ہیں:

چراغ

بالا تھا جب سب کو بھایا   بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں   بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں

قینچی

اندر چلمن باہر چلمن بیچ کلیجہ دھڑکے
امیر خسرو یوں کہیں وہ دو دو انگل سر کے

کاجل

جل کر بنے جل میں رہے   آنکھوں دیکھا خسرو کہے

بئے کا گھونسلا

ایک انوکھا گرہ بنایا   اوپر نیو نیچے گھر چھایا
بانس نہ بلی، بندھن گھنے   کہو خسرو گھر کیسے بنے

یہ چاروں پہیلیاں کھڑی میں ہیں۔ جواہر خسروی میں پہلی پہیلی کے آخری مصرعے میں ہریانی کا پٹ ہے۔ ''ارتھ کرو نہیں چھاڈو گانوں۔'' اسی طرح دوسری پہیلی میں 'اندر چلمن' کے بجائے 'بھیتر چلمن' ہے۔ تیسری میں پہلا مصرع ہے ''جل میں اپجے جل میں رہے'' اور چوتھی کا پہلا مصرع ''اچرج بنگلہ ایک بنایا'' ہے۔ ان اختلافات کے پیشِ نظر یہ دلچسپ انکشاف ہوتا ہے کہ جواہر خسروی میں یہ پہیلیاں جس ماخذ سے منقول ہیں وہ قدامت کا خاصا رنگ لیے ہوئے ہے۔

(ب) اشپرانگر کی پیش کردہ وہ دو پہیلیاں جو ان کے دونوں مضمونوں میں مشترک ہیں۔

حمدالٰہی

سب کوئی اس کو جانے ہے   پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے   فکر کیا اون دیکھا ہے

خربُزہ

دس ناری کا ایک ہی نر   بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم   منہ میٹھا تاثیر گرم

یہ دونوں بھی کھڑی ہیں۔

(ج) اشپرانگر کی پیش کردہ وہ چار پہیلیاں جو ان کے 1852 والے مضمون سے منقول ہیں—

خدا

سب سکھین کا پیا پیارا   سب میں ہے اور سب سوں نیلا
واکی آن مجھے یہ بھا   جاکی ہے بن دیکھی چا

نعت

ایک پرکھ ہے دئی سنوارا   دُنیا کا بستارن ہارا
واکے چرنوں لاگ رہو   زیادہ بچن نہ منہ سے کہو

چراغ

تیلی کا تیل کمہار کا ہنڈا
ہاتھی کی سونڈ نواب کا جھنڈا

حلال خور

کمائی اپنی پھینک دے اور جی پر نہیں ملال
وا سے کیوں ہٹ جات ہیں جو روزی کھائے حلال

ڈاکٹر صفدر آہ ان پہیلیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، حمد الٰہی والی پہیلی کے مصرع اوّل میں ''سب کوئی کی جگہ ہر کوئی ہونا چاہیے ورنہ ردیف ہے کے بجائے ہیں ہوگی۔'' خدا والی پہیلی کے ''تیسرے اور چوتھے مصرعے میں بھا اور چا مہمل ہیں۔'' نعت والی پہیلی ''بالکل معمولی ہے'' اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ اگر یہ پہیلیاں امیر خسرو کے ہندوی کلام میں ''شامل نہ کی جائیں تو بہتر ہے۔''

یہ مفروضہ قرینِ صحت نہیں ہے کہ امیر خسرو کی ہندوی ملی جلی برج اور کھڑی ہوگی اس زمانے کے مدھیہ پردیش کی اپ بھرنش بھلے ہی ایک سہی، اس میں علاقائی خصائص ضرور ہوں گے، جو بعد میں برج کھڑی وغیرہ کی تخصیص کا باعث بنے۔ دلی کی زبان پر میرتقی میر کے زمانے تک برج کا اثر رہا ہے۔ چنانچہ اگر خسرو کی ایسی پہیلیوں میں ایسے لسانی عناصر کی تانک جھانک ملتی ہے، جن کا رشتہ ہم آج کی کھڑی یا برج سے ملا سکتے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہی علاقائی خصائص رہے ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ مثالیں دیکھیے جن میں کھڑی کے اثرات زیادہ ہیں۔

آئینہ

فارسی بولی آئی نا   ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولوں آرسی آئے   خسرو کہے کوئی نہ بتائے

دھوپ

نر سے پیدا ہووے نار   ہر کوئی اس سے رکھے پیار
ایک زمانہ اس کو کھاوے   خسرو پیٹ میں وہ نہ جاوے

کاجل

آدھے کیے سے سب کو پالے   مدھ کٹیے سے سب کو مارے
انت کٹیے سے سب کو میٹھا   خسرو وا کو آنکھوں دیکھا

ذیل کی پہیلیوں میں برج کے خصائص دیکھے جاسکتے ہیں۔

نیم کی نبولی

ایک نار تردر سے اُتری ماسوں جنم نہ پایو
باپ کا نام جو وا سے پوچھو آدھو نام بتایو
آدھو نام بتایو خسرو کون دیس کی بولی
وا کا نام جو پوچھا میں نے اپنے نام نبولی

آری

شیام برن اور دانت انیک لچکت جیسے ناری
دونوں ہاتھ سے خسرو کھینچے اور یوں کہے تو آری

موری

ساون بھادوں بہت چلت ہے ماگھ پوس میں تھوڑی
امیر خسرو یوں کہے تو بوجھ پہیلی موری

اَپ بھرنش کے یہ علاقائی اثرات صرف برج یا کھڑی تک بس نہیں بلکہ بعض پہیلیاں ایسی ہیں جن میں ہریانی کی تانک جھانک دیکھی جاسکتی ہے۔

دیا

بالا تھا جب سب کو بھایا   بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں   ارتھ کرو نہیں چھوڑو گاؤں

ناؤ

جل جل چلتا بستا گاؤں   بستی میں ناوا کا ٹھاؤں
خسرو نے دیا وا کا ناؤں   بوجھو ارتھ نہیں چھاڈو گاؤں

امیر خسرو ملتان میں کئی برس تک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی میں نام بھی انھوں نے وہیں پیدا کیا۔ یہ ناممکن ہے کہ امیر خسرو جیسے طباع شخص نے وہاں کی اَپ بھرنش کے علاقائی خصائص کا اثر قبول نہ کیا ہو۔ جواہر خسروی کی ذیل کی پہیلی میں ان اثرات کی صوتی گونج 'ڈیٹھی' میں سنی جاسکتی ہے۔ قیاس چاہتا ہے یہ لفظ ڈٹھی قافیہ مٹھی ہوگا۔

نرناری کی جوڑی ڈیٹھی   جب بولے تب لاگے میٹھی
اک نھائے اک تاپن ہارا   چل خسرو کر کوچ نقارہ

(ب) معیاری کھڑی فاعلی حالت میں 'نے' کی عدم موجودگی کسی طرح گوارا نہیں کرتی۔ بعض ماہرین اسے دکنی سے سمجھتے ہیں، مثلاً حضور فرمائے، نظریات کہی، وہ سب دیکھی ('دکنی زبان' عبدالقادر سروری مشمولہ رسالہ اردوئے معلّٰی دہلی، 1962، ج3، شمارہ x / 4,5 ص 99-100) واقعہ یہ ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے صحیح لکھا ہے کہ قدیم دہلوی میں نے کے عدم استعمال کی مثالیں ملتی ہیں (رات ہم خواب میں

اس زلف کو پیچاں دیکھا) فضلی کی کربل کتھا سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ ماضی مطلق کے لیے رسم کی حالت فاعلی کے ساتھ نے کا استعمال معدوم تھا۔ جواہر خسروی کی بعض پہیلیوں میں نے کے عدم استعمال کی یہ مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

کنٹھا

گانٹھ گٹھیلا رنگ رنگیلا ایک پرکھ ہم دیکھا
مرد استری اس درکھیں اس کا کیا کہوں لیکھا

آم

برسا برس وہ دیس میں آوے   منھ سے منھ لگا رس پیاوے
وا خاطر میں خرچے دام   اے سکھی ساجن نا سکھی آم

چوکی

ایک نار جب بن کر آوے   مالک کو اپنے اوپر بلاوے
ہے وہ ناری سب کے گوں کی   خسرو نام لیے تو چونکی

چوڑا

انگوں موری لپٹا رہے   رنگ روپ کا سب رس پیے
میں بھر جنم نہ دا کو چھوڑا   اے سکھی ساجن نا سکھی چوڑا

(ج) جنسی پہلو۔ امیر خسرو کی متعدد پہیلیوں اور مکرنیوں کو بعض حضرات نے محض اس لیے غیر مستند قرار دیا ہے کہ ان میں بقول ان کے ذم کا پہلو ہے۔

چٹاخ پٹاخ کب سے   ہاتھ پکڑا جب سے... الخ

پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں کہ اس میں ذم کا پہلو آ گیا ہے۔ شاید ڈاکٹر وحید مرزا بھی اسے امیر خسرو سے اسی لیے منسوب کرنا نہیں چاہتے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے استناد کا یہ خالص موضوعی اور اخلاقی معیار ہے جو ہرگز سائنسی نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اپنے موجودہ اخلاقی اور سماجی معیاروں کو سات سو سال پہلے کے اس کلام پر مسلط کر رہے ہیں جو یکسر تفریحی اور عوامی نوعیت کا ہے۔

دانت کی مسّی

سولی چڑھ سکت کرے سیام برن اک نار
دو سے دس سے بیس سے ملے ایک ہی بار

کتاب

ایک نار چاتر کہلاوے   مورکھ کو نا پاس بلاوے
چاتر مرد جو ہاتھ لگاوے   کھول ستر وہ آپ دکھاوے

انگیا

کس کے چھاتی پکڑے رہے   منہ سے بولے نہ بات کہے
ایسا ہے من کا رنگیلا   اے سکھی ساجن نا سکھی انگیا

پان

بن ٹھن کے سنگار کرے   دھر منھ ہر منھ پیار کرے
پیار سے مو پے دیت ہے جان   اے سکھی ساجن نا سکھی پان

پنکھا

واکا ہلنا مورے من بھاوے   آپ ہلے اور موے ہلاوے
اے سکھی ساجن نا سکھی پنکھا   ہل ہل کے وہ ہوا نسکھا

چند

میں سوئی میرے سر پر آیو   اونچی اٹاری پلنگ بچھایو
اے سکھی ساجن نا سکھی چند   کھل گئی انکھیاں بھئی انند

ہار

رنگ روپ سب واکا چاکھا   سگری رین چھتیں پر رکھا
اے سکھی ساجن نا سکھی ہار   بھور بھئی جب دیا اُتار

(3) ڈھکوسلے، چمو کی چوپہری باجے

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون آزاد بہ حیثیت محقق شائع شدہ نوائے ادب بمبئی میں خسرو سے منسوب چمو ساقن کے اس ڈھکوسلے پر شک کا اظہار کیا ہے:

اوروں کی چوپہری باجے چمو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جا میں ناہیں توسل
اوروں کے جھاں سینگ سما دے چمو کے واں موسل

محمد حسین آزاد نے اس کی تمہید میں لکھا ہے کہ چمو ساقن آتے جاتے خسرو کو حقہ پلاتی تھی، اردو کے بیشتر محققین نے بجا طور پر اعتراض کیا ہے کہ تمباکو اور حقہ خسرو کے عہد میں کہاں۔ یہ تو بہت بعد میں پرتگیزیوں کے ساتھ ہندوستان آیا۔ آزاد کی داستان طرازی سے قطع نظر اگر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ کیا اصل اشعار میں تمباکو یا حقے کا ذکر ہے تو ناکامی ہوگی چونکہ متن میں تو صرف اتنا ہے:

صاف صوف کر آگے راکھے   جس میں ناہیں توسل

اسی طرح 'چمو' نام تو آیا ہے لیکن 'چمو ساقن' محمد حسین آزاد کی اختراع ہے۔ حقے تمباکو کا رواج تو امیر خسرو کے زمانے میں نہیں تھا لیکن بھنگ پینے کا رواج تو تھا، اور چمو 'پیالۂ بنگ صاف مصفیٰ حاضر کی کرتی تھی۔'' ضرورت محمد حسین آزاد کی اختراع سازی کو رد کرنے کی ہے، امیر خسرو سے منسوب ایک اور ڈھکوسلا ہے:

کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اس میں افعال جلا، کھا، گیا، بجا آئے ہیں اکثر ماہرین نے اس کی صاف زبان پر اعتراض کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ امر غور طلب ہے کہ اس ڈھکوسلے کے فعلیہ ڈھانچے میں ایسی کون سی بات ہے جو اسے 'دردر موئے' یا 'ماری برہ کی ماری آری' یا 'ہے ہے تیر مارا' سے مختلف ہو۔ کھڑی سے مخصوص یہ ڈھانچا جب خود امیر خسرو کی مستند تصانیف میں موجود ہے تو اسے ان سے منسوب کلام میں رد کرنے کا کیا جواز ہے۔ تیرہویں صدی کی زبان ضرور غرابت کے کچھ پہلو رکھتی ہوگی، لیکن تیرہویں صدی کی زبان میں فعلیہ ڈھانچے کی جو صفائی امیر خسرو کی تصانیف کے ذریعے مصدقہ طور پر موجود ہے، اسے اٹھارہویں یا انیسویں صدی پر محمول کرنا لسانی دیانت سے روگردانی ہے۔ جہاں تک بے جوڑ چیزوں کو نظم کر دینے یا تک ملانے کا سوال ہے ہم جانتے ہیں کہ بے جوڑ لفظ لے کر بامعنی شعر کہنا اس زمانے میں قدرتِ کلام کی دلیل سمجھی جاتی تھی، خود خسرو نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کے استاد قاضی اسدالدین انھیں اپنی ہمراہی میں قاضی عزالدین کے گھر لے گئے۔ قاضی عزالدین نے امیر خسرو کی قابلیت کا امتحان لینے کے لیے چار متفرق چیزوں کے نام لیے جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں تھی، یعنی مو، بیضہ، تیر اور خربزہ، اور کہا کہ انھیں نظم کریں تو خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی:

ہر موی کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبریں براں موی ضم است
چون تیر مدان راست دلش را زیرا
چون خربزہ دندانش میان شکم است

اگر خسرو اس طرح کی رباعیاں کہہ سکتے تھے تو لوگوں کی فرمائش پر ہندوی ڈھکوسلے کہنے میں کیا چیز مانع رہی ہوگی۔

ان امور کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ روایتاً جو ہندوی کلام امیر خسرو سے منسوب رہا ہے اسے یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد امین عباسی چریا کوٹی نے امیر خسرو کے ہندوی کلام کو مرتب کرتے ہوئے صرف دوسروں کے بھیجے ہوئے 'میٹیریل' پر اکتفا کی اور قلمی نسخوں کی تلاش میں مطلق کوئی کوشش نہ کی۔ ضرورت ہے کہ شاہان اودھ کے کتب خانوں میں جو قلمی نسخے تھے اور جن کا 'ذکر اشپرانگر نے کیا ہے۔ انھیں تلاش کیا جائے یا ان سے پہلے کا کوئی قلمی نسخہ مل جائے تو امیر خسرو کے ہندوی کلام کی از سر نو تدوین کی جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسی کسی دستاویز کی غیر موجودگی میں بھی امیر خسرو کی فارسی تصانیف میں اور ان سے منسوب ہندوی کلام کے بعض حصوں میں ایسی مضبوط تاریخی اور لسانی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کی بنا پر امیر خسرو کو 'دہلوی ہندوی' کا نقاشِ اوّل کہا جا سکتا ہے۔

■

ماخذ: خسرو شناسی، مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر، چوتھی طباعت 2010، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

امیر خسرو

شیریں زبان اور رنگین بیان شاعر

کرشن بھاوک

امیر خسرو کا اصل نام ابوالحسن اور خسرو تخلص تھا۔ بادشاہ جلال الدین خلجی نے ان کی شاعری سے متاثر ہوکر 'امیر' کے لقب یا خطاب سے نوازا۔ امیر خسرو ایک بلند پایہ شاعر اور مقبول موسیقار، مختلف اصناف یعنی مثنوی، غزل، دوہا، دوسخنوں، گیت، نظم، قصیدہ، رباعی وغیرہ میں ان کو دستگاہ حاصل تھی۔ وہ سفرناموں کی تاریخ میں تو اہم ہیں ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے ملتان، لکھنؤ اجودھیا، ٹونک (راجستھان)، پٹیالی (یوپی)، دہلی وغیرہ کے باشندوں کے دلوں پر حکومت قائم کی تھی۔ قوی زبان ہندی کے ایک زبان داں و عالم ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری نے اپنی کتاب 'امیر خسرو اور ان کا ہندی ساہتیہ' میں لکھا ہے کہ خسرو میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ انھیں اپنے مادرِ وطن پر فخر تھا۔ ان کی تصانیف میں ہندوستانی تہذیب وفلسفہ، مہمان نوازی، گلوں، رسم و دستور، یہاں کے حسن اور فیاضی وکشادہ دستی کی مدح وستائش کی گئی ہے۔ وہ خود کو 'ہندوستانی ترک' کہا کرتے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے لکھا بھی ہے کہ ''ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب'' یعنی ''میں ہندی ترک ہوں، ہندوی میں جواب دیتا ہوں۔''

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ''میں ہندوستاں کا طوطی ہوں۔ اگر تم مجھ سے اصلاً جاننے کے خواہش مند ہو، تو مجھ سے ہندوی زبان میں ہی دریافت کرو، میں تمھیں لاثانی وعدیم النظیر باتیں بتاسکوں گا۔'' اِس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کے اتنی بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان ہندوی پر انھیں کچھ کم فخر نہ تھا۔ مثنوی 'نہ سپہر' میں کہتے ہیں کہ ''سنسکرت زبان فارسی سے بڑھ کر ہے۔'' (ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری کی کتاب، ص 15,16)

روایت ہے کہ خسرو نے تقریباً چار لاکھ اشعار کہے تھے۔ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی مقبول تصنیف 'تاریخ فیروز شاہی' میں لکھا ہے کہ ان کی تعدادِ کتب اتنی زیادہ تھی کہ اس سے ایک مکمل کتب خانہ ہی تعمیر کیا جاسکتا تھا۔ نواب اسحاق خاں نے ان کی 40 سے زائد مستند کتابوں کی تعداد کی تحقیق کرلی تھی۔ خسرو نے اپنی تصانیف میں مادرِوطن ہندوستان کے بارے میں اپنی بے پناہ محبت کی جن مختلف زاویوں سے خط کشی کی ہے، اس سے آگے چند عنوانوں کے تحت اُسی کی تحقیق وتفتیش کرنے کی حتی الامکان سعی کی جارہی ہے:

1. **گل اور پھل**: امیر خسرو نے ہندوستان بھر کے

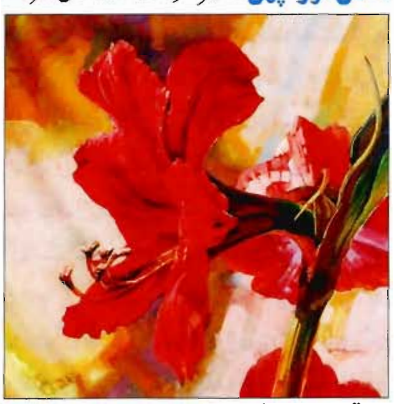

قدرتی اور جغرافیائی حسن کو جا بہ جا اپنے جذبات کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ اس ملک کے گلوں میں سوسن، بیلا، گلِ سرخ، گلِ کوزہ، گلِ لالہ، گلِ سفید، صد برگ، نسترن، (سیوتی)، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑا، گلاب اور مولسری کی تحسین کرتے ہوئے وہ اکثر جذبات میں بہہ جاتے ہیں۔ مثلاً رائے چمپا موسوم گل کو سبھی گلوں کا بادشاہ تک قرار دے ڈالتے ہیں۔ ان کے مطابق اس گل کی خوشبو تو ایسی ہے، گویا کسی شخص نے شراب میں مشک کی آمیزش کرڈالی ہو۔ یہ گل چمیلی صفت جسموں والے محبوبوں کی مانند نازک ہوا کرتے ہیں۔ اس میں زردی بھی محبوبوں کے رخساروں کی مانند ہوا کرتی ہے۔ 'سیوتی' نام والے گل کی مدح میں خسرو فرماتے ہیں کہ زنبور (زردتتیا) یا شہد کی مکھی اس پر اپنی جان نثار کرتی ہے اور بعدِ مرگ بھی اسی سے بغل گیر رہتی ہے۔ تمام عاشق و محبوب بیشتر اسی گل کے گرویدہ رہا کرتے ہیں اور اسی موجب یہ گل 'محبوبوں کا بھی محبوب' بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ آگے دیگر گلوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ گل جب کھلتے ہیں تب آسمان میں سیاہ ابر چھا جاتے ہیں اور اُن سے کچھ ایسی ہلکی پھواریں (جھیسیاں) آتی ہیں، کہ یہ ملک ہند جنت یا باغِ عدن کا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔ اگر اس نوعیت کے گل روم وشام میں ہوتے، تو اس کے باشندے ان کی تحسین وتعریف تمام جہان میں کرتے پھرتے۔ اِس طرح خسرو ہندوستان کے پھلوں کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔ مثلاً آم کی ستائش میں کہتے ہیں کہ جو شخص انجیر کو آم سے بہتر پھل کہتے، وہ تو اس نابینا عورت کی مانند ہیں، جو کہ بصرے کو شام ملک سے بھی بہتر قرار دیتی ہو۔ انھیں اِس ملک کے آموں سے ازحد اُنس تھا۔ انھوں نے انھیں 'شہد اور شیر سے پُر زریں ڈبے' تک کہہ کر ان کی تعریف کی تھی۔ آم کھانے میں اُن کی اتنی زیادہ رغبت تھی کہ مدرسے سے رخصت لے کر یہ اکثر آموں کے باغوں میں داخل ہوکر آم توڑا کرتے تھے۔ اِسی طرح خربوزے (خربذے) کا پھل بھی ان کا اتنا پسندیدہ تھا کہ انھوں نے 'خربذہ' عنوان سے ایک نغز (پہیلی) بھی کہی تھی۔ پہیلی اِس طرح ہے: دس ناری کا ایک ہی نر، بستی باہر وا کا گھر، پیٹھ سخت اور پیٹ نرم، منہ میٹھا تاثیر گرم، ان کے مطابق یہ پھل تو دیگر پھلوں سے بازی ہی لے جاچکا ہے، کیونکہ قند کی شیرینی بھی اِس سے کم تر ہی ٹھہرتی ہے۔ اِس میں آبِ حیات عرف امرت کا ساطلسمی اثر ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح کیلے کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ تو ہلال کی مانند کج اور عید کی مانند ہی خوش گوار رہا

کرتے ہیں۔ کیلے سے متعلق ان کی یہ کہ مکری ہے:

آٹھ انگل کا ہے وہ اصلی   اُس کے ہڈی نہ اُس کے پسلی
لٹا دھاری گورو کا چیلا   اے سکھی ساجن، نہ سکھی کیلا

ایک دفعہ وارنگل میں کسی عقیدت مند نے ان کو ایک 'سیتا پھل' نذر کیا، تو امیر خسرو نے کہا کہ اس پھل کا نام 'سیتا پھل' رکھنا تو گویا اتنی بڑی دیوی کی توہین ہی ہے۔ لہٰذا اس پھل کو مستقبل میں 'شریفا' ہی کہا جائے گا۔ ان کی گزارش مان کر جنوبی ہند کے باشندوں نے سب سے پہلے اس پھل کو 'شریفا' نام سے پکارنا شروع کیا تھا۔

2. جاندار ذی روح مویشی اور طائر:

امیر خسرو کے مطابق اس ملک میں طوطوں کے بھی انسانوں کی مانند کلام یا زبان کی قدرت تھی۔ پرانوں میں ایک عوامی کہانی پڑھی تھی کہ ایک دفعہ کسی برہمن نے جب کسی گوشت فروش سے عالم و کامل منڈن مشر کے گھر کا پتا دریافت کیا، تب اس نے اسے یہ جواب دیا کہ ''یہاں سے سیدھے چلے جاؤ، جس گھر کے برآمدے میں طوطے ویدوں کا پاٹھ کرتے نظر آئیں، بس وہی گھر مشر جی کا ہے۔''

امیر خسرو نے تمام ہندوستان میں دستیاب ہونے والے طائروں کی از حد تعریفیں کی ہیں۔ یوپی میں آج قصبہ پٹیلی و بجنور کے جو کوے مشہور و معروف ہیں، خصوصاً دہلی کے کووں کی مدح انھوں نے خوب کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ اس ملک کے یہ زاغ مستقبل کی خبریں فراہم کیا کرتے ہیں اور یہاں کی ممولے (گوریائیں) بھی خفیہ باتوں کا پتا بتایا کرتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں مور، (جنھیں خسرو نے ہی سب سے پیشتر قومی پرندہ اعلان کیا تھا) یہاں ایک عروسِ نو کی مانند حسن رکھتا ہے۔ یہاں ایک سفید آبی پرندہ 'بگلا' بھی قلیل سی تربیت کے بعد حیرت انگیز کرتب دکھایا کرتا ہے۔ انھوں نے ہی طنزیہ لہجے میں اس سفید پرندے کو 'بھگت' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ آگے چل کر ظاہراً نیک و شریف، لیکن باطن میں دغاباز شخص کے معنی میں 'بگلا بھگت' ایک ضرب المثل رائج ہوگیا۔ امیر خسرو نے کہا ہے کہ مینا کی مانند عرب و ایران میں کوئی طائر دستیاب نہیں ہے۔ یہاں تو ایک بکری بھی تھوڑی سی تربیت کے بعد ایک پتلی سی لکڑی کے سہارے اپنے چاروں پاؤں پر کھڑی ہوکر تھرکا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان 'نہایۃ الکمال' میں کہا ہے کہ ہند کے ہاتھی عمل میں ایک انسان کی مانند کام کیا کرتے ہیں۔

3. جوگی، ساحر، حکمراں اور فنکار:

امیر خسرو نے اپنے وقت کے جادوگروں کا مبالغہ آمیز بیان کرتے ہیں کہ وہ تو مردہ انسانوں کو دوبارہ زندہ کردینے کی اہلیت رکھتے اور ان کی عمر میں بھی اضافہ کردینے کی قدرت رکھتے تھے۔ ہند کے جوگی نفسی ریاضت دمشق سے دو سو سالوں تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح جو بھی خطہ کسی حاکم کی ماتحتی میں آجاتا، اس کی خوش حالی و بہبودی تو دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ 'جہائیں' کے قلعے کو تو جنت کے مقابل تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے نقش و نگار بے حد دلفریب ہیں اور وہ بھی اتنے کہ مقبول مصور مانی کی تصاویر بھی ان کے سامنے ہیچ ہو جائیں۔ وہاں ایسے سیکڑوں اصنام ہیں، جو کہ موم کی مدد سے بھی بنائے جانے ناممکن ہیں۔ وہیں باغات میں ایسے سیکڑوں مندر ہیں، جن پر زر و سیم (سونے و چاندی) سے بہتر نقاشی کی گئی ہے۔

4. دھلی سے لاانتہا محبت:

آج سے کافی وقت پیشتر متھرا اور یوپی کے ایٹہ ضلع کی شاہراہ پر واقع پٹیالی قصبے کو ہی امیر خسرو کا پیدائشی مقام مانا جاتا تھا اور ان کی پیدائش پٹیالی میں سنہ 1253 عیسوی میں ہوئی تھی۔ لیکن پیدائشی مقام پٹیالی قصبے کی بجائے متعدد شہادتوں کی بنا پر عالموں کی تحقیقوں سے دہلی ثابت کیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے ادیب جناب ممتاز حسین نے متعدد ثبوتوں کی بنا پر دہلی میں پیدائش ثابت کرنے کے بعد ہی سنہ 1976 میں شائع اپنی تصنیف کا نام 'امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری' رکھا تھا، چھ سال کے بعد وہی کتاب ہندوستان میں سنہ 1982 میں شائع ہوئی تھی۔ (ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری، امیر خسرو اور ان کا ہندی ساہتیہ، ص10)

جناب کے کے کھلر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انگریز نقادوں نے اپنے غلط ترجموں کے موجب بڑے مغالطے پیدا کیے ہیں، مثلاً دہلی کے چاندنی چوک میں بلی

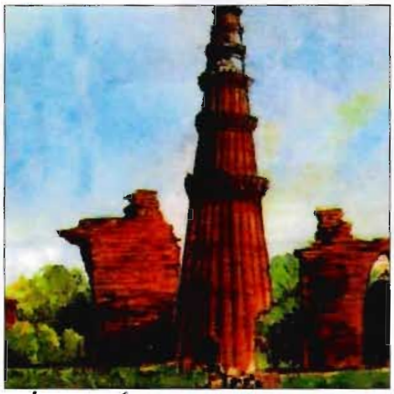

ماران کا ترجمہ Cat Killer's Lane لکھ مارا تھا۔ انھیں غلط ترجموں کے موجب امیر خسرو کی جائے پیدائش پٹیالی سے پٹیالہ کردی گئی تھی اور خود امیر خسرو دہلوی کا نام امیر خسرو کابلی کردیا گیا تھا۔ (کتاب امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر، ص 88) ایک بار امیر خسرو نے خودستائی سے اپنے کو 'طوطیِ ہند' الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ لہٰذا پروفیسر جے آر بری نے خود فارسی زبان کے عالم و کامل ہونے کے باوجود 'طوطیِ ہند' الفاظ کا غلط ترجمہ انگریزی زبان میں Parrot of India کر ڈالا تھا۔ جب کچھ سال قبل ہندوستان میں امیر خسرو کے صد سالہ جشن منائے جا رہے تھے، تب بھی ڈاکٹر ملک راج آنند نے انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس میں اپنے ایک مضمون کا سرنامہ ہی Parrot of India رکھ دیا تھا، جو کہ ایک غلط ترجمے کی مستند شہادت مانی گئی تھی۔

امیر خسرو کا تعلق متعدد بادشاہوں کے ساتھ رہا تھا اور ہر ایک حاکم سے ان کو انعام و اکرام وصول ہوتے رہے۔ وہ شیخ نظام الدین اولیا کے ایک خاص مرید تھے۔ ان کی تخلیقات دیگر تمام مذہبی اور روحانی ادب پر تفوق رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے زمانے کے ہندوستان کی عکاسی کی ہے۔ ان کی متعدد تخلیقات و دواوین (تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرہ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال) مادرِ ہند سے وابستہ ہیں۔ اصل میں وہ ہند کا تاریخی مستند اثاثہ ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے موضوع حقیقی زندگی سے ہی منتخب کیے اور اپنے وقت کے مسائل، بے قراری و خوف وغیرہ کو اپنی اصناف شاعری میں نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے

تیسرے دیوان 'غرۃ الکمال' کے مطابق جب ملتان کے حاکم سلطان محمد جنگ کے میدان میں کام آئے، تب دہلی سے ازحد محبت ہونے کے سبب ہی خسرو جلد ہی دہلی واپس آگئے تھے۔ بعد ازاں وہ صرف اپنی والدہ سے ملاقات کرنے کی غرض سے پٹیالی قصبہ گئے، کیونکہ اس وقت وہ وہاں اپنے کچھ قرابت داروں کے پاس رہ رہی تھیں۔ کچھ عرصے کے لیے وہ اودھ چلے گئے تھے اور دہاں انھوں نے دو برس تک ملازمت بھی کی تھی۔ وہاں قیام کرنے کے دوران بھی وہ اپنے پیدائشی مقام دہلی کو متواتر یاد کرتے رہے۔ انھوں نے لکھنو کی جنگ کے بعد لکھا تھا کہ اپنے یاروں کی یاد برابر ستانے اور برداشت سے باہر ہوجانے پر وہ دہلی واپس آگئے تھے کیونکہ یاروں کے ہی بار بار روکنے پر وہ بادشاہ بلبن کے فرزند بغرا خان کے لشکر کے ہمراہ لکھنوتی گئے۔ وہ وہاں سے بھی جلد دہلی لوٹ آئے تھے، گویا وہ ان کا اپنا 'دل' ہی تھا۔ لکھنوتی سے دہلی لوٹتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ انھیں ایسا لگتا ہے، گویا وہ حضرت یوسف کی مانند 'چاہِ زنداں' (قید بصورت عتاب یا سفگی) سے باہر نکل آئے ہوں۔ (خسرو، غرۃ الکمال، دیباچہ، قلمی نسخہ، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ، یوپی)۔ اسی طرح جب ایک بار بلبن کے بڑے فرزند شہزادا احمد کے ہمراہ ان کا ملتان جانا ہوا، تب دہاں ہر طرح کی سہولیات کا سروسامان موجود ہونے کے باوجود انھیں وہاں بھی دہلی شہر کی فلک بوس عمارتیں، محل سرائیں، تالاب، مرغ زار، باغات، اُن کے گلوں کی خوشبو، وہاں کی حسینائیں اور ان کے محبوب ہی یاد آتے رہے اور وہ رات دن انھیں کی یاد میں بیکل رہا کرتے تھے۔ (ڈاکٹر وحید مرزا: دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو دہلوی، ص 51)

دہلی میں 'حوضِ شمسی' کی بابت خسرو کا قول تھا کہ اگر اس کا پانی خود حضرت خضر بھی پی لیتے، تو اپنے چشمے کا پانی بھول جاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ دہلی کی آب و ہوا ایسی ہے کہ وہاں کی خوشگوار نسیم کے سبب دہلی شہر کے باغات میں پورے سال بہار رہتی ہے اور زمیں پر جنت کی شادابی اور سرسبزی نظر آتی ہے اور گلوں کی کثرت کے سبب زمیں نظر فریب و دل ربا لگتی ہے۔ (مثنوی قران السعدین)۔ امیر خسرو نے دہلی کو اس کی شاندار کاریگری، علم، سائنس، ادب، موسیقی، سازوں، نغموں اور سرود کے علاوہ اسلحہ جات میں نیزوں اور تیروں وغیرہ کو بے مثال قرار دیا ہے۔ انھوں نے ان عام لوگوں کی مدح کی ہے، جو اپنے سر پر ٹوپی یا پگڑی رکھا کرتے تھے اور خودداری کے سبب کسی بھی شخص کا نہ تو حکم بجایا کرتے تھے اور نہ ہی ناز برداری کیا کرتے تھے۔ دہلوی باشندوں کے دلوں میں باہم شفقت ومحبت آج سے صدیوں قبل موجود تھی۔ انھوں نے خطۂ دہلی میں واقع 'کیلوکھیڑی' کے اُس محل کی تحسین میں کئی اشعار کہے، جس کے نشیب میں جمنا بہتی تھی اور جس کا پانی محل کی حسیناؤں کے لیے گویا ایک آئینہ تھا۔ شاہی دربار میں ہمیشہ ہی جشنِ نوروز کی مانند رونق رہا کرتی تھی۔ اس کے ساز وسامان کی آرائش کا موازنہ ایران، توران وخراسان وغیرہ کے درباروں کی بجائے صرف جنتِ پاک سے کیا جاسکتا تھا۔ جب وہ دہلی سے اجودھیا جانے کے لیے تیار ہوئے، تب ان کی گریہ وزاری صورت طفل پھوٹ پڑی تھی۔ جب وہاں سے لوٹے، تب کسی طائر کی مانند اڑتے اور مسرور و مسحور ہوتے ہوئے اپنے نشیمن دہلی واپس چلے آئے۔ انھوں نے اپنی دلی کیفیت کی بابت لکھا، گویا کوئی خزاں دریدہ طائر اپنے گلشن میں ہی پہنچ گیا ہو یا کوئی بے حد تشنہ شخص کسی آب حیات کے آبشار کے نزدیک جا کھڑا ہوا ہو!'' (خسرو، مثنوی: قران السعدین، علی گڑھ ایڈیشن، ص 23) اسی مثنوی میں دہلی کے بارے میں اتنی زیادہ تعریفیں دیکھ کر لوگ اِس تخلیق کو 'مثنوی در صفت دہلی' کے نام سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ دہلی شہر کو خسرو نے عدن کی جنت، باغ حرم، دل کی رانی، نشۂ چشم، فردوسِ پاک، جنت کی ہریالی، چاند کی کمند جیسے دلکش و شیریں ناموں سے یاد کیا ہے۔ خسرو دہلی کے مشہور قلعہ کی بابت فرماتے ہیں کہ ''آسمان کا دائرہ نیچے رہ گیا اور اس قلعہ کی دیوار گویا اوپر ہوگئی ہے۔ اِس (دہلی) کا ہر گھر جنت ہے ادر اس کی زینت و آرائش میں بے حد رقم خرچ ہوئی ہے، اس کی شاہی مسجد 'فیض الٰہی کی جامع' یعنی اللہ کی مہربانی کا انبوہ یا مجموعہ ہے۔'' 'قطب مینار' کے بارے میں ان کے الفاظ تھے کہ ''اس عمارت کو دیکھ کر تو چاند نے بھی اپنی ٹوپی اتار پھینکی ہے۔ جب تک وہ جمنا دریا پر دِن میں ایک بار نظر نہ ڈال لیتے، تب تک انھیں ذرا بھی قرار وسکون نصیب نہ ہوتا تھا۔'' (وہی، ص 31)

اس کے علاوہ خسرو ہولی کا تہوار اپنے رفیقوں کے ہمراہ بڑے ولولے سے منایا کرتے تھے، ان پر مختلف اقسام کی پچکاریاں پھینکا کرتے تھے۔ اسی نوعیت سے وہ بسنت کا تہوار بھی نظام الدین اولیا کی درگاہ پر جاکر بڑے جوش و خروش سے منایا کرتے تھے۔ اصل میں چشتی روایت کی تمام خانقاہوں میں بسنت کے موسم کا ایک خاص مقام رہا ہے۔

5. اودھ کی سرزمیں: خسرو اپنے ہم عصر امیر علی خان عرف حاتم خان کے ہمراہ جب بے اختیار و محکوم ہوکر چند دنوں کے لیے اودھ گئے، تب بھی اپنے رفیق تاج الدین زاہد کے ہمراہ گزرے لمحات کو یاد کرکے لہو کے آنسو روتے رہے، تاہم انھوں نے اپنے ایک خط میں اودھ کی مدح میں لکھا ہے کہ ''یہ زمین دنیا کے لیے زینت ہے اور اس کے اطراف میں اسبابِ طرب جمع ہیں۔ دریا سرو (سریو) اِس کے نزدیک سے گزرتا ہے، جس کے دیکھنے ہی سے تشنہ شخص کی تشنگی بجھ جاتی ہے۔ اودھ کا شہر کیا ہے! ایک باغ میں جہاں آدمی خوشی واطمینان سے بسر کرتا ہے، گلوں و شراب کی افراط ہے، باغان میں اشجار کی شاخیں بیلوں کے بار سے خمیدہ ہوئی رہتی ہیں۔ انگور، انار، نارنگیاں اور بیسیوں اقسام کے پھل، جن کے نام ہندوستانی ہیں، شیریں اور ذائقہ دار ہیں، مثلاً کیلے و آم دماغ کو طراوت بخشتے ہیں۔ چمن میں سدابہار گل کھل رہے ہیں اور پرندوں کے سریلے اور اداس نغموں سے فضا گونج رہی ہے۔ مولسری، چمپا اور جوہی سے چمن بھرپور ہیں۔ اس کے علاوہ کیوڑا ہے، جس سے سیمیں نیزے کی مانند گلاب کا بھی خون بہتا ہے۔ پھر طرح طرح کی خوشبو دار چیزیں اور گرم مصالحے۔ عود، عنبر، مشک کافور اور (قرنفل یعنی لونگ) بھی ہیں۔'' (عرش ملسیانی: امیر خسرو، عہد فن اور شخصیت، ماخوذ، ص 32)

6. ملبوسات و وضع قطع: خسرو اپنی حیات میں اکثر دہلی کے باشندوں کی پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے۔ اُن کے لباس کو ہڑپا اور موہن جوداڑو سے لے کر بادشاہ جہانگیر کے وقت تک کے باشندوں کا ایک عام پہناوا کہا جاسکتا تھا۔ اس لباس میں کرتا، کانوں میں مرکیاں، اور دائیں بازو پر شال پہننے کی ٹھیک وہی قدیم روایت تھی اور جسم پر اچکن اسی زمانے والی کی تھی۔ مسلمانوں کے وارد ہونے سے پیشتر کلے دار پگڑی پہننے کا رواج چلا آرہا تھا۔ عوام نے اپنے مذہب تو تبدیل کرلیے تھے، لیکن رسم و رواج ادر وضع قطع نہیں ترک کیے۔ امیر خسرو کی دستیاب تصاویر دیکھ کر کوئی بھی شخص انھیں یوپی کا باشندہ قرار نہیں دے سکتا ہے۔ لنگی یا تہمد (تہہ بند) کی تو بات ہی کیا، تمبہ تک تو ملتان، جھنگ، لاہور اور امرتسر کے باشندوں کی مانند آج تک دہلی کے لوگ زیب تن کرتے نظر آتے ہیں۔

7. تہذیب و تمدن: امیر خسرو کے وقت میں خانگی سامان میں مستعمل ہونے والے برتن صدیوں پرانے تھے۔ ان میں پرات، چولہا، ہانڈی، توا، چینی ڈول وغیرہ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ دیوالی کے مبارک دن پر کی جانے والی دیابتی کی روایت بھی قدیم تھی۔ ہاں موم

بتی کا زمانہ تو بعد کا ہے۔ بذاتِ خود امیر خسرو کے گھر میں مٹی کے برتن، پانی پینے کے گھڑے، (سبو)، صراحیاں، اچار اور مربوں کے مرتبان تمام حسب سابق ہی استعمال کیے جاتے تھے۔ جس طرح گلوں میں خوشبو واقعی حقیقی صورت میں نہاں رہا کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح خسرو کی بود و باش تھی۔ اسی ثبوت کی بنا پر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے وہ اپنے نانا عماد الملک کے دہلی والے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں رہ کر ان کی عمرِ طفلی گزری تھی اور عہد بلوغت بھی۔ انھوں نے شاہی درباروں میں اپنائے جانے والے طور طریقے اور سلیقے بھی وہیں رہ کر سیکھے تھے۔ وہ بسا اوقات بنا سلے لباس بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ چونکہ قدیم زمانے میں شمالی ہند کے سنت وغیرہ ایسا ہی کرتے آئے تھے، لہٰذا امیر خسرو نے بھی ہندوؤں کی طرز کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا ایک ناگزیر و لازم حصہ بنا لیا تھا۔

8. دھلوی ھندی سے محبت: امیر خسرو کو اس ملک کی ہندوی زبان سے اتنی شفقت تھی کہ انھوں نے متعدد دوہوں، پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، ڈھکوسلوں، مخمسوں، غزلوں اور نظموں میں جا بہ جا اپنی عزیز زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ بیان ہے کہ ''خسرو ہندوستاں میں پیدا ہوئے، اس پر تقریباً سب تذکرہ نویس ہی متفق نہیں ہیں، بلکہ مثنوی 'نہ سپہر' میں خسرو از خود صاف طور پر کہتے ہیں کہ ''ہست مرا مولد و ماورائی و وطن۔'' اس کے علاوہ ان کی ماں بلاشبہ ہندی نژاد تھیں۔ اس لیے کہ اپنے نانا عماد الملک راوت عرض کا ذکر کرتے ہوئے وہ کئی جگہ ان کی سیاہ رنگت اور ان کے پان کھانے کے شوق کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندی (یا ہندوی) خسرو کی مادری زبان تھی اور ظاہر ہے کہ انھیں اس پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس زبان کو اتنی اچھی طرح جانتے ہوئے خسرو جیسے شاعر کے لیے اس میں شعر نہ کہنا بعید از قیاس ہے۔ جب کہ ان سے پہلے کے بعض فارسی شاعر مثلاً مسعود بن سعد بن سلمان ہندی نظم میں طبع آزمائی کر چکے تھے۔'' (امیر خسرو: سوانح عمری، ص 249-50) کہیں اور بھی ان کا قول ہے کہ ''جہاں اِس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ امیر خسرو ہندی میں شعر کہتے تھے، وہاں یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کا ہندی کلام کبھی باقاعدہ جمع نہیں کیا گیا اور اگر اس میں سے کچھ ہم تک پہنچا ہے، تو بعض شوقینوں کی بیاضوں کی بدولت اور یا زبانی روایت کے ذریعے۔'' ڈاکٹر نذیر احمد کی یہ رائے بھی اسی کی مشابہ ہے ''کوئی شبہ نہیں کہ وہ (امیر خسرو) ہند کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور انھوں نے اس زبان میں کافی سرمایہ بھی چھوڑا ہوگا۔ یہ ہماری بڑی بدنصیبی ہے کہ خسرو کا ہندی کلام سارا برباد ہو گیا۔ دراصل اس کی بازیابی کی پوری کوشش بھی نہیں ہوئی ہے۔'' دیباچہ 'غرۃ الکمال' میں ان کا یہ شعر فارسی اور ہندی میں کسی بھی زبان کا ہو سکتا ہے۔ 'اری اری ہمہ بیاری اری، ماری ماری برہ کہ ماری اری۔' اس زبان میں اپنی تخلیقات کی بدولت وہ اپنے کو 'ہند کا طوطی' کہا کرتے تھے۔ انھوں نے بذاتِ خود ہندی شاعری کو فارسی زبان کی بحروں سے روشناس کرایا تھا اور اس کے علاوہ ہند میں اُس سے پیشتر رائج پراکرت اور اَپ بھرنش زبانوں کے اثرات سے بھی آزاد کروایا تھا۔ ایسا کرنے سے ان کی زبان اردو زبان کے نزدیک تر ہوتی چلی گئی تھی اور اس میں سادگی، فراست اور عام فہمی کی متعدد خوبیاں سرایت کرتی چلی گئی تھیں۔ انھوں نے جس عام فہم دہلوی ہندی یعنی زبانِ دہلی کو 'ہندوی' یہ موسومہ نام دیا تھا، وہ عموماً، دہلی اور اس کے قرب کے خطوں میں بولی جاتی تھی۔ یہ بولی تو

گویا انھیں اپنی والدہ سے حاصل ہوئی تھی اور جس گھرانے میں ان کا نکاح ہوا تھا، اس میں بھی یہی بولی جاتی تھی۔ ان کے خاندانی رکن اسی زبان میں باہم مکالمے کیا کرتے تھے۔ یہی 'زبان دہلی' آگے چل کر اردو جیسی عظیم زبان کی صورت میں ظہور میں آئی اور دنیا بھر میں مقبول و معروف ہو کر قائم ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو کو قومی زبان ہندی زبان کی سب سے بڑی ہیئت کھڑی بولی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا بھی بانی تسلیم کرنا موزوں و مناسب ہے۔ ایٹہ ضلع کے جس قصبے کو غلطی سے ان کا پیدائشی مقام مانا جاتا تھا، وہاں اِس ہندوی زبان کا کوئی بھی چلن کبھی نہیں رہا ہے۔ وہاں کی محاورہ دانی، روزمرہ کی بول چال اور تلفظ دہلوی ہندی سے ازحد مختلف رہے ہیں۔ اب خسرو کی زبان کو ہم چاہے پوربی بولی کا نام دیں یا برج یا کھڑی بولی کہیں، اس کا انداز، لہجہ وغیرہ خالص دہلوی اور جداگانہ رہا ہے۔ اس شیریں زبان میں پنجابی، ملتانی، راجستھانی اور لاہوری زبان کے الفاظ کی چاشنی، دلکش حلاوت، روانی و سلاست کی آمیزش موجود ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے اس ہندوی زبان کے نقادوں پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ وہ زبان ہے جسے سن کر ہندی زبان والے شرما جایا کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہت بعد کی چیز ہے۔'' (کے کے کھلر کی کتاب امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر، ص 94)

بنیادی طور پر ایک ترک ہونے کے باوجود امیر خسرو اس ملک کے شاعر تھے۔ انھوں نے اگر اپنی پہیلیوں میں فن تعمیر میں فوارہ اور غسل خانہ، رسوئی کی اشیا میں لوٹا، ہنڈیا، زیوروں میں نتھ، نگینہ اور کنٹھا گنائے ہیں، تو صحرا کی چیزوں میں سرخ ویرِ بہوٹی، آک کے شجر، کھیلوں میں پتنگ اور چوسر، پسندیدہ پھلوں میں اناروں، کیلوں، خربذوں اور آموں، طائروں وغیرہ میں کوئل، لال چڑیا، مینا، بگلا، بیا، طاؤس (مور) اور بھنورے کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ جنگلی چیزوں میں مشک، نیم کی نبولی، بھٹا، گھریلو اشیا میں موڑھا (یا موڑھا)، آئینہ، چراغ کی بتی، چارپائی، جامن، چرخہ، مسی، متھنی (یا متھانی)، چلمن کا جل، آری، پان، قینچی وغیرہ، موسیقی میں بانسری، جواہرات میں لعل، اسلحہ جات میں تلوار، ڈھال، بندوق، پیشوں میں کمہار، نفر (رنگ ریز)، اور دیگر اشیا میں انار (آتش بازی)، ڈولی روپیہ، کمہار کا چاک وغیرہ کا شمارہ یا تعداد خصوصاً قابل غور ہے۔

اسی طرح ان کی کہہ مکرنیوں میں جانور و طائروں کے طور پر گھوڑا، بندر، مینا اور ہاتھی وغیرہ ہیں، تو پھلوں میں کیلا اور گنا کا ذکر ہوا ہے۔ موسیقی میں راگ اور ڈھلو، گھریلو سامان میں دیا (چراغ)، تیل، پنکھا، جوتا، کنگھی، گگری، لوٹا، اور نمک ہیں، تو زیورات میں چوڑا، نتھ اور ہار ہیں۔ اگر گلوں میں ٹیسو ہے، تو سیاروں میں چندا اور تارے چمک رہے ہیں۔ دیگر اشیا میں موتی، لہنگا، بھانگ، پیسہ، معدنی (دھاتوں) میں سونا اور پیشوں میں کمہار و چور اپنا نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ ان کی تخلیق 'اعجازِ خسروی' میں ایسے لہار ہیں، جو کہ کاریگری میں کمال رکھتے ہیں اور ایسی لچک دار تلواریں بناتے ہیں، گویا خاموش ماحول میں گھاس کی پتیاں لہرا رہی ہوں۔ اسی طرح ہر سوزن گر ہیں، جو اپنی نازک سوئیوں سے طلائی (سنہرے) گل بوٹے کھلایا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ کمان گر (دھنش بنانے والے)، تیر گر، نقاش، کشف دوز (جادگر)، کلہ دوز وغیرہ بھی ہیں۔ امیروں میں بیشتر بجاج اور بقال (کرانیے، پر چونیے) ہیں۔ اپنے وقت کے صرافوں اور زرگروں کے بارے میں امیر خسرو نے یہ طنز

کیا ہے کہ ان کے دل بھی کسوٹی کی مانند ہی کالے ہو چکے تھے۔ اس شاعر نے دو سخنے جیسی ادبی صنف استعمال کی ہے، اس میں بھی مندرجہ بالا چیزیں ہیں، مثلاً دانہ، کھائی، راج (پیشہ)، بطور زیور ہار وغیرہ، جانور کے طور پر گاؤ (بیل) اور بطور گھریلو سامان کے دھوتی، دیا، چھڑی، جامن، پردہ اور بادام وغیرہ کا ذکر ہوا ہے۔ اگرچہ یہ فہرست نامکمل ہے، تاہم اس سے عظیم شاعر امیر خسرو کے ہندوستان سے بے پناہ محبت کی ملتی ہے۔

9. موسیقی اور ہندوستان کے مغنی پرندے: تخلیق 'اعجازِ خسروی' کے مطابق 'خسرو نے خراسان سے کچھ موسیقی دانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کا ذکر کیا ہے اور ہندوستانی ماہرینِ فن کو دعوت دی ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں آئیں، تا کہ قمریان بالا کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ بہارِ ہندوستان میں پرند کیسے ہیں:

کہ تا دوست شود مریان بالا را
کہ مرغ چون بود اندر بہارِ ہندوستان

(اعجاز خسروی، رسالہ دوم، ص 180)

'قران السعدین' اور 'نہ سپہر' ان دونوں مثنویوں میں انھوں نے اپنے زمانے میں رائج آلاتِ موسیقی کے ناموں کے ساتھ ساتھ ان کی طرز بناوٹ اور ساخت کا بھی بیان کیا ہے۔ ان کے ہم عصر موسیقی کے ماہر تان سین نے انھیں 'نائک' کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ (تخلص اختر) کا نام ناقدانِ فن میں آتا ہے اور انھوں نے اپنی تصنیف 'صوت المبارک' میں تان سین کے عطا کردہ خطاب 'نائک' کو تو تسلیم کیا ہے، لیکن ان کے مطابق وہ ''نائکِ خیال تھے، نائکِ دھرپد نہ تھے'' واجد علی شاہ کے مطابق خسرو کے ایجاد کردہ راگ یہ تھے: ترانہ، چھند، پربند، گیت، قول، قلبانہ، نقش اور گل۔ (ملاحظہ کیجیے: صورت المبارک، ص 42، نیز دیکھیے: آئین اکبری، ج 2، ص 138-129) خسرو کا زمانہ ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کے باہمی امتزاج کا تھا، وہ اس سے مطمئن تھے، اور ہندی راگوں و راگنیوں کی آمیزش سے بھی آسودہ و سیر ہوتے تھے۔

ایک پرانی ہندی فلم میں مستعمل شاعر سرشار سیلانی کا یہ مقبول شعر یاد آتا ہے:

چمن میں اختلاف رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تمھیں تم ہو تو کیا تم ہو

روایت کے مطابق امیر خسرو کو از خود موسیقی میں ڈھول، طبلہ، بینا جیسے متعدد سازوں کی ایجاد کا شرف حاصل ہے۔ صرف 'سہ تار' (ستار) کی اختراع کی بابت عالم نقادوں میں اختلافِ رائے آج تک ہے۔ 'سہ تار' کی ایجاد خسرو کی اِس لیے نہیں ہو سکتی، کیونکہ خسرو نے اپنی تخلیقات میں اس کا نام بھی کہیں نہیں لیا ہے، لیکن وہ بینا یا بین اور عود یا طنبور کی ساختوں کو ملا کر بنایا گیا ہوگا۔ فقیر اللہ کی کتاب 'راگ درپن' میں تو خسرو کی ایجادوں میں قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، سوحلہ وغیرہ کا شمار ہے۔ اگر 'راگ درپن' کے حوالوں کی صحت مستند و معتبر نہ بھی مانی جائے، تاہم ڈاکٹر وحید مرزا کی اِس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ''بعض چیزیں مثلاً قول، ترانہ وغیرہ غالباً خسرو کی طرف سے صحیح طور پر منسوب کی جاتی ہیں، جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب تک قوال عام طور پر خسرو کو اپنا استاد مانتے ہیں اور ان کی خاص طور پر عزت و تکریم کرتے ہیں۔''

(ڈاکٹر وحید مرزا: امیر خسرو، سوانح عمری، ص 261)

تخلیق 'اعجازِ خسروی' میں خسرو کے صرف دو دوہے ہی درج ہیں:

خسرو رَین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ
گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس،
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

جس وقت اِن کے استاد نظام الدین اولیا جنت نصیب ہوئے، یہ شاہی لشکر کے ہمراہ ترہُت کی مہم پر گئے ہوئے تھے، جب دہلی لوٹے، تب اپنے استاد کے انتقال کی خبر پا کر غم سے وارفتہ ہو کر انھوں نے اپنے کپڑے دیوانہ وار تار تار کر ڈالے اور اپنے منہ پر سیاہی پوت کر اپنے استاد اولیا کی زیارت کی غرض سے مزار پر پہنچے اور مندرجہ بالا دوسرا دوہا پڑھ کر گر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ حضرت نظام الدین کی وصیت کے مطابق انھیں ان کے ان محرم اسرار کو بھی ان کے ہی پہلو میں دفنایا جانا تھا، لیکن غالباً سلطان محمد تغلق کی طرف سے درگاہ کا بطور متولی مقرر ایک خواجہ سرا نے یہ اعتراض ظاہر کیا کہ اس طرح سے مرید و مرشد دونوں کی قبروں میں مغالطہ ہوا کرے گا، لہٰذا خسرو کو ان کے استاد اولیا صاحب کے قدموں کی جانب دفنایا گیا تھا۔

ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ قول بھی قابلِ ذکر ہے ''ان دونوں کے نام ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں، جو قرب اور خصوصیت خسرو کو اپنی زندگی میں حضرت نظام الدین سے تھی، وہی مرنے کے بعد بھی باقی ہے اور اب بھی عقیدت مند زائر اپنے دل کی مراد خسرو کے ہی کے توسط سے نظام الدین اولیا کے حضور میں پیش کرتا ہے اور اُن کے مزار پر جانے سے پہلے عقیدت مندی اور ارادت کے پھول خسرو کے مزار پر ضرور چڑھاتا ہے (امیر خسرو: سوانحِ عمری، ص 139)۔ زیارت کی غرض سے آنے والے لوگ تا حال اِس بے مثال شاگرد امیر خسرو کے سامنے سجدہ کرنے کے بعد ہی اولیا کے حضور میں جایا کرتے ہیں، مرشد و مرید کا ایسا لاجواب و خویش تعلق اس فانی دنیا میں ملنا بھی ناممکن ہے۔ ہندو مذہب میں بھی تمام بھگت بھگوان شو جی کے مندر میں جانے پر اُن کے درشن سے قبل باہر ہی بنی اُن کے خادمِ مانے جانے والے تندی بیل کی مورت کی پوجا پہلے کیا کرتے ہیں، اس کے بعد ہی اپنے مطلب وہ بھگوان کے دیدار کیا کرتے ہیں۔ تقریباً سات صدیاں گزر چکی ہیں، کتنے بادشاہ اور عظیم ہستیاں آئیں اور چلی گئیں، سر بفلک عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہو گئیں، لیکن دہلی نگر کی طرح ہی ان بے مثال مرشد و مرید دونوں کے ہی مزار کی بابت بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

نہ معلوم یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے، رونق وہی ہے اس کی محفل کی

ایک بلند پایہ اور مایہ ناز صوفی پیر، شاعر، موسیقی دان، سازوں اور راگوں کی ایجاد کا شرف حاصل کرنے والے کے علاوہ اردو کے ساتھ قومی زبان ہندی دونوں کے ہی بانی اس عظیم، ذکی و عالم فنکار اور 'شاعروں کے شاعر' امیر خسرو کو اپنی طرف سے ہم خراجِ عقیدت پیش کرنے میں از حد فخر محسوس کرتے ہیں کیونکہ جس نے ایک سخت ترک ہو کر بھی تمام ذاتی مذہبی عقیدوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے مادرِ وطن ہند کی ماٹی کی نسبت بے پایاں محبت و شفقت کو اپنی تخلیقات میں جا بہ جا نمایاں کیا ہے۔ علامہ اقبال نے خسرو کی زبان کی حلاوت اور سلاست وغیرہ کی بنا پر ہی ان کو 'شیریں زبان اور رنگین بیان شاعر' کہہ کر ان کے سارے کلام کو کوزے میں سمندر کی مانند بند کرنے کی کاوش کی تھی۔ اس مقولہ سے کاملاً متفق ہوا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Krishan Bhavuk,H.No:201-A, Gali No: 18-K, Guru Nanak Nagar, Patiala - (PB)

حسن الدین احمد

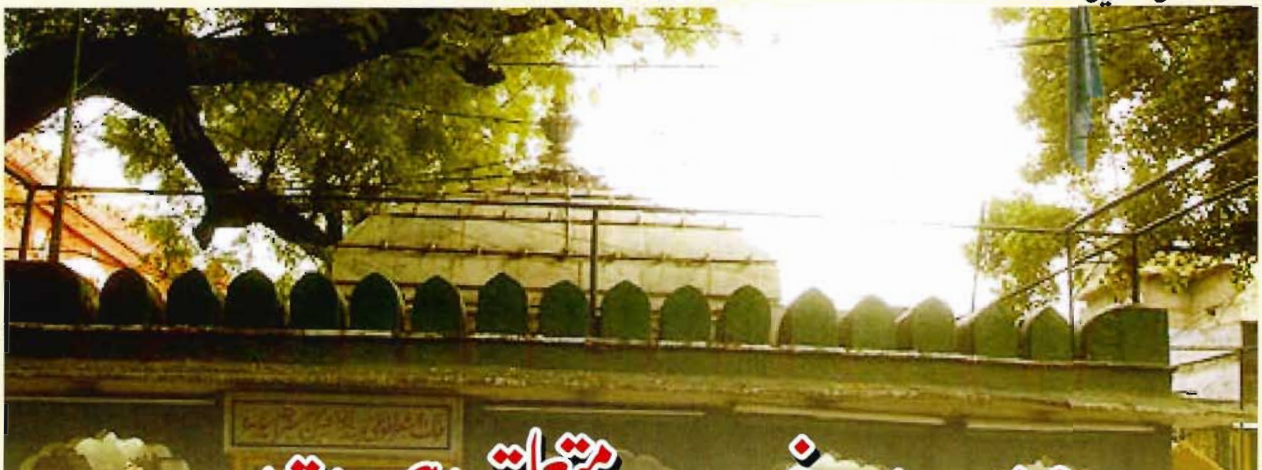

حضرت امیر خسرو سے متعلق اہم واقعات

واقعات ماقبل ولادت

سنہ عیسوی	اہم واقعات
1202ء 598/99ھ	الیاس بن یوسف نظامی گنجوی کی وفات
1207ء 604ھ	پیدائش مولانا روم۔ (20 ستمبرم 6 ربیع الاوّل)
122ء 617ھ	چنگیز خاں زرنوق اور نور بخارا فتح کرتا ہوا بخارا پہنچا۔ بخارا کو تباہ کرنے کے بعد سمرقند کا رُخ کیا اور جلد ہی اُس کو فتح کرلیا۔
1227ء 624ھ	چنگیز خاں کی وفات
1243ء 640ھ	مستنصر باللہ کی وفات اور مستعصم باللہ کی تخت نشینی (ماہ جمادی الثانی)
1253 (3 مارچ یکم محرم 151ھ)	ولادت بمقام موضع پٹیالی ضلع ایٹہ (پٹیالی کو مومن آباد یا مومن پور بھی کہتے ہیں) (بعہد: سلطان ناصرالدین محمود (تخت نشینی 1246ء)—
1255	(عمر: 2 سال) ولادت امیر حسن سجزی بمقام بدایوں
1258	دہلی کے جنوب میں باغی میواتیوں کی سرکوبی۔ ہلاکو خاں نے بغداد پر فوج کشی کی (ذی الحجہ 65 ہجری) بغداد میں قتل، عام خلیفہ مستعصم باللہ کا قتل (محرم 656 ہجری)۔ عباسی خلافت کا خاتمہ۔
1260	(عمر: 7 سال)، سلطان ناصرالدین محمود کے دربار میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کے سفیر کی آمد۔ قاضی منہاج سراج نے طبقات ناصری کو مکمل کیا— والد نے مکتب کو بھیجا۔ والد امیر سیف الدین محمود کی وفات۔
1265	(عمر: 12 سال)، دانتے کی پیدائش
1266	(عمر: 13 سال) سلطان ناصرالدین محمود کی وفات۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی۔ حضرت بابا شیخ فریدالدین گنج شکر کی وفات (5 محرم 664ھ)— ابتدائی نظمیں جو اپنے استاد خواجہ علاءالدین کی حوصلہ افزائی پر لکھیں۔ (بعہد: سلطان غیاث الدین بلبن)
1267	(عمر: 14 سال)،— (حالاتِ زندگی امیر خسرو): استاد خواجہ علاء الدین نے شعرگوئی کی حوصلہ افزائی کی، (ادبی کام): شاعری کی ابتدا ابتدائی نظمیں وہ نظمیں لکھیں جو بعد میں شامل دیوان ہوئیں۔ پہلے دیوان تحفۃ الصغر کی تدوین۔
1272	(عمر: 19 سال)، سلطان نے غزنی سے منگولوں کے حملوں کی مدافعت کے لیے لاہور کے فوجی مرکز کو مضبوط کیا۔
1273	(عمر: 20 سال)، مولانا روم کی وفات، (18 دسمبرم 6 جمادی الآخر 673 ہجری) پیدائش 30 ستمبر 1207ء م 6 ربیع الاوّل 604ھ)— نانا اور سرپرست عمادالملک کی وفات، سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجہ ملک علاء الدین محمد کشلی خاں عرف ملک چھجو کے دربار سے وابستگی (مدت: 4 سال)
1274	(عمر: 21 سال)، سینٹ تھامس اکویناس کی وفات۔
1276 (15 جون م یکم محرم 675ھ)	(عمر: 23 سال)، پیدائش حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی (675ھ) (وفات 18 رمضان 757ھ)، سلطان بلبن کے چھوٹے فرزند بغرا خاں، حاکم سامانہ (قریب ملتان) کے خاص مصاحبین میں شمولیت، دوسرے دیوان وسط الحیٰوۃ میں جو غزلیں شامل ہیں وہ اس دور میں لکھیں (تدوین 1283ء)
1277	(عمر: 24 سال)، بنگال میں طغرل کی سرکشی
1278	(عمر: 25 سال)، سلطان نے طغرل کو شکست دی۔
1279	(عمر: 26 سال)، لکھنوتی کے حاکم ملک طغرل کے حاکم ملک طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کی مہم میں بغرا خاں کے ساتھ شرکت۔
1281	(عمر: 28 سال) سلطان بلبن کے بڑے فرزند سلطان محمد قآن ملک کی مصاحبت میں ملتان کو روانگی۔ امیر حسن سجزی سے دوستی کا آغاز۔
1283	(عمر: 30 سال) دیوان وسط الحیٰوۃ کی تدوین 682ھ

1285 (عمر: 32 سال)، منگول حملہ میں سلطان محمد کی شہادت۔
(مارچ 1285ء)، منگولوں کے ہاتھوں دریائے راوی کے قریب امیر خسرو کی گرفتاری اور کافی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہائی۔ کچھ عرصہ پٹیالی اور دہلی میں گوشہ نشینی ملک امیر علی سرجاندار (حاتم خاں۔ خان جہاں) حاکم اودھ کی مصاحبت)، خسرو نے سلطان محمد کی شہادت پر ایک پردرد مرثیہ لکھا جو ہندوستان کے فارسی دانوں میں بہت مقبول ہوا۔

1287 (عمر: 34 سال)، (بعہد: سلطان معزالدین کیقباد— معز الدین کیقباد کی تخت نشینی۔)

1288 (عمر: 35 سال)، کیقباد اور ان کے والد بغرا خاں کی
(6 فروری یکم محرم 687ھ) مصالحت، اودھ سے واپسی اور دربار دہلی سے وابستگی۔

1289 (عمر: 36 سال)، رمضان 688ھ میں تین مہینے کی کاوش کے بعد پہلی تاریخی مثنوی قران السعدین کو مکمل کیا۔

1290 (عمر: 37 سال)، سلطان معز الدین کیقباد کا قتل۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا تخت دہلی پر قبضہ۔ دہلی دربار سے بحیثیت مصحف دار وابستگی، (بعہد: سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی)

1291 (عمر: 38 سال)، قحط۔ مارکو پولو کی جنوبی ہند کے ساحل پر آمد۔ دوسری تاریخی مثنوی مفتاح الفتوح (2 جمادی الثانی 690ھ میں) تکمیل کو پہنچی۔ یہ تیسرے دیوان غرۃ الکمال کا جزو ہے۔

1292 (عمر: 39 سال)، وفات شیخ سعدی شیرازی (ماہ شوال 691 ہجری)، (پیدائش 575 ہجری)

1293 (عمر: 40 سال)، ڈیڑھ لاکھ منگول حملہ آوروں کی شکست۔

1294 (عمر: 41 سال)، ایلچپور کا الحاق۔ تیسرا دیوان غرۃ الکمال مرتب ہوا۔ 692ھ

1295 (عمر: 42 سال)، جلال الدین خلجی کا قتل۔

1296 (عمر: 43 سال)، علاء الدین خلجی کی تخت نشینی (24 ذی الحجہ
(جون م یکم محرم) 695ھ) علاء الدین کی مہم دیوگیری، (بعہد: سلطان علاء الدین خلجی)

1297 (عمر: 44 سال)، فرزند عین الدین خضر کی ولادت۔

1299 (عمر: 46 سال)، گجرات کی فتح والدہ اور برادر (مبارک قتلغ) کی وفات۔ مثنوی مطلع الانوار، شیریں خسرو اور مجنوں ولیلیٰ کی تدوین۔ مثنوی آئینہ سکندری کی تدوین۔

1301 (عمر: 48 سال)، رنتھمبور کی فتح۔

1302 (عمر: 49 سال)، دکن پر ملک کافور کے حملوں کا آغاز منگول حملہ آوروں کی شکست، دختر عفیفہ کی ولادت، مثنوی ہشت بہشت کی تدوین۔

1303 (عمر: 50 سال)، چتوڑ کی مہم، چتوڑ کی فوج کشی میں امیر خسرو شریک رہے۔

1304 (عمر: 51 سال)، چتوڑ کی فتح۔

1306 (عمر: 53 سال)، مالوے کی تسخیر۔

1307 (عمر: 54 سال)، ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیری کی مہم

1310 (عمر: 57 سال)، ملک کافور کے ہاتھوں تلنگانے کی فتح۔ حضرت نظام الدین اولیاء امیر خسرو کو تصوف کی تعلیم دیتے ہیں۔

1311 (عمر: 58 سال)، ملک کافور کے ہاتھوں معبر کی فتح، خزائن الفتوح کی تدوین۔

1313 (عمر: 59 سال)، جنوبی ہند کی فتوحات کے بعد ملک کافور کی
(9 مئی م یکم محرم 712ھ) دہلی کو واپسی۔

1314 (عمر: 61 سال)، ملک کافور کے ورغلانے پر سلطان اپنے رشتہ داروں کو قتل کرواتا ہے۔

1315 (عمر: 62 سال)، 7 شوال 715ھ کو علاء الدین خلجی کا انتقال ملک کافور کا قتل۔ امیر خسرو اپنے روحانی پیشوا کے اقوال کو جمع کرنے کے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ خضر خاں، (ذیقعدہ 715ھ میں) تکمیل کو پہنچی۔

1316 (عمر: 63 سال)، 714 ہجری دیوان بقیہ نقیہ کی تدوین، (بعہد: سلطان قطب الدین مبارک خلجی، سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی تخت نشینی (24 محرم 716 ہجری)

1318 (عمر: 65 سال) چوتھی تاریخی مثنوی نہ سپہر کو جمادی الاول 718ھ میں پورا کیا جس میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے دور کے حالات بیان ہوئے۔

1319 (عمر: 66 سال) افضل الفوائد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء (1314ء تا 1319ء) کی تکمیل اور اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز کی ترتیب۔

1320 (عمر: 67 سال، سلطان قطب الدین مبارک خلجی کا قتل۔ (یکم جمادی الثانی 720 ہجری) سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو خاں کو شکست دے کر سلطنت دہلی پر قبضہ کیا، (بعہد): سلطان غیاث الدین تغلق

1322 (عمر: 69 سال)، دیوگڑھی کی مہم میں شہزادہ الغ خاں کے ہمرکاب رہے۔

1324 (عمر: 70 سال)، اودھ کی مہم میں سلطان غیاث الدین تغلق کی ہمرکاب رہے۔

325 (عمر: 72 سال)، سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات سلطان
(8 دسمبر م یکم 726ھ) محمد تغلق کی تخت نشینی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا وصال (3 اپریل م 18 ربیع الاوّل 725 ہجری روز چہارشنبہ بعد طلوع آفتاب بعمر 95 سال)، امیر خسرو کی وفات (27 ستمبر م 18 شوال)، پانچویں تاریخی مثنوی تغلق نامہ کی تدوین۔ پانچویں دیوان نہایت الکمال کی تدوین (725 ہجری)، (بعہد: سلطان محمد تغلق)

1326 م 726 ہجری حافظ شیرازی کی پیدائش۔ (وفات: 89-1388ء م 791 ہجری)

سلیم شہزاد

زبان کی تدریس اور بچوں کا ادب

بچہ چاہے مادری زبان کے توسط سے تعلیم حاصل کرے یا غیر مادری زبان کے توسط سے، اسکولی تعلیم کی ابتدا ہی زبان کی تدریس سے ہوتی ہے۔ ابتدائی درجات سے پہلے بھی کنڈر گارٹن کے پُرشور ماحول میں چیزوں وغیرہ کی شناخت کے لیے اسے چیزوں کے نام سکھائے جاتے ہیں اور کم از کم دو برس کی مدت میں گھر، خاندان اور اسکول کے ماحول میں سیکھتے ہوئے اس کے لفظوں کے ذخیرے میں سو دو سو نئے لفظوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کہانیاں اور نظمیں سن کر اور انھیں دہرا کر بچہ اپنے ذخائر الفاظ آموختہ کرتا رہتا اور پہلے درجے میں آتے آتے اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسے لفظوں، فقروں اور جملوں وغیرہ کے ساتھ انھیں تشکیل دینے والی آوازوں اور ان آوازوں کی تحریری علامتوں یعنی حروف تہجی سے بھی متعارف کرایا جاسکے۔ اس تعارف کے بعد اسی درجے میں بچہ مزید کہانیوں، نظموں اور تک بندیوں وغیرہ کی صورتوں میں ادب سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس مرحلے میں ادب فن کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لغوی معنوں میں واقعی ادب و تادیب کا مظہر ہوتا ہے۔ ابتدائی درجوں کی درسی کتابوں میں شامل بہت سا لسانی متن تعلیمی معمول یعنی طالب علم کی ذہنی و فکری تربیت، تہذیب اور تادیب کے مقصد کا حامل ہونے کے سبب فنی قدر سے ذرا فاصلے پر نظر آتا ہے۔ اگر چہ اس میں بچے کے حظ و انبساط کا ذریعہ ہونے کے خواص بھی پائے جاتے یا شامل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے تیسرے چوتھے درجے سے درسی کتابوں میں ادب بطور فن شامل نظر آتا ہے۔ اس میں نظم و نثر کی ہیئتوں میں نظمیں، گیت، کہانیاں، ڈراما، انشائیہ اور خاکہ جیسی اصناف پر مشتمل اسباق ہوتے ہیں اور اگر چہ انھیں پڑھنے پڑھانے کا مقصد اصناف ادب سے تعارف وغیرہ قطعی نہیں ہوتا لیکن ان کے بغیر زبان کی تدریس میں تنوع، لطف و مسرت اور تفہیم و تادیب کے مقاصد بھی حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تدریس کے لیے منتخب اس ادب پر کچھ گفتگو کر لی جائے۔ چنانچہ عرض ہے کہ ابتدائی درجے کی کسی درسی کتاب میں شامل بچوں کا ادب بچوں کا وہ ادب نہیں ہوتا جو درسی کتاب کے باہر لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ گویا بچوں کے ادب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے درسی کتاب میں شامل بچوں کا ادب، بہر حال کتاب سے باہر کے بچوں کے ادب ہی میں کچھ تبدیلیوں اور کچھ کمی بیشی کے بعد درسی کتاب میں تدریسی متن کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ درسی کتاب کی ساخت و بافت اور تعمیر و تشکیل کے کچھ مراحل ہیں اور بچوں کا ادب ان سے گزر کر ہی تدریس کے لائق بنتا ہے۔

ان مراحل کے تناظر میں مولوی محمد حسین آزاد کی یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی جانے والی درسی کتاب کی تیاری کے تعلق سے کہی ہے کہ بچوں کے لیے لکھنے میں مجھے گھٹنوں چلنا پڑا ہے۔

یہ 'گھٹنوں چلنا' ہمارے موضوع کے تعلق سے بہت معنی خیز عمل ہے۔ اردو میں پہلے پہل تدریسی ضرورتوں کے تحت بچوں کا ادب تخلیق کیا گیا۔ بچوں کی ذہنی عمر، اکتسابی صلاحیت، ان کے خاندانی اسکول ماحول اور ان کی دلچسپیوں کے پیش نظر اس ادب میں پریوں کی کہانیاں، پہیلیاں، سبق آموز تاریخی واقعات اور مناظر قدرت پر نظمیں وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں درسی کتاب سے باہر بھی بچوں کے ادب کے نام سے ضرور پائی جاتی ہیں مگر زبان سکھانے کے مقصد سے جو نصاب تیار کیا جاتا ہے، اس کے تقاضے محض پریوں کی کہانیوں اور مناظر قدرت پر نظموں وغیرہ سے ہرگز پورے نہیں ہوتے اور چونکہ تدریس کے لیے ایسے ہی لسانی متن کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہمارے زمانے میں جب کہ بچوں کا ادب اچھی خاصی مقدار میں پیدا کیا جارہا ہے، اس پیداوار سے حسب ضرورت مواد لے کر درسی کتاب تیار کرنے والے نصاب کے مطابق اس میں رد و بدل کرنے اور اسے تدریسی متن کی صورت دیتے ہیں۔ اس صورت گری کو 'گھٹنوں چلنے' سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مرتبین پچاسوں رسالوں کتابوں کی ورق گردانی کرنے اور دسیوں کہانیوں کو حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد باہمی مشورے سے کوئی ایک کہانی درسی کتاب کا حصہ بننے کے لیے پسند کر لیتے ہیں مگر اس کہانی کو جیسی کہ وہ کسی رسالے یا کتاب میں شامل ہے، بالکل اسی مصنف کے بنائے ہوئے متن کے ساتھ قبول نہیں کیا جاتا۔ اس کہانی کے انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ کہانی درسی کتاب کے لیے تیار کی گئی نصابی اساس کے کسی تقاضے کو پورا کرنے کی کچھ صلاحیت رکھتی اور اسے تعلیمی تقاضے کے مطابق تدریسی اکائی کی

شکل دی جاسکتی ہے۔ اب مرحلہ آتا ہے مرتبین کے گھٹنوں چلنے کا جس جماعت کے لیے درسی کتاب بنائی جارہی ہے، اس میں پڑھنے والے بچوں کی طبعی عمر، ان کی ذہنی صلاحیتیں، ان کا گھریلو، محلّہ واری، شہری اور ملکی ماحول، زبان و بیان کے تقاضے اور ضرورتیں، کتاب بنانے والے ادارے اور ریاستی/مرکزی سرکار کی تعلیمی پالیسیاں، غرض متعدد عوامل ہیں جنھیں بالجبر واکراہ قبول کیے ہی بنتا ہے تب جاکر کوئی منتخبہ کہانی/نظم/مضمون وغیرہ درسی کتاب میں بار پاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہر منتخب لسانی متن اور پر مذکورہ عوامل پر خصوصی توجہ کے بعد ہی درسی کتاب کے مسودے کا حصہ بنتا ہے۔ گویا نظم ونثر وغیرہ کے ہر سبق کی تیاری میں مرتبین کے گھٹنے چھلا کرتے ہیں۔

ابتدائی درجات میں چونکہ زبان کی تدریس بنیادی اہمیت رکھتی ہے اس لیے ان درجات کی درسی کتابوں کی تیاری میں زبان سکھانے کے بہت سے نئے پرانے اصولوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر نصاب میں ماہرین کی وضاحت بھی موجود ہوتی ہے کہ زبان کے کون کون سے تقاضے پورے کیے جائیں اور کیسے؟ نصابی اساس پر تشکیل دیے گئے لسانی متن کی تعلیمی اقدار کی تعین اور قدر پیمائی کن اصولوں کے مدنظر کی جائے؟ وغیرہ۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فنکار کی لکھی ہوئی بچوں کے لیے نظم یا کہانی درسی کتاب سے باہر بچوں کے ادب میں ضرور شمار کی جاسکتی ہے مگر درسی کتاب میں آنے کے بعد وہ درسی ادب کا مظہر بن جاتی ہے یعنی وہ اپنی عام صنفی اور خارجی ہیئت میں تو نظم یا کہانی ہوتی ہے مگر مخصوص تکنیکی اور داخلی ہیئت میں اسے ایک درسی لسانی متن سمجھنا اور کہنا بیجا نہیں۔

زبان کی تدریس میں بچوں کا ادب کس درجے سے کس درجے تک ساتھ دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں کم از کم ابتدائی درجات کی درسی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔ پہلے درجے میں تو سب جانتے ہیں کہ بچے حروف تہجی سیکھنے کے بعد حروف صحیح اور حروف علت کے مختلف جوڑوں اور ان کی آوازوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، مثال کے طور پر حروف: کا، کے، کی، کو، میں الف، یے اور واو کے جوڑ۔ اسی طرح مکسور یعنی زیر والی آوازوں کی مختلف شکلیں: مِل، میل، میل۔ مَیل اور مضموم یعنی پیش والی آوازیں جیسے مُل، مُول، مول۔ اس مرحلے میں 'ادب' سے بچوں کا واسطہ نہیں آتا مگر جب زبان کی ساخت میں شامل دیگر متعدد آوازوں اور ان کے تلفظات کی شناخت کرائی جاتی ہے تو چند جملوں سے متعدد جملوں کی عبارتوں تک کے لسانی متن کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا متن پہلے درجے کی تعلیم کے اواخر میں کم و بیش صفحہ بھر جملوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس صورت میں نصاب میں توقع کی جاتی ہے کہ متن کی زبان بچوں کی ذہنی صلاحیت کے مطابق نہ صرف آسان ہو بلکہ اس میں استعمال کردہ لسانی آوازیں خوشگوار اور مترنم بھی ہوں تاکہ بچے اس متن کو سنتے سمجھتے اور پڑھتے ہوئے لطف وانبساط حاصل کرسکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے درسی متن میں چھوٹی چھوٹی نظمیں (بامعنی یا بے معنی)، کہانیاں اور پہیلیاں وغیرہ شامل کی جاتی ہیں مثلاً اسی برس جاری کردہ پہلی جماعت کی 'اردو بال بھارتی' سے ماخوذ ایک لسانی تدریسی متن یہ ہے:

''شاداں اپنی ماں کے ساتھ نانی کے گاؤں گئی۔ نانی کا گاؤں چھوٹا سا ہے۔ شاداں کے ماموں بھی وہیں رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے سامنے ایک بڑا آنگن ہے۔ آنگن میں چاروں طرف گملے ہیں۔ گملوں میں پھولوں کے پودے ہیں۔ آنگن کے بیچوں بیچ ایک کنواں ہے۔ کنویں میں مچھلیاں اور مینڈک ہیں۔ ایک طرف املی کا پیڑ ہے۔ اس کی گھنی چھاؤں میں بچے کھیلتے ہیں۔ پیڑ پر پرندوں کے گھونسلے ہیں۔ شاداں کے ماموں کے پاس بہت سی مرغیاں ہیں۔ ایک مرغا بھی ہے۔ مرغا صبح سویرے بانگ دیتا ہے۔ سب جاگ اٹھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ شاداں گرمیوں میں نانی کے گھر رہنا پسند کرتی ہے۔''

یہاں نون غنے کی تدریس کے لیے درج بالا عبارت کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لسانی تعملات کے پیش نظر اس کا متن ایک دیہاتی ماحول اور کچھ سماجی رشتوں کی پہچان ایسے لفظوں میں کراتا ہے جن میں اکثر الف، واو اور یے مصوتوں کے ساتھ نون غنہ کا استعمال کیا گیا ملتا ہے (شاداں، ماں کنواں/ گاؤں، چھاؤں/ ماؤں/آنگن، مینڈک، بانگ، گھونسلے/ چاروں، گملوں، پھولوں ، بیچوں (بیچ)، کاموں، گرمیوں/ مچھلیاں، مرغیاں/ کنویں/ ہیں) زبان کی تدریس کے لیے بظاہر یہ ایک غیرادبی متن ہے اور ادبی متون میں بھی ایسے متن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں وغیرہ لکھتے ہوئے شاعر یا مصنف زبان کے ایسے استعمال کی طرف کیوں توجہ دے؟ جب کہ یہ تخلیق کا تقاضا بھی نہ ہو۔ یہ متن غیرادبی اس لیے ہے کہ یہ جذبہ واحساس کے اظہار سے عاری ہے اور لطف ومسرت کی ترسیل نہیں کرتا جو درسی اور غیر درسی دونوں قسم کی کتابوں میں ادب کا بنیادی مقصد ہے۔

ابتدا میں جو یہ کہا گیا کہ بچوں کے ادب کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک درسی کتاب کے باہر اور دوسرا درسی کتاب والا۔ اس کی مثال میں بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے مجموعے 'میرے گلشن کے پھول' کی ایک نظم بعنوان 'اے رب! تو مہرباں ہے' ملاحظہ کیجیے:

اے رب تو مہرباں ہے
تو ہی سبھی کا آقا
تیرا ہی سب جہاں ہے
تیرا ہی سب جہاں ہے
اے رب! تو مہرباں ہے
تونے جہاں بنایا
ہر چیز کو جہاں کی
تو ہی نے ہے سجایا
تو خالق جہاں ہے
اے رب! تو مہرباں ہے
بھاری جہاز کیسے
پانی پہ تیرتے ہیں
تو ہی انھیں ترائے
خود ان میں دم کہاں ہے

اے رب! تو مہرباں ہے
پیدا ہمیں کیا ہے
اور سیدھا راستہ بھی
اپنا بتا دیا ہے
تو محسنِ جہاں ہے
اے رب! تو مہرباں ہے
ہاتھی ہو یا کہ چیونٹی
انسان ہو کہ حیواں
دیتا ہے سب کو روزی
تو رازقِ جہاں ہے
اے رب! تو مہرباں ہے

پانچ بندوں کی یہ نظم جو صنفی لحاظ سے دراصل ایک حمد ہے، اردو بال بھارتی (جماعت دوم) کے لیے منتخب کی گئی لیکن کتاب میں اسے شاعر کے بنائے گئے متن کے مطابق نہیں شامل کیا گیا ہے۔ بچوں کے حافظے کی صلاحیتوں کے پیش نظر پہلے تو اس کے دو بند کم کردیے گئے (ایسا کرنے کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں) بقیہ تین بندو ں میں 'اے رب' کا خطاب اپنے مجموعی تلفظ یعنی صوتی خصوصیت میں کچھ الگ اور غیرروایتی سا ہے اس لیے اسے عام طور پر استعمال کیے جانے والے خطاب 'یارب' سے بدل دیا گیا ہے۔ دوسری جماعت کے بچوں کی تفہیمی صلاحیت سے اونچا ہونے کی وجہ سے لفظ 'آقا' کو 'مالک' کردیا گیا ہے اور دوسرے بند کے تیسرے مصرع 'تو ہی نے ہے سجایا' کی جگہ (شاعر کی اجازت سے) 'کیا خوب ہے سجایا' لکھا گیا ہے۔ نظم میں 'خالق جہاں' اور 'رازق جہاں' کی ترکیبیں آئی ہیں جو سات برس کے کسی بچے کی سمجھ میں نہیں آنے والی ہیں اس لیے سبق کی تفہیمی اکائی کے طور پر نظم کے آخر میں ان کی معنوی وضاحت کردی گئی ہے۔

بچوں کی نظم میں تدریسی مقصد کے لیے تبدیلیوں کی یہ مثال کافی ہے۔ دو ڈھائی صفحوں کے نثری مواد میں اکثر خوب کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، تب وہ باہر کے ادب سے اندر کا ادب بنتا ہے۔ ایسی مثال یہاں طوالت کا باعث ہوگی (مذکورہ حمد میں تبدیلیوں کی یہ نشان دہی 'بال بھارتی پونے کے موجودہ اردو آفیسر کی اجازت سے کی گئی ہے)

ہمارے کلاسک شاعروں اور نثر نگاروں نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا ہے، وہ بچوں کی تدریس وتادیب کے مقصد کے پیش نظر لکھا ہے اس لیے اس میں بچوں کے عصری ادب کی سی لسانی افراط وتفریط، بے اعتدالی اور عجز بیانی کے عیوب نہیں پائے جاتے۔ آج بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں تخلیق کرنے والوں کی کمی نہیں مگر ان کی تخلیقات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہمارے اکثر فنکار بڑی عجلت میں ہیں۔ وہ دس بیس چیزیں لکھ کر چاہتے ہیں کہ نہ صرف ہماری کتاب شائع ہوجائے بلکہ ہماری نظمیں اور کہانیاں درسی کتابوں میں بھی شامل کرلی جائیں۔ اس تعلق سے انھیں خود سے چند سوالات کرنے چاہئیں اور وہ یہ کہ:

(1) میری نظم: کہانی کی زبان کیا کلاسک درسی متن کی زبان کی طرح صحیح اور معیاری ہے؟

(2) میری نظم: کہانی میں کوئی فنی تکنیکی غلطی تو نہیں پائی جاتی؟

(3) میری نظم: کہانی میں کتنی اردو اور کتنی ہندی انگریزی شامل ہے؟

(4) میری نظم: کہانی کی (اردو) زبان کیا علاقائی/ملکی معیار پر پوری اترتی ہے!

(5) میری نظم: کہانی کیا قواعد زبان کے کسی اصول پر کچھ اصولوں کا احاطہ کرتی ہے؟

(6) میری نظم: کہانی کو (ابتدائی درجات کے) بچے کس

حد تک سمجھ سکتے ہیں؟

(7) میری نظم: کہانی کیا نصاب کے ایک تقاضے/ چند تقاضوں کو پورا کرتی ہے؟

اب تک کی گفتگو سے واضح ہوگیا ہوگا کہ آج کل تدریس کے لیے لسانی متن راست نہیں لکھا جاتا۔ درسیات سے باہر تخلیق کیے گئے بچوں کے ادب ہی سے درسی کتاب بنانے والے اپنے مطلب کی چیزیں اخذ کرتے اور انھیں مزید اپنے مطلب کی یعنی نصابی تدریسی مقصد کے حصول کے لائق بناتے ہیں۔

ابتدائی لسانی تدریس کے مدارج میں پہلی سے آٹھویں جماعتوں تک کے لیے ادبی/لسانی متن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے یہ درجات بلند ہوتے ہیں، بچوں کے لیے تدریسی مواد کی کیفیت وکمیت بدلتی اور بڑھتی جاتی ہے۔ پانچویں چھٹے درجے پر بچوں کو پڑھایا جانے والا لسانی متن اپنی ادبی خصوصیت میں چند اصناف اور لسانی تعلیم میں قواعد زبان کے مختلف اصول وغیرہ کا احاطہ کرنے لگتا ہے۔ ہم جانتے ہیں، بلکہ بچوں کے ادیب وشاعر بھی جانتے ہیں کہ کہانی یا نظم لکھتے وقت وہ اپنی تخلیق کی تدریسی اہمیت صرف اخلاقی سبق دینے تک محدود سمجھتے ہیں۔ درسی کتاب اخلاق وتادیب کا وسیلہ بھی ضرور ہے مگر زبان کی تدریس کے زاویے سے صرف اخلاقی سبق تو کافی نہیں ہوتا۔ مدرسین کو درسی نصاب اور درسی کتاب کے ذریعے خبر دی جاتی ہے کہ کتاب میں مہیا کیے گئے متون کی مدد سے لسانی تکنیکی علم بھی درجہ بہ درجہ بچوں کی تدریس میں شامل کریں مثلاً دوسری ہی جماعت میں قواعدی تعریف اور خواص بیان کیے بغیر چند سابقے اور لاحقے وغیرہ بھی انھیں پڑھانے پڑتے ہیں۔ بچوں کو یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ یہ سابقے اور لاحقے ہیں۔ ہاں، ان تکنیکی اصطلاحوں کو اونچی جماعتوں میں سابقوں اور لاحقوں کی طرح متعارف کرانا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اب زبان کی تدریس کے وقت یہ نصاب کا تقاضا ہے۔

بچوں کے لیے شائع کی گئی بہت سی ادبی کتابوں میں شاعر یا کہانی کار یا ان کا کوئی مداح کتاب کے پیش لفظ وغیرہ جیسی تحریروں میں یہ دعوا تو ضرور کرتا ہے کہ میں نے یا مصنف نے اپنی نظموں/کہانیوں وغیرہ میں بچوں کی عمر، ان کی نفسیات، ان کے ماحول اور زمانے کے بہت سے (سائنسی/ماحولیاتی/ سماجی وغیرہ) تقاضوں کا خیال رکھا ہے مگر اکثر سے بھی زیادہ کتابوں میں یہ باتیں ہوائی باتوں کی طرح نظر آتی ہیں اور یہ اس لیے کہ آج کل تنقید/تبصرہ/ پیش لفظ وغیرہ جیسی چیزیں محدود خیالات اور محدود لفظیات کا شکار ہوگئی ہیں۔ ہر لکھنے والا چند باتوں کو دہرا دیتا ہے، اس بات کا خیال کیے بغیر کہ میری باتیں مصنف کے کیے کرائے پر صحیح معنوں میں منطبق بھی ہورہی ہیں کہ نہیں۔ اس صورت میں درسی کتاب تیار کرنے والوں کو جو بہت سے غیرلسانی اور غیرادبی تقاضوں سے بندھے ہوئے ہیں، بچوں کے ہر نئے پرانے شاعر/ ادیب کی کتابوں کو ورق بہ ورق اور بار بار پڑھنا پڑتا ہے:

یہ گویا روشنی حاصل کرنے کے لیے
اندھیری رات میں
کہیں دور جلتے چراغ کی طرف
سفر کرنے کے مترادف ہے

■

Saleem Shehzad, 323 Mangalwar Ward, Malegaon - 423203 (MS)

محمد نعمان خاں

مولانا محمد حسین آزاد کی تعلیمی اور تدریسی خدمات

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے اہم شاعر، انشاپرداز، خط نگار، تذکرہ نویس، مترجم، محقق اور جدید اردو شاعری کے بانی کی حیثیت سے ہوتا ہے لیکن وہ ایک کامیاب استاد اور ماہر درسیات و تعلیمات بھی تھے، اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔

محمد حسین آزاد نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں استاد کی حیثیت سے اور محکمۂ سررشتۂ تعلیمات، لاہور سے وابستہ ہوکر کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتب 'آبِ حیات'، 'سخندانِ پارس' اور 'نیرنگِ خیال' 1883 میں پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی نصاب میں شامل تھیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر کردہ دیگر کتب 'نصیحت کا کرن پھول'، 'آئینۂ صحت'، 'آموزگارِ پارسی'، 'حکایاتِ آزاد'، 'شہزادہ ابراہیم کی کہانی' اور 'لغتِ آزاد' کو بھی درسی کتب میں شامل کیا ہے۔ لیکن مولانا محمد حسین آزاد کا سب سے اہم کارنامہ وہ درسی کتب ہیں جو انھوں نے ابتدائی درجات کے طلبا کے لیے تصنیف و ترتیب دی تھیں۔ آغا محمد باقر کے پاس محفوظ محکمۂ تعلیمات پنجاب کی دستاویز کے مطابق مولانا محمد حسین آزاد نے ابتدائی درجات کے لیے درج ذیل نو درسی کتب تالیف کی تھیں:

(1) اردو کی پہلی کتاب
(2) اردو کی دوسری کتاب
(3) فارسی کی پہلی کتاب
(4) فارسی کی دوسری کتاب
(5) اردو کی تیسری کتاب
(6) اردو کی چوتھی کتاب
(7) قصصِ ہند حصۂ دوم
(8) Translation of the Arabic Entrance Course
(9) جامع القواعد

نئی طرز اور نئے اندازِ فکر پر لکھی جانے والی، اپنی نوعیت کی منفرد یہ درسی کتب تعلیمی حلقوں میں نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ بڑی تعداد میں ان کے کئی کئی اڈیشن بھی شائع ہوتے رہے۔ ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز افسروں اور ماہرینِ تعلیم نے بھی انھیں نہ صرف بہ نظرِ استحسان دیکھا بلکہ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا۔ مذکورہ بالا درسی کتب انگریز افسروں کے امتحانات کے لیے بھی استعمال ہوئیں اور محکمۂ تعلیمات کے اسکولوں کے نصاب میں شامل کی گئیں۔

مذکورہ بالا درسی کتب میں شامل تمام متن فرد واحد یعنی مولانا محمد حسین آزاد کی علمی، فکری اور قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے سامنے نہ تو درسی کتب کا کوئی نمونہ تھا اور نہ ہی کوئی رہنما اصول۔ وہ صاحبِ طرز انشاپرداز تھے لیکن مذکورہ بالا درسی کتب میں انھوں نے نہ صرف سادہ، سلیس، دلچسپ، اور عام فہم اسلوب اختیار کیا بلکہ بچوں کی ذہنی سطح، معیار، پسند، دلچسپی، نفسیات اور عصری تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ وہ اس رمز سے بخوبی واقف تھے کہ بچوں کی کتابیں لکھتے وقت مصنف کو بھی بچہ بننا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اہم ذمے داری تھی جسے مولانا محمد حسین آزاد نے بڑی محنت اور ریاضت سے کام لے کر کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے خود اس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا، بڈھا ہوکر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے، چلتے، جاگتے، سوتے بچوں کے ہی خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔''

مولانا محمد حسین آزاد نے خود بچہ بننے اور بچوں کی کتابوں کو کھلونے سے موسوم کرکے یہ ثابت کردیا کہ ان کے ذریعے تیار کردہ درسی کتب نہ صرف دلچسپ اور پرلطف ہیں بلکہ شگفتہ اور مفید بھی ہیں۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے مزید لکھا ہے:

''... مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے... جی چاہتا ہے ایسا انتخاب ہو کہ طلبا کے لیے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اس کا ہر شخص کے لیے باعثِ شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے۔'' (مکتوبات آزاد، ص 190)

اردو کی یہ پہلی درسی کتب ہیں جن میں موضوع کی مناسبت سے تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ آسان اور دلچسپ اسلوب اور مناسب تصاویر کے علاوہ جو دیگر امور ان درسی کتب کو بہتر، مفید اور منفرد بناتی ہیں ان میں اِردگرد کے ماحول اور مانوس حالات نیز قدرتی مناظر کی ترجمانی، روزمرہ پیش آنے والے معاملات و مسائل، نباتات و حیوانات کا ذکر، حفظانِ صحت، کھیل کود، جسمانی نشو و نما سے متعلق موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی، اخلاقی اقدار مثلاً: خدا پر ایمان، ماں، باپ، عزیز رشتے

داروں سے محبت، دوستوں سے رفاقت، مذہب و ثقافت سے لگاؤ، فرائض کا احساس، ماحولیات کے تئیں بیداری اور حب الوطنی کے جذبے اور نیکی کی تلقین وغیرہ کو متن میں اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ نہ تو وعظ و نصیحت کا عنصر پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی آورد کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں گفتگو کے انداز میں پیش کی گئی ہیں اس لیے پڑھنے والے کو متاثر بھی کرتی ہیں اور موضوع کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی تیار کردہ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتاب میں شامل اسباق کے درج ذیل چند عنوانات سے ہی مذکورہ بالا خصوصیات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ مثلاً: اردو کی پہلی کتاب کی فہرست میں شامل عنوانات: 'خدا کی شکرگزاری'، 'ماں کی محبت'، 'لڑکا مدرسے جاتا ہے'، 'لڑکے کھیل رہے ہیں'، 'یکے کی سواری'، 'صبح کی ہوا خوری'، 'سورج کے فائدے'، 'جھوٹ کی برائی'، 'ہمدردی' وغیرہ۔

فہرست مضامین اردو کی دوسری کتاب:

'جانوروں کا بیان'، 'وقت اور موسموں کا بیان'، 'درختوں کا بیان' اور نظمیں: 'بڈھا باپ'، 'صفائی' اور 'گالیوں کی برائی'۔

فہرست مضامین، اردو کی تیسری کتاب: 'دودھ پلانے والے جانوروں کا بیان'، 'پرندوں کا بیان'، 'درختوں کا بیان'، وغیرہ کے علاوہ اردو کی تیسری کتاب میں تاریخی حالات کے ذیلی عنوان کے تحت پانچ اسباق: 'امیر ناصرالدین سبکتگین'، 'سلطان محمود غزنوی'، 'ظہیرالدین بابر بادشاہ'، 'اتا کی جاں نثاری' اور 'پرتاپ کی بہادری' شامل ہیں جن کے مطالعے سے طلبا میں تاریخی شعور اور جینے کا حوصلہ اور سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اردو کی چوتھی کتاب میں شامل مضامین:

'کیڑوں کا بیان'، 'پرندوں کا بیان'، 'جانوروں کا بیان'، 'پھولوں کا بیان'!

مولانا محمد حسین آزاد نے ان درسی کتب میں محض موضوعات کے انتخاب اور دلچسپ اور آسان اسلوب پر ہی توجہ صرف نہیں کی ہے بلکہ آموزگاروں کی آسانی کے پیش نظر اعراب کا استعمال کر کے عبارت کا ایک ایک لفظ الگ الگ، واضح طور پر اس طرح لکھا ہے کہ نوآموز طلبا کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت محسوس نہ ہو سکے۔ مثلاً نون غنہ جو لفظ کے درمیان ہے اس پر الٹا جزم لگایا ہے اور اگر آخر میں آیا ہے تو اس پر نقطہ نہیں دیا گیا ہے جو 'و' بولی نہیں جاتی مثلاً: 'خود'، 'خواہش'، 'خوش' وغیرہ کے نیچے آڑی لکیر دی گئی ہے۔

حرفِ مفتوح پر وہیں زیر لگایا گیا ہے جہاں 'واؤ' یا 'یے' کے معروف اور مجہول ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

حرف مضموم کے بعد اگر واؤ مجہول نہیں ہے تو اس پر پیش لگایا گیا ہے، مثلاً 'شُکر'، 'واؤ معروف' کے ماقبل پیش لکھا گیا ہے۔ مثلاً 'دور'، 'واؤ مجہول' کے ماقبل پیش نہیں لکھا گیا ہے۔ مثلاً: مول- الف، واؤ اور یے کے سوا لفظ کے درمیان جو حرف ساکن ہے اس پر جزم لکھا گیا ہے، جیسے: صَبر

عبارت کی صحیح قرأت اور تفہیم کے لیے حسب ضرورت رموز و اوقاف اور علامات کا استعمال کیا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں گفتگو کے انداز میں بات کہی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سبق: 'راجا صاحب کا ہاتھی' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ذرا سُننا! گھنٹیوں کی آواز آتی ہے۔ شاید کوئی ہاتھی آرہا ہے۔ چلو، تماشہ دیکھیں۔ اے لو! وہ آیا۔ کیا جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ اوھو! کتنا بڑا ہاتھی ہے! کیا لمبے لمبے دانت ہیں اور ان پر سنہری چوڑیاں کیا بہار دیتی ہیں۔ مستک پر کلغی لگی ہے۔ گلے میں چاندی کی ہیکل پڑی ہے۔ دونوں طرف گھنٹے لٹک رہے ہیں، انھیں سے ٹن ٹن کی آواز نکلتی تھی۔ واہ! کیا جھم جھماتی جھول ہے! سنہری کام دھوپ میں کیا جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ اوپر چاندی کا ہودہ کسا ہوا ہے۔ راجہ صاحب اسی میں بیٹھتے ہیں۔ یہ تو بڑا اونچا ہے، کیوں کر چڑھتے ہوں گے؟ پہلو میں سیڑھی لٹکتی رہتی ہے۔ مہارت ہاتھی کو بٹھا دیتا ہے۔ چرکٹا سیڑھی لگا دیتا ہے۔ راجہ صاحب اس پر سے چڑھ جاتے ہیں۔ ہاتھی اپنے مہاوت کا کہنا بہت مانتا ہے۔ اشارے پر کام کرتا ہے..... جب وہ کہتا ہے تو سونڈ ماتھے پر رکھ کر راجہ صاحب کو سلام بھی کرتا ہے۔

(بحوالہ: 'اردو کی پہلی کتاب' ص 65-66)

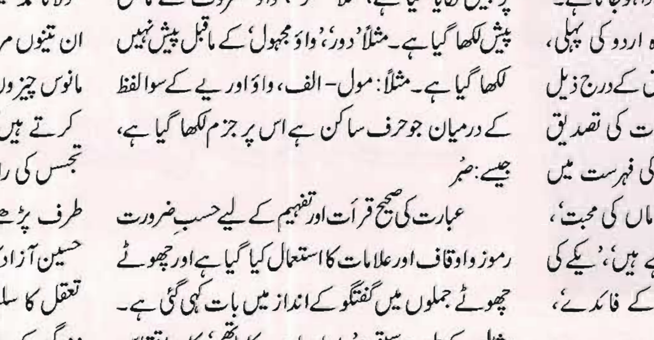

مذکورہ بالا درسی کتب سے متعلق محمد حسین آزاد نے اپنے وضاحتی نوٹ میں تین نکات کی نشاندہی کی ہے:

I تخئیل II تعقل III تجربہ

مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ طلبا کی ذہنی پختگی کے لیے مذکورہ بالا تینوں نکات نہایت ضروری ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان درسی کتب کو تیار کرتے وقت ان تینوں مراحل کا خاص خیال رکھا ہے۔ وہ روزمرہ کی مانوس چیزوں سے خیال آفرینی کا سلسلہ اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں غور و فکر نیز تجسس کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں تا کہ نئی نئی باتوں کی طرف پڑھنے والے کا تخیل بیدار ہو جائے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ ایسا ہونے پر دوسری منزل یعنی تعقل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر طلبا کو زندگی کے نئے تجربوں سے ہمکنار ہونے کا موقع ملتا ہے۔

ان درسی کتب میں کئی باتیں مثلاً دلچسپ اسلوب، پرلطف آموزش، مانوس فضا، ماحولیات، تعمیریت، متن اساس تصاویر، اخلاقی اقدار اور شمولیتی تعلیم وغیرہ ایسی ہیں جو عصر حاضر کی قومی تعلیمی پالیسی اور این سی ای آر ٹی کے 'قومی درسیات کا خاکہ 2005' کی سفارشات پر پورا اترتی ہیں لیکن سبھی درسی کتابوں میں اسباق کے متن کے بعد مشقوں کی عدم شمولیت ایک بڑی اہم کمی کا احساس دلاتی ہے۔ عملی قواعد اور عملی مشقوں کی کمی ان درسی کتابوں کا ایک بڑا کمزور پہلو ہے لیکن باقی تمام باتیں قابلِ تعریف ہیں۔ ظاہری حسن، گیٹ اَپ اور طباعت کے معیار کے اعتبار سے بھی یہ کتابیں دیدہ زیب ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد باقاعدہ طور پر ماہر تعلیم نہیں تھے اور درسی کتب کی تیاری سے متعلق کوئی رہنما اصول یا نمونہ بھی ان کے سامنے نہیں تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے درسی کتب کی تیاری میں ایک خاص مقصد اور نصب العین کے تحت جو اہم خدمات انجام دی ہیں وہ بعد کے ماہرینِ درسیات کے لیے ماڈل کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے مولانا محمد حسین آزاد کو اردو کا باقاعدہ پہلا ماہرِ درسیات و تعلیمات تسلیم کرنا غلط نہ ہوگا۔

□

Prof. Mohd Noman Kkhan, NCERT,
New Delhi - 110016

قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر اساتذہ کا تربیتی ورکشاپ

شاہد اختر انصاری

تربیتی ورکشاپ کے افتتاحی پروگرام میں دائیں سے ممتاز پیر بھائی، دیپک واسن، عابدہ انعام دار، منور پیر بھائی اور فیروز عالم

ریاست مہاراشٹر کا تہذیبی اور تاریخی شہر پونہ خوبصورت پہاڑوں اور جھومتے آبشاروں کے آغوش میں آباد ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صحت بخش اور دلکش ہے جہاں صدیوں پرانی تہذیب آج بھی جلوہ گر ہے۔ اس شہر کو خوشبوؤں کے شہر کے علاوہ عروسِ دکن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں یہ شہر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے پوری دنیا میں توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پونہ شہر کی اپنی بے شمار خصوصیات ہیں۔ ان میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں عصری اور دینی علوم کے علاوہ تکنیکی تربیتی درس گاہوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے یہاں سے فارغ طلبا و طالبات ملک کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ اپنے مستقبل کو تابناک بنانے میں مصروف ہیں۔ اردو میڈیم سے فارغین تعلیم کے دیگر شعبوں، خصوصاً انجینئرنگ میڈیکل اور مینجمنٹ میں بہتر کارکردگی پیش کر رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس کے فروغ کے لیے سنجیدہ کوشش کرنے والے ادارے کے طور پر اعظم کیمپس پونہ اپنی فعال کارکردگی کی بدولت قومی سطح پر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

اسی دیار میں 29 تا 30 جنوری 2014 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اور دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے دو روزہ تربیتی پروگرام برائے کمپیوٹر فیکلٹی، کمپیوٹر اپلی کیشنز، بزنس اکاونٹنگ و ملٹی لنگول ڈی ٹی پی سینٹرز کا انعقاد ہائی ٹیک ہال، اعظم کیمپس میں کیا گیا۔ اس تربیتی پروگرام میں خصوصی طور پر جنوبی زون کی ریاستیں آندھرا پردیش، چھتیس گڑھ، گجرات، کرناٹکا، کیرالہ، تامل ناڈو اور مہاراشٹر کے 45 مراکز کے اساتذہ نے حصہ لیا۔ واضح رہے کہ قومی اردو کونسل حکومت ہند کے وزارت برائے انسانی ترقی وسائل کا ایک خودمختار اور فعال ادارہ ہے، جو اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ہمہ جہت ترقی کے لیے ملکی سطح پر بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے نے اب تک جو کارکردگی پیش کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ دیگر سرکاروں اداروں میں یہ ادارہ اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ کونسل نے کئی سطحوں پر مختلف منصوبے اور اسکیمیں چلا رکھی ہیں جن میں خصوصی طور پر CABA-MDT P اسکیم منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ موجودہ اعداد و شمار کے مطابق 26 ریاستوں کے 203 اضلاع میں 467 سینٹرز کام کر رہے ہیں۔ اس اسکیم کو زیادہ فعال اور متحرک بنانے کی غرض سے گزشتہ سال دو روزہ تعارفی پروگرام لکھنؤ میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس پروگرام میں دور حاضر میں روز بروز ٹکنالوجی میں بدلتے رجحانات کو دیکھتے ہوئے کمپیوٹر فیکلٹیز کو موجودہ نصاب کے مطابق بچوں کو تعلیم و تربیت دینے کی نشان دہی کی گئی تھی۔ جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ انھی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے زونل تربیتی پروگرام کرانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس دو روزہ فیکلٹی ورکشاپ کے افتتاحی پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب منور پیر بھائی حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کے چیرمین شامل ہوئے۔ جبکہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے محترمہ عابدہ انعامدار صاحبہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ جناب دیپک واسن، محترمہ ممتاز پیر بھائی صاحبہ موجود تھے۔ اس موقعے پر عابدہ انعامدار صاحبہ نے اپنے افتتاحی کلمات میں دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ اور اعظم کیمپس کی جانب سے تمام مہمانوں اور مختلف ریاستوں سے آئے فیکلٹیز کا والہانہ خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اعظم کیمپس کے ساتھ ساتھ قومی اردو کونسل کا جامع تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا ٹکنالوجی کے اس عہد میں کمپیوٹر انفارمیشن کا کلیدی رول ہے لہٰذا ہمیں اپنے بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ کام نیک نیتی اور جذبے سے کیا جانا چاہیے۔ ہماری تعلیم کا معیار ایسا ہو جس سے ہمارے بچے ASSESTS ہوں نہ کے LIABLITIES بنیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں منور پیر بھائی نے کہا کہ آج کا عہد کمپیوٹر کا عہد ہے، زندگی کے ہر محاذ پر کمپیوٹر کی اہمیت بڑھ گئی ہے اس لیے طلبہ کو مواصلاتی اور اطلاعاتی پروگرام

منور بھائی ورکشاپ میں اظہار خیال کرتے ہوئے

محترمہ عابدہ انعامدار صاحبہ خطاب کرتے ہوئے

سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات قابل تحسین ہیں، اس کے سربراہ خواجہ صاحب جدید ٹکنالوجی سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس تعلق سے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر اب حقیقت میں تبدیل ہورہی ہے۔

جناب دیپک واسن پرنسپل سسٹم انالیسس نے فیکلٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنے طلبہ کو ایمانداری اور نیک جذبے کے ساتھ تعلیم دینا ضروری ہے۔ آج کے مطالبے کو دھیان میں رکھ کر ہمیں ایسے نصاب ترتیب دینے کی ضرورت ہے جس سے انڈسٹری اور ہمارے نصاب کے درمیان خلا نہ رہ جائے بلکہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریڈیفائن کی جاسکے۔ اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم نے فیکلٹیز سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں چاق و چوبند رہنا چاہیے اور تقاضائے وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موجودہ ٹکنالوجی سے بچوں کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ بچے اپنے مستقبل کو تابناک بناسکیں۔ پروگرام میں شریک تمام فیکلٹیز کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس جانفشانی اور جذبے کا مظاہرہ کررہے ہیں، یقیناً قابل ستائش پہلو ہے اس جذبے کو مزید تقویت دینے کی ضرورت ہے۔

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کو کلیدی خطبہ پیش کرنا تھا، کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے پروگرام میں شامل نہیں ہوسکے۔ تاہم انھوں نے اپنا تحریری پیغام ارسال کیا۔ موصوف نے سب سے پہلے دور دراز سے آئے تمام فیکلٹیز کے ساتھ اعظم کیمپس کے روحِ رواں جناب پی اے انعام دار اور دیگر شرکا کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور اپنے پیغام میں کہا کہ تعلیم ہر زمانے کی اہم ضرورت ہے۔ تعلیم ہی وہ واحد طریقہ کار ہے جس کی بنیاد پر کسی بھی قوم کے مستقبل کو تابناک بناسکتا ہے۔ یہی وہ واحد ستون ہے جس کی مدد سے سماجی اور معاشی ترقی کو یقینی اور مستحکم بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے موجودہ عہد کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے تعبیر کیا اور کہا کہ اِس دور میں نت نئی تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ لہٰذا جو انسان تبدیلی کو ہی نہ سمجھ سکے، وہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر کیسے چل سکتا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے انتہائی خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے کہ موجودہ مرکزی حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔ اِس سمت میں جناب کپل سبل اور ڈاکٹر ایم ایم پلم راجو کی خدمات کا ہمیں اعتراف کرنا چاہیے جنھوں نے اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی اَنتھک کوششیں کی ہیں۔ اِس بدلتی اور مسابقتی دنیا میں اعلیٰ تعلیم اور ٹیکنالوجی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اِس وقت ہمیں جن چیلنجوں کا سامنا ہے کونسل اس سے نبرد آزما ہونے کی ہر ممکن کوشش کررہی ہے۔

اِس دو روزہ تربیتی ورکشاپ میں آئے تمام اساتذہ سے میری گزارش ہے کہ آپ اپنے پروفیشن کو مشن کے طور پر لیں، آج کا بچہ کل کا ہونہار مستقبل ہے۔ بچوں میں بہت ساری صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں، کیونکہ بچے ہمہ جہت ذہانت کے مالک ہوتے ہیں۔ اسے نکھارنا اور سنوارنا آپ کا اہم فریضہ ہے۔

دوسرے دن کا تربیتی ورکشاپ جناب پی اے انعامدار کی صدارت میں اختتام پزیر ہوا۔ اس موقعے پر محترمہ عابدہ انعامدار نے اپنے اختتامی کلمات میں اس بات پر زور دیا کہ بچوں کو امتحانات کے لیے کمپیوٹر کی تعلیم تو ضروری ہے لیکن اس کا خیال رہے کہ صارفیت کے تقاضے کے مطابق ہمیں بچوں کو معلومات فراہم کرنی چاہیے تاکہ ان کی عملی زندگی بہتر ہوسکے۔ آج کے اختتامی پروگرام کے مہمان خصوصی جناب پی اے انعامدار کے عالمانہ اور بصیرت افروز کلمات سے تمام اساتذہ مستفیض ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ بدلتی دنیا کو اسیر کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہے، یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اپنے بچوں کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے روشناس کرائیں۔ اس تیز رفتار دنیا کا مقابلہ بلیک بورڈ اور چاک سے ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے جلسے میں

سرون سنگھ تربیتی ورکشاپ میں خطاب کرتے ہوئے

مختلف کمپیوٹر مراکز کے اساتذہ اور دیگر حاضرین

پی اے انعامدار ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے

تمام لوگوں سے گزارش کی کہ اگلا پانچ سالہ منصوبہ بلیک بورڈ چاک کی جگہ کمپیوٹر سے مزین کرنے کے لیے ہو۔ انھوں نے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج پوری دنیا کی حکمت انگلیوں کے ارد گرد گھومتی ہے جو کام گزشتہ پانچ ہزار سالوں میں ممکن نہیں ہو سکا اسے کمپیوٹر کے انقلاب نے کچھ ہی سالوں میں کر دکھایا۔ انھوں نے مایوسی اور احساس کمتری کو کفر سے تعبیر کیا اور کہا کہ غیر معمولی چیزوں کی تکمیل کے لیے غیر معمولی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

انھوں نے کونسل کی کارکردگی سے اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ کونسل ٹیکنالوجی کی نت نئی ایجادات سے تعلیمی عمل کو دلچسپ بنا کر اردو سماج کو فیض پہنچا رہی ہے۔ حکومت نے کونسل کے فنڈ میں اس لیے اضافہ کیا کہ اردو بھی ملک کے ایکسی لینٹ کے ساتھ وابستہ ہو سکے۔

اس تربیتی پروگرام میں خصوصی طور پر جنوبی ہند کی ریاستوں آندھرا پردیش، چھتیس گڑھ، گجرات، کرناٹکا، کیرالہ، تامل ناڈو و مہاراشٹر کے 45 سینٹرز کے اساتذہ کو چنڈی گڑھ NIELIT کے ماہرین کی مدد سے کمپیوٹر آئی ٹی ٹکنالوجی کی معلومات فراہم کی گئیں۔ تمام اساتذہ اس تربیتی پروگرام میں پورے انہماک کے ساتھ ماہرین کی باتوں سے مستفیض ہوئے۔ ماہرین میں جناب رویندر سنگھ اور جناب سرون سنگھ نے انفارمیشن ٹکنالوجی کی باریکیوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے چار نکات پر خصوصی طور پر روشنی ڈالی جن میں آئی ٹی ٹولز و بزنس سسٹم، انٹر نیٹ ٹکنالوجی اینڈ ویب ڈیزائنگ، سی پروگرامنگ لینگویجیز، آئی سی ٹی ریسورسیز وغیرہ پر زیادہ توجہ دی گئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری کوشش یہ ہے کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی سے متعلق نئی باتوں سے انھیں باخبر کریں اور اس بابت بنیادی باتوں کی جانکاری دیں، جس سے اساتذہ بچوں میں آئی ٹی کی تعلیم کا شوق اور جذبہ پیدا کرسکیں۔ بچے Motivate ہو کر آئی ٹی کو صرف Subject کے طور پر نہیں لیں بلکہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ اساتذہ اپنے بچوں کو درس و تدریس کے لیے جدید طریقہ کار کو اپنائیں جس سے نصاب کے اغراض و مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔ اس موقعے پر بہت ساری فیکلٹیز نے ماہرین سے مختلف نوع کے سوالات کر کے کمپیوٹر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تمام فیکلٹز نے تربیتی پروگرام کے انعقاد کو ضروری بتایا اور قومی اردو کونسل کے سربراہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین اور کونسل سے وابستہ اراکین کا شکریہ ادا کیا۔ تمام اساتذہ نے ماہرین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا اس دو روزہ ورکشاپ میں بہت سی نئی باتوں کی جانکاری ملی ہیں۔ ماہرین کے سمجھانے اور بتانے کے طریقہ کار سے سبھی مطمئن نظر آئے۔ پروگرام کے اختتام کے بعد تمام فیکلٹیز کو پونہ شہر کی سیر و تفریح کرائی۔ اس سلسلے میں جوئی تجاویز آئیں گی ان کی روشنی میں ہم بچوں کو بہتر معلومات فراہم کرسکیں گے۔ اس پروگرام میں کونسل کے ارکان نے دو روزہ ورکشاپ کو کامیاب بنانے میں بڑی مستعدی اور محنت کا ثبوت دیا جس کے پاس جو ذمے داریاں دی گئی تھیں سبھی نے نیک نیتی اور محنت سے اسے پورا کیا۔ ان میں جناب محمد احمد، جناب احمد خاں، جناب محمد قاسم، دیانند، منیت و جتیندر کے علاوہ میڈیا کوآرڈینٹر ڈاکٹر شاہد اختر بھی موجود تھے۔ اس پروگرام کی نظامت محترمہ ثنا پینی توڑ نے انجام دی۔ جناب انتخاب عالم نے اظہارِ تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام کے لیے اس سے اچھی جگہ اور نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے جناب پی اے انعامدار، محترم عابدہ انعامدار، جناب منور پیر بھائی اور بالخصوص آصف صاحب کی ہر محاذ پر بے پناہ معاونت اور رہنمائی کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے والہانہ لگاؤ اور ضیافت نے ہمیں آرام طلب بنا دیا تھا۔ اگر حالات سازگار رہے تو ڈائرکٹر صاحب سے التجا کروں گا کہ آئندہ اس سے بڑے پیمانے پر ورکشاپ کے انعقاد کے لیے پھر سے پونہ کا انتخاب کیا جائے۔ انھوں نے شمیم بھائی، سمیر بھائی، زبیر یا و سائمہ کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا۔

تربیتی ورکشاپ کے دوران کمپیوٹر اساتذہ، قومی اردو کونسل کے عہدے داران اور دیگر اہم شخصیات

ایم اے حق

افسانچوں کی عالمی گونج

یہ بات ثابت ہوتی جا رہی ہے کہ افسانچے آج وقت کی ضرورت بن چکے ہیں۔ اب لوگوں کا مختصر وقفے میں ادب کی چاشنی سے محظوظ ہونے کا رُجحان بڑی تیزی سے بڑھنے لگا ہے۔ دُنیا کے تقریباً ہر گوشے سے یہ نعرہ بُلند کیا جارہا ہے ''وقت کی پُکار... کہانی میں اختصار''

ایسی بات نہیں کہ افسانچے صرف ہندوستانی زبانوں میں حال کی پیداوار ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے دُنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس صنف میں طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ افسانچے کی شروعات سب سے پہلے کس زبان میں؟ کس نے؟ اور کب کی؟ یہ معاملہ تحقیق کا ہے۔ میں تو یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ صنف دن دونی رات چوگنی رفتار سے ترقی کرتی جارہی ہے اور اب اس کی گونج عالمی پیمانے پر سُنی جارہی ہے

آج سے لگ بھگ ہزاروں سال قبل 5 ویں صدی BCE کے دوران قدیم یونان کا ایک غلام ایسوپ جو اتّفاق سے مصنّف بھی تھا، نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں تحریر کی تھیں۔ یہی کہانیاں Fables of Aesop کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ یہ دراصل ایسے افسانچے و مختصر کہانیاں ہیں جس میں جا بہ جا اخلاقی درس نظر آتے ہیں۔ ایسوپ کی کہانیاں دُنیا کی قابلِ ذکر زبان میں آج بھی مقبول خواص وعام ہیں۔

ارنیسٹ ہیمنگوے (Ernest Hemingway) انگریزی ادب کے ایک معروف اور مقبول شخص ہیں۔ 1920 کے مشہور واقعہ کے مطابق ایک روز ایک ریسٹورنٹ میں اُن کے چند دوستوں نے اُن سے شرط لگائی کہ کیا وہ دس یا دس سے کم الفاظ میں کوئی کہانی فوراً لکھ سکتے ہیں۔ ہیمنگوے نے اس شرط کو چیلنج کے طور پر لے لیا اور وہاں رکھے نیپکن پر ایک چھ لفظی کہانی لکھ دی۔

"For sale: Baby shoe,never worn."

بس پھر کیا تھا ہیمنگوے تو ایک معتبر شخصیت کے مالک تھے ہی اُن کی تخلیق کو Flash Fiction کا نام دے دیا گیا اور اُس کے بعد سیکڑوں تصنیف کاروں نے اُن کی تقلید میں چھ لفظی کہانیوں کی جھڑی لگا دی جو آج تک جاری ہے۔ کچھ نمونے دیکھیے:

UNWANTED BOY GROWS INTO WANTED MAN.
NATE CHRISTEN

SHE LOVED CIGARETTES MORE THAN LIFE
MAXWELL

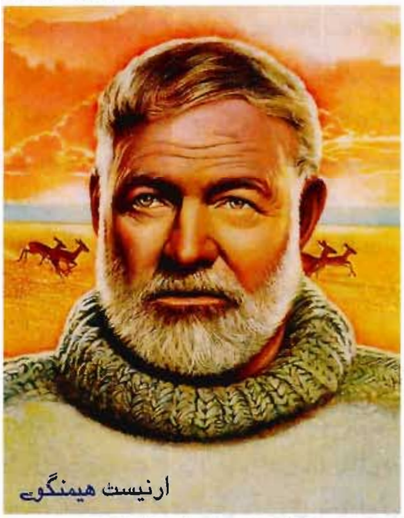

DRUNK, HOME LATE, LOCKED DOOR, DIVORCE
JO GUEEN

CANCER,ONLY THREE MONTHS LEFT, PREGNANT

چھ لفظی کہانیوں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے Two-sentence story کا چلن عام ہو گیا۔ انتہائی کم وقت میں ادبی ذائقے سے لطف کی وجہ سے یہ شاخ خوب پھلی پھولی۔ آپ کی دِلچسپی کے لیے دو کہانیاں پیش ہیں:

I ran after you,laught at your jokes,sat next to you in the class.Then you turned to me,said hello and all interest was lost.(Week Expectation, Author Melissa Davis)

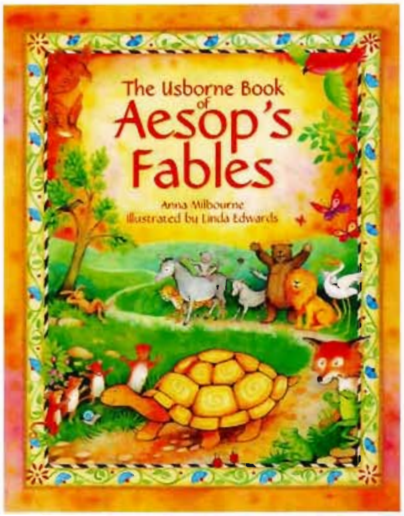

Diana looked up from her biology home work to stare at her mother.Tears welling up in her bright green eyes ," Your eyes are blue and Dad's are brown so who is the hell's my real father.(The Science Test.Author-Gary S.Watkins)

اتنا ہی نہیں انگریزی ادب میں افسانچے کی مختلف صورتوں پر کام ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں 25 or less word story بھی منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ بے شمار مصنّفوں نے اس جانب بھرپور توجہ دی ہے جس سے متاثر ہو کر 20 کتابوں کے خالق Robert Swartwood نے 188 صفحات پر مشتمل ایک کتاب Hint Fiction مرتب کی ہے جو 2010 میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے Joyce Carol Oates, Peter Straub, Ha Jin, James Frev جیسے نامی گرامی تخلیق کاروں کی چبھتی ہوئی کہانیوں کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ انگریزی مصنّفوں نے افسانچوں کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں برتا ہے۔ Swart Wood ایک جگہ نہایت بے باکانہ انداز میں فرماتے ہیں'' Hint Fiction کی ایک بڑی تعداد کو لمبی کہانیوں میں بڑھائی جا سکتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہنٹ فکشن اپنی جگہ پر پوری ہیں۔

یہی اس کی خوبصورتی اور چیلنج ہے۔"

Hint Fiction کی ایک کہانی Progress پیش خدمت ہے جس کے مصنف Joe Schreiber ہیں:

After seventeen days she finally broke down and called him "Dady".

تجرباتی دور سے گزرتے ہوئے وہاں کے مصنفوں نے ایک نئی راہ نکالی ہے جسے 55 Word Flash Fiction کا نام دیا گیا۔

حسب معمول انگریزی قارئین نے اسے بھی شرف قبولیت عطا کی ہے اور یہ اتنا پاپولر ہوا ہے کہ اس کی کہانیوں کے لیے خاص طور پر Extreme Writing Now.com نام کا ویب سائٹ کھولا گیا ہے اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس طرح لگا سکتے ہیں کہ اس کی مخفف شکل EWN بھی یکساں طور پر جانی پہچانی جاتی ہے۔

آپ کو یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوگی کہ وہاں پوسٹ کارڈ فکشن کا بھی رواج عام ہے۔ جسے Postcardshorts کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میرے خیال میں مجھے یہ بتانے کی ضرورت درپیش نہیں ہوگی کہ پوسٹ کارڈ فکشن کسے کہتے ہیں۔ وہاں کی ایک بہت بڑی آبادی اس صنف کی جانب بڑی تیزی سے بھاگ رہی ہے۔ نئے لکھنے والوں کے دلوں میں اس کی کشش روز بہ روز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کیوں کہ اس کے ایک ویب سائٹ www.postcardshorts.com پر نئے لکھاریوں کی ایسی کہانیاں لوگوں کی دلچسپی کی باعث بن رہی ہیں۔ اس کی شروعات 1970 میں ایک واقع سے ہوئی جب سائنس فکشن میگزین کے ایڈیٹر George نے انگلینڈ کے مشہور رائٹر Arthur C clark کو چیلنج کیا کہ وہ پوسٹ کارڈ پر کوئی کہانی لکھ کر دکھائے۔ نتیجے کے طور پر اُن کی کہانی Quarantine پہلی پوسٹ کارڈ فکشن کہلائی۔

Flash Fiction کی ایک بہت ہی اہم کتاب 72 very short stories 1992 میں چھپی تھی جس کو James Thomas نے ایڈیٹ کیا تھا۔

انگلینڈ میں افسانچے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کی چیسٹر یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک چھ ماہی رسالہ FLASH: The International Short Short Story Magazine بھی شائع کیا جاتا ہے جس میں Flash Fiction, Micro Fiction, Sudden Fiction, Minute Post Card Fiction, Fiction, Fiction, Nano Fiction, Furious Fiction, Fast Fiction, Quick Fiction, Skinny Fiction کو شامل کیا جاتا ہے۔ جن مصنفوں کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی ہے اُنھیں اعزازی کاپیاں بھیج دی جاتی ہیں۔ رسالے کا ای میل ہے

flashmagazine@chester.ac.uk

مندرجہ بالا تفصیلات کو دیکھنے پر پتا چلتا ہے کہ انگلینڈ میں تو جیسے افسانچوں کی آندھی چل پڑی ہے اور اس کی رفتار میں روز بہ روز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

فارسی زبان میں بھی مختصر کہانیوں کی روداد ملتی ہے۔

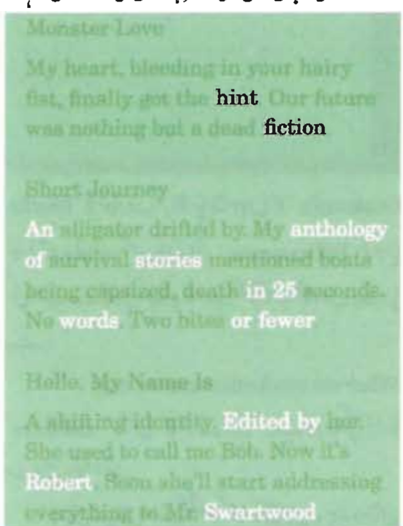

Monster Love

My heart, bleeding in your hairy fist, finally got the hint. Our future was nothing but a dead fiction.

Short Journey

An alligator drifted by. My anthology of survival stories mentioned boats being capsized, death in 25 seconds. No words. Two bites or fewer.

Hello, My Name Is

A shifting identity. Edited by her. She used to call me Bob. Now it's Robert. Soon she'll start addressing everything to Mr. Swartwood

ابو محمد مصلح الدین بن عبداللہ شیرازی جنھیں شیخ سعدی شیرازی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے نے 1258 نے گلستاں نام کی کتاب لکھی تھی جس میں چھوٹی چھوٹی نصیحت آمیز کہانیاں ملتی ہیں۔ حالانکہ اس میں جگہ جگہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔

عربی زبان میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی نشاندہی خلیل جبران کی نگارشات میں ملتی ہیں۔ حالانکہ اُن کی حکایات میں افسانچے کے عناصر کی تلاش جاری ہے۔ کچھ لوگ اسے افسانچے کا درجہ دینے پر متفق نہیں ہیں۔ خیر جو بھی ہو مختصر تصنیفات کے لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اب ہم جاپان کی طرف رُخ کرتے ہیں یاشوناری کاواباتا (Yasunari Kawabata) وہاں کی ایک بہت ہی معتبر ادبی شخصیت کا نام ہے۔ اُن کے ناولوں کا جاپان میں کافی کریز ہے۔ اُن کی ایک مقبول ترین تخلیق Japan the Beautiful and Myself کو 1968 میں جاپان میں ادب کا پہلا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ ایسے مصنف کا مختصر کہانیوں کی طرف راغب ہونا میرے خیال میں دُنیا کے تمام افسانچہ نگاروں کے لیے واقعی فخر کی بات ہے۔ اُن کے افسانچوں کا مجموعہ 'تینو ہیرا نو شوسوتسو' (Tenohira no shosotsu) نے جاپان میں تہلکہ مچادیا تھا جس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انگریزی میں Palm- of -The- Hand-Stories یعنی ہتھیلی سائز کی کہانیوں کے نام سے 1988 میں منظرِ عام پر آئی ہے۔

امریکہ جب دُنیا میں ہر چیز میں سب سے آگے رہنا چاہتا ہے تو بھلا وہ مختصر کہانیوں کے میدان میں پیچھے کیسے رہ سکتا ہے۔ اس صنف میں امریکیوں کا جنون دیکھیے 1978 میں R.V.Cassill نے The Norton Anthology of short Fiction، 1982 میں Irvin Howe نے Short Shorts، 1989 میں Robert Shapar نے Sudden Fiction International، 1992 میں James Thomas نے Flash Fiction، 1994 میں Jerom Stern نے Micro Fiction An Anthology of really short

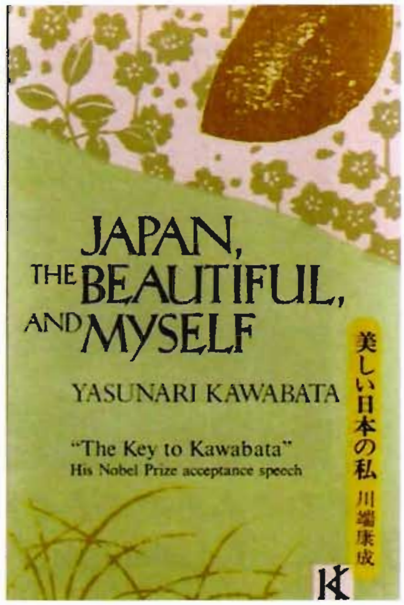

stories، 1995 میں Steve Moss نے The World's Shortest Stories اور 1999 میں John Updike نے The Best American Short Stories of The Century کی شکل میں پیش کیا ہے۔

اتنا ہی نہیں 2007 میں رابرٹ شیفرڈ اور جیمس تھامس نے مشترکہ طور پر 320 صفحات پر مشتمل ایک کتاب Flash Fiction Forward ایڈٹ کی ہے جس میں Ron Carlson ، Robert Coover، Steve Almond، Amy Hampel، A.M.Homes، Grace Paley اور Paul Theroux جیسے نامور فکشن رائٹرس کی مختصر کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

ہنگری کے Istvan Orkeny نے اپنی مختصر کہانیوں کے مجموعے کو One Minute Story کا نام دیا ہے۔ یہ کتاب 1962 میں چھپی تھی۔ ون منٹ سٹوری میں کل 58 کہانیاں ہیں جو یک سطری سے لے کر 16 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے میرے خیال میں اس کا نام ون منٹ اسٹوری موزوں نہیں معلوم پڑتا ہے۔ جو بھی ہو اس میں کچھ کہانیاں تو بلا شبہ ایسی ضرور ہوں گی جو ایک منٹ میں پڑھی جاسکتی ہوں گی اور نہایت مختصر ہوں گی۔

چین بھی اس صنف میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ وہاں اس طرح کی کہانیوں کو Smoke Long Fiction کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی ایک سگریٹ پینے میں جتنا وقت لگتا ہے اتنے میں ایک کہانی پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کی تقلید میں وہاں ایک آن لائن ادبی میگزین Smoke Long Quarterly جاری کی گئی ہے۔ اُردو کے فرنچ زبان میں افسانچے کو Micronouvell es کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صنف کے مصنّفوں میں Jacques Fuentealba, Vincent Bastin , Oliver Gechter& Laurent Berthiaume وغیرہ کافی مقبول ہیں۔

جرمنی میں افسانچہ Kurzestgeschichten کے نام سے مشہور ہے۔ مصنفوں کی ایک بڑی تعداد اس صنف کی دیوانی ہے۔ جن میں Franz Kafka, Bertolt Brecht اور Peter Bichsel سب سے زیادہ معروف ہیں۔

اب میں آپ کو Augusto Monterroso

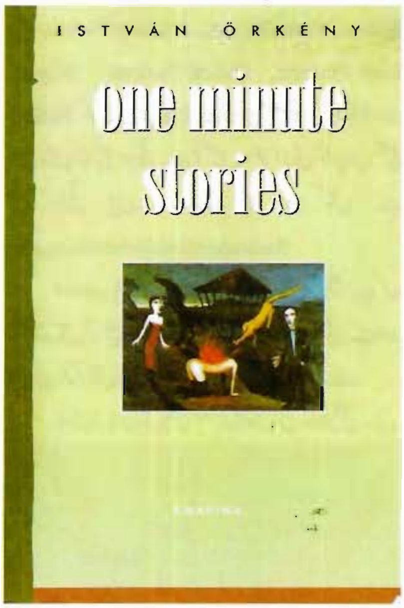

Bonilla کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جو Guatemala کا باشندہ تھا اور جس کی کہانی El Dinosaurio کو دنیا کی سب سے چھوٹی کہانی کا درجہ اکثر تبصرہ نگاروں نے دیا ہے۔

"When she awoke the dinosaur was still there" جس کا ترجمہ ہے "جب وہ جاگی ڈائنا سارو ہیں کھڑا تھا۔

ہندی میں اس صنف کو لگھو کتھا کہتے ہیں۔ ہندوستان میں لگھو کتھا والوں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے۔ جس میں چترا مگدل، بلرام اگروال، سوکیش ساہنی، سریش شرما، رامیشوری کامبوج، ڈاکٹر ستیش دوبے، بال کرشن گپتا اور دھرم پال جیسے لکھکوں کے افسانچے کافی معیاری ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندی کی لگھو کتھائیں اردو کے افسانچوں سے neck to neck مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

اُردو میں افسانچے کی بنیاد بلا شبہ سعادت حسن منٹو نے ڈالی تھی۔ اس موضوع پر اُن کی واحد کتاب 'سیاہ حاشیے' ساری دنیا میں مقبول ہوئی ہے۔ اُس کے بعد جوگیندر پال نے اس پودے کی آبیاری کی۔ اس سلسلے میں اُن کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں 'کتھا نگر' کو لوگوں نے خوب سراہا ہے۔ رتن سنگھ نے افسانچے کی روایت کو برقرار رکھنے میں کافی جدّ و جہد کی ہے۔ اُن کے افسانچوں کا مجموعہ 'مانک موتی' بھی عوام میں مقبول ہے۔ آج ہندوستان میں افسانچہ نگاروں کی ایک بہت بڑی جماعت وجود میں آچکی ہے اور یہ تعداد روز بہ روز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

جہاں تک پاکستان میں اردو افسانچے کا سوال ہے وہاں اس صنف کو بہت ہی کم لوگوں نے برتا ہے۔ میرے خیال میں پاکستان میں صرف ایک یا دو معیاری افسانچہ نگار ہیں۔ پہلا پرویز بلگرامی اور دوسرا محمد اعظم خان۔ ویسے اب چند مصنفوں نے اس صنف کی جانب توجہ دی ہے جن میں ارشد علی ارشد، الطاف خان اور عباس خان قابلِ ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم یہ اعلانیہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانچوں کی عالمی گونج بتدریج بڑھتی چلی جارہی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم 'اُردو والے' اپنے دقیانوسی خول سے باہر آئیں، اپنے False ego کو

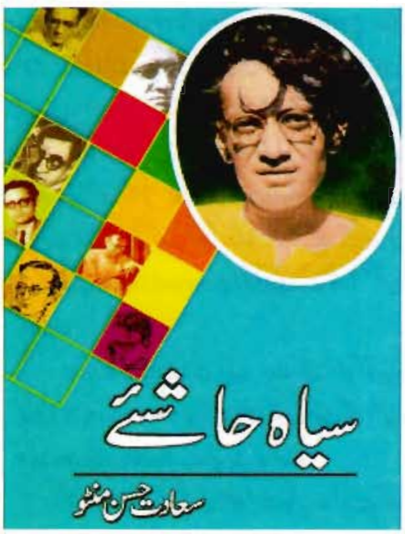

تیاگ دیں، اس کی گونج کو سُنیں، سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔

■

M A Haque, Haque Manzil, Ghos Compound, Centrual Street, Hind Pidhi, Ranchi - 834001 (Jharkhand)

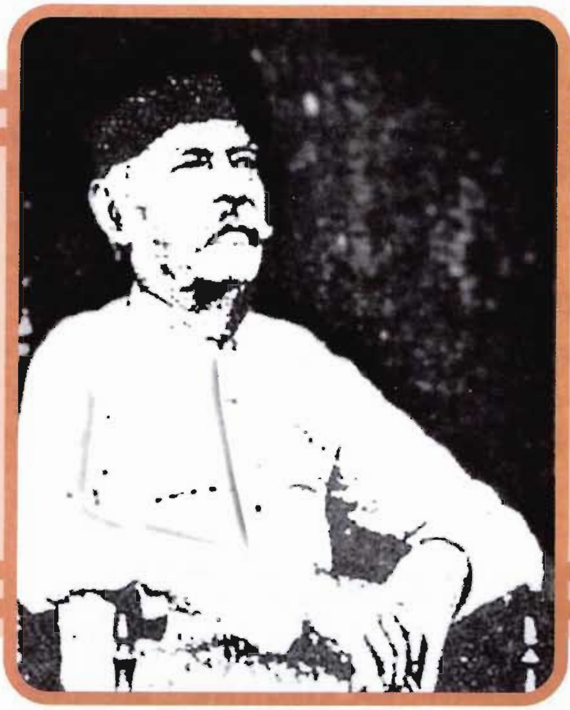

امتیاز عالم

امداد امام اثر کی انگریزی شاعری: ایک بازیافت

1857 کے بعد مختلف علوم وفنون پر دستگاہ رکھنے والی شخصیتوں میں ایک نمایاں نام امداد امام اثر کا بھی ہے، جنھوں نے شعر و ادب کے علاوہ علم ریاضی، حیوانیات، معدنیات، مناظرہ، فلسفۂ جدید وقدیم، زراعت و باغبانی اور طب پر کامل عبور پیدا کیے۔ اثر کئی زبانوں پر اردو، فارسی اور عربی کے فاضل تبحر تھے اور کئی یوروپین زبانیں جانتے تھے۔ خاص طور پر وہ انگریزی اور لاطینی زبانوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ادبی دنیا انھیں جدید اردو تنقید کے ایک اہم بنیاد گزار کی حیثیت سے جانتی ہے جبکہ ان کا شمار اپنے دور کے باکمال اور استاد شعرا میں بھی ہوتا تھا۔ انھوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی شاعری کی۔ ان کا دیوان منظر عام پر آیا تو ان کی اردو اور فارسی شاعری سے ایک بڑا حلقہ آشنا ہوا لیکن ان کی انگریزی نظمیں پردۂ غیاب میں ہونے کی وجہ سے ان کی انگریزی شاعری کی بات لوگوں کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جب اس طرح کی عبارت 'اثر انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے' نظروں سے گزرتی تھی۔

پہلی بار 2008 میں گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں اثر کا ایک خط میری نظروں سے گزرا، جو احسن مارہروی کے نام مورخہ 4 دسمبر 1905 میں لکھا گیا تھا، جس میں انھوں نے انگریزی میں سانیٹس لکھنے کی بات کہی تھی۔ بعد ازاں میری جستجو ان کے انگریزی سانیٹ میں بڑھ گئی۔ امداد امام اثر مذکورہ خط میں لکھتے ہیں:

''حضرات جدّت پسند اردو کی شاعری کو انگریزی کی شاعری بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ مجھے ایسے حضرات کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے گو مجھے انگریزی میں اتنا دخل ہے کہ اس زبان کی نظم پر تمام تر قادر ہوں اور وقت پر سانیٹس (Sonnits) وغیرہ لکھ لیا کرتا ہوں۔ ایسی جدّت کے علاوہ مجھے اس عہد کی غزل سرائی سے بھی کوئی حظ نہیں اٹھتا۔'' (1)

اس خط میں اثر اس وقت انگریزی طرز میں اردو شاعری کے رجحان کو فروغ دینے کی کوشش کی مخالفت کرتے ہیں، ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ مجھے انگریزی نظم میں اتنا دخل ہے کہ اس زبان کی نظم پر تمام تر قادر ہوں یعنی انگریزی شاعری کی افہام وتفہیم پر میری گہری نظر ہے اور وقت ملنے پر اس زبان میں سانیٹس وغیرہ لکھ لیا کرتا ہوں۔ اثر نے انگریزی زبان میں سانیٹ صرف لکھا ہی نہیں، اس کے اصول وضوابط بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'کاشف الحقائق' جلد دوم میں سانیٹ کے مباحث مختصر انداز میں اٹھائے ہیں اور صنف سانیٹ کو غزل کے مشابہ قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ اس پر غزل کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ یہ ہیں:

''زبان انگریزی میں شاعری کی ایک صنف ہے جس کو سانیٹ کہتے ہیں۔ یہ صرف غزل گوئی سے مشابہت رکھتی ہے مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کس واسطے کہ سانیٹ کو جو کچھ مشابہت غزل کے ساتھ ہے، وہ اسی قدر ہے کہ مضامین ذہنیہ از قسم واردات قلبیہ وغیرہ اس میں قلم بند کیے جاتے ہیں۔ مگر اس کا پیرایہ غزل سے علیحدہ ہوا کرتا ہے۔ سانیٹ کی ترکیب کچھ عشقیہ مثنوی کی ہوجاتی ہے۔ کس واسطے کہ التزام قطعہ بندی غزلیت کی ترکیب ظاہری قائم رہنے نہیں دیتا۔'' (2)

لیکن پروفیسر وہاب اشرفی اثر کے اس نظریے کو درست نہیں مانتے ہیں۔ وہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ سانٹ اور غزل سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ سانٹ تو چودہ سطری ایک مربوط نظم ہوتی ہے۔ جو واضح طور پر ہر دو حصے Octave اور Sestet میں بٹی ہوئی ہے۔ پھر اس کی سطروں کا کچھ مخصوص التزام بھی ہے۔ ایسی صورت میں کسی بنیاد پر بھی غزل کو سانٹ سے قریب نہیں بتایا جاسکتا۔'' (3)

پروفیسر وہاب اشرفی اپنی بات کی تائید میں 'اردو شاعری پر ایک نظر' کے دیباچہ سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں اور سانیٹ کو جاپانی شاعری کی ایک صنف 'ہائیکو' سے قریب بتاتے ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک صنف چند زبانوں کے اصناف سے مشابہ نہ ہو۔ بلاشبہ مشابہ ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں میرا یہ ماننا ہے کہ اثر نے اوپر جو بات کہی ہے وہ بالکل درست ہے۔ چونکہ سانیٹ ایک غنائی داخلی شاعری ہے اور چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا ہیئتی تصور مختلف اوقات میں تبدیل ہوتا رہا ہے، لیکن کسی نہ کسی شکل میں اس کی یہ بنیادی

خصوصیت برقرار رہی ہے کہ اس میں محض داخلی جذبہ ایک مکمل خیال بنا کر پیش کیا جائے اور چودہ مصرعوں کو اپنے دو بندوں میں تقسیم کیا جائے کہ اس کے پہلے آٹھ مصرعوں (Octave) میں خیال کا پھیلاؤ ہو اور بعد کے چھ مصرعوں (Sestet) میں اس کی تکمیل۔ اس صنف کے شاعر کے لیے کم سے کم الفاظ کا انتخاب، طریقۂ اظہار میں ایجاز اور اسلوب بیان میں ارتقا کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ انھیں خصوصیات کی بنا پر پروفیسر احتشام حسین مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اردو زبان میں سانیٹ ایک پل ہے جو غزل اور نظم کے درمیانی خلیج کو پاٹتا ہے۔ اس میں غزل کی اشاریت، اس کا رچاؤ، اس کی گہرائی، اس کی پہنائی بھی موجود ہے اور نظم کا تسلسل، اس کی ہم آہنگی، اس کا داخلی و خارجی تناسب، اس کا محاکاتی انداز بھی۔ غزل اور نظم کی تمام اہم خصوصیات کا یہ حسین امتزاج سانیٹ کو ایک انوکھی خوبی اور ایک نرالی کشش عطا کرتا ہے۔'' (4)

درحقیقت مذکورہ بالا سطور اثر کے اقتباس کی تشریح ہے جسے مقالہ نگار نے ذرا

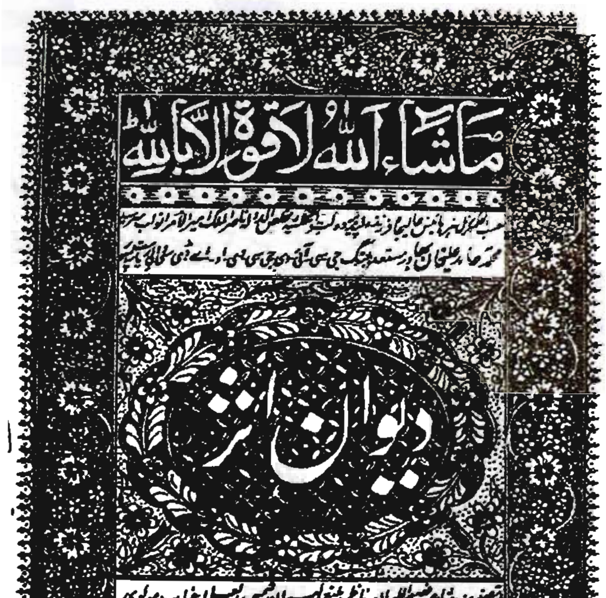

تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اردو زبان میں سانیٹ کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ عظمت اللہ خاں، ن م راشد اور اختر شیرانی نے اس کی طرح ڈالی، لیکن نہ جانے کیوں ان کے سانیٹ کو عام سند قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اثر انگریزی میں سانیٹ لکھا کرتے تھے۔ اس لیے وہ اس صنف کے بارے میں اپنے خیال بڑے وثوق کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ خط بنام احسن مارہروی میں انگریزی میگزین و اخبار سے دلچسپی کا اظہار بھی کرتے ہیں:

''مجھے مطلق فرصت نہیں ہے کہ کسی گلدستہ کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ ضرورتوں سے جگہ جگہ جانا بھی پڑتا ہے۔ اردو اخباروں کو کون پوچھتا ہے 'پانیونیر' اور 'انگلشمین' کو دیکھ لینے کا بعض اوقات موقع نہیں ملتا ہے۔ ہر چند نیورہ میری قیام گاہ ہے مگر یہاں سے اس قدر

اردو زبان میں سانیٹ ایک پل ہے جو غزل اور نظم کے درمیانی خلیج کو پاٹتا ہے۔ اس میں غزل کی اشاریت، اس کا رچاؤ، اس کی گہرائی، اس کی پہنائی بھی موجود ہے اور نظم کا تسلسل، اس کی ہم آہنگی، اس کا داخلی و خارجی تناسب، اس کا محاکاتی انداز بھی۔ غزل اور نظم کی تمام اہم خصوصیات کا یہ حسین امتزاج سانیٹ کو ایک انوکھی خوبی اور ایک نرالی کشش عطا کرتا ہے

غائب رہتا ہوں کہ میرے قیام کا نام ہی نام ہے۔ اس انتشار قیام کے باعث میں کسی اخبار یا گلدستہ کا سبسکرائبر (Subscriber) نہیں ہو سکتا۔ انگریزی اخبار جو میرے عزیزوں کے پاس آتے ہیں ان کے دیکھ لینے کا بھی موقع کم پاتا ہوں۔'' (5)

مذکورہ اقتباس سے ایسا لگتا ہے کہ اثر اردو اخبارات کو انگریزی اخبارات کے مقابلے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا جملہ 'اردو اخباروں کو کون پوچھتا ہے' کئی طرح کے سوالات کھڑے کرتا ہے۔ بہرحال وہ اس وقت کے مشہور انگریزی اخبار 'پانیونیر' اور 'انگلشمین' کو دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے کیا ہے لیکن ان کے انگریزی سانیٹس کس انگریزی اخبار اور میگزین میں شائع ہوتے تھے، اس کا ذکر اثر نے کہیں نہیں کیا ہے۔ دیوان اثر (طبع ثانی 1913) کے بعد ان کے غیر مطبوعہ اردو اور فارسی کلام 'فوائد دارین' اور 'فسانۂ ہمت' میں چھپ چکے ہیں جو ان کی آخری عمر کی کتابیں ہیں اور چند ماہ قبل ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے دیوان اثر کی نئے طریقے سے تدوین کر کے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے شائع کیا ہے اس کے باوجود اثر کی انگریزی شاعری کا تفصیلی ذکر ان کتابوں میں بھی نہیں ہوا اور نہ ہی یہ لکھا گیا کہ کہاں چھپتی تھی۔

امداد امام اثر نے ایک دوسرے خط میں حضرت شاہ شرف الدین مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح جو انگریزی زبان میں لکھی اپنی اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ منشی محمد الدین فوق کے نام ایک خط مورخہ 24 اگست 1919 میں لکھتے ہیں:

''میں اپنی تصنیفات سے ایک ایک نسخہ 'معیار الحق' اور 'بہارستان سخن' جلد دوم کا ارسال کرتا ہوں۔ ایک کاپی شاہ شرف الدین بہاری مخدوم الملک کے حالات کی بھی جو بزبان انگریزی ہے روانہ خدمت ہوتی ہے۔'' (6)

اس کے بعد سے میری تلاش و جستجو کا شوق اور بڑھ گیا۔ اسی دوران ان کے صاحبزادے عابد امام زیدی سے میری ملاقات پٹنہ میں ہوئی۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی نظمیں اس وقت کے مشہور اخبار 'کامریڈ' میں شائع ہوتی تھیں۔ چونکہ وہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ملازم رہ چکے تھے، اس لیے میں نے ان سے انگریزی نظم کا مطالبہ کیا لیکن وہ مہیا کرانے سے قاصر رہے۔ اسی دوران ان سے معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرت شاہ شرف الدین مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح انگریزی زبان میں لکھی تھی اور یہ مقالے کی شکل میں 'جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی' پٹنہ کے کسی شمارے میں شائع ہوئی ہے جسے انھوں نے خود پڑھا ہے۔ لیکن وہ مہینہ اور سال بتانے سے قاصر رہے۔ رضا قاسم مختار نے بھی اپنے ایک مضمون بعنوان 'شمس العلما نواب سید امداد امام اثر عظیم آبادی' مطبوعہ رسالہ 'ندیم' اکتوبر 1937 میں انگریزی سانیٹس کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آپ فطری شاعر تھے۔ اردو فارسی کا کلام تو استادانہ تھا۔ کبھی کبھی انگریزی میں بھی اشعار نظم کرتے تھے۔ آپ کے چند سانیٹس انگریزی زبان میں نظر سے گزرے ہیں۔" (7)

رضا قاسم صاحب اثر کے بہت قریبی لوگوں میں سے تھے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کہاں چھپتے تھے اور نہ ہی نمونۂ کلام پیش کیا۔ چہ جائے کہ وہ ان کی انگریزی شاعری پر اظہار خیال کرتے۔ اس طرح کی باتیں کئی مضامین میں ملتی ہیں جن سے مجھے یہ اندازہ ہونے لگا کہ یہ سلسلہ نقل در نقل کا ہے۔ خود اثر کے فرزند ارجمند صادق امام زیدی جو کہ ابھی پاکستان میں مقیم ہیں، نے 'دیوان اثر' طبع ثالث میں 'پس نوشت' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ اثر کے زیادہ تر انگریزی سانیٹس مولانا محمد علی جوہر کے معروف زمانہ انگریزی اخبار 'کامریڈ' میں شائع ہوتے تھے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"انگریزی میں سانیٹ بھی لکھے ہیں جو زیادہ تر مولانا محمد علی جوہر کے مشہور اخبار 'کامریڈ' میں شائع ہوئے۔" (8)

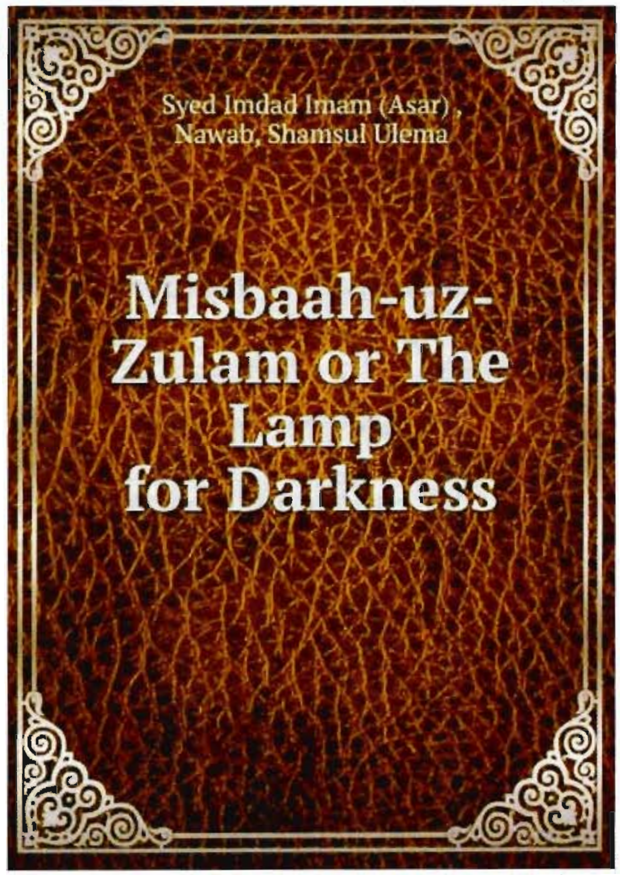

لیکن صادق امام زیدی نے بھی اپنے والد کی انگریزی شاعری کے متعلق اس سے زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں اور نہ ہی ان کی انگریزی شاعری پر کوئی تبصرہ ہی کیا۔ حال ہی میں مجھے ان کا ایک انگریزی میں ترجیع بند قصیدہ ملا ہے۔ تین مورتی لائبریری، چانکیہ پوری، نئی دہلی میں موجود 'کامریڈ' کے پہلے ایڈیشن 14 جنوری 1911 سے لے کر نومبر 1914 اور جون تا دسمبر 1925 کی مائیکروفلمیں دیکھیں جن میں اثر کا صرف ایک ترجیع بند قصیدہ 'AFTER HAFIZ' کے عنوان سے ملا، جو ہفت روزہ 'کامریڈ' جلد نمبر 3، شمارہ نمبر 2، مؤرخہ 13 جنوری 1912، سنیچر، کلکتہ ایڈیشن میں چھپا جو چھ بند پر مشتمل ہے۔ سانیٹ کے عنوان سے تین انگریزی کلام واسطی صاحب کے ملے جن کا اصل نام نواب عمائد الملک سید حسین بلگرامی ہے، لیکن اثر کا ایک بھی سانیٹ نہیں ملا۔ مسٹر ڈبلیو اولڈھم کا ایک خط (بزبان انگریزی، 1916) پر خدا بخش لائبریری میں میری نظر پڑی، جس میں مسٹر اولڈھم نے 'جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی' پٹنہ کے لیے اثر کے انگریزی مقالہ لکھنے کے ارادے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس جرنل کے چند شمارے منگوا کر اس مقالے کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور 'جرنل آف بہار اینڈ اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی' پٹنہ کے جلد 3 حصہ 3، ستمبر 1917 کے شمارہ میں "The Pirs; or The Muhammadan Saints of Bihar' کے عنوان سے درج 8 صفحات پر مشتمل اثر کا انگریزی مقالہ مل ہی گیا، جس میں حضرت سید شرف الدین مخدوم الملک علیہ الرحمہ کے حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا عکس میرے پاس موجود ہے۔

امداد امام اثر کی پوری شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں وہ تمام مروجہ شعری میلانات ور جحانات پائے جاتے ہیں جو اردو شاعری کی طویل روایات میں موجود تھے۔ ان کی شاعری کا دائرہ کار تصوف سے لے کر تفلسف اور تغزل تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے یہاں میر درد کا درد انسانیت بھی ہے اور میر کا سوز و گداز بھی، جرأت کا تصور لمس سے مملو رنگ شاعری بھی ہے اور غالب کی فلسفہ طرازی بھی، ذوق کی زبان دانی بھی ہے اور مومن کی نازک خیالی بھی غرض دیوان اثر میں جو غزلیں موجود ہیں وہ تقریباً پندرہ شعرا کی زمین میں ہیں۔ صرف زمین ہی کی بات نہیں بلکہ ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات بھی منکشف ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اساتذۂ اردو کی غزلوں میں بیان ہوئے مضامین کو بھی اپنی غزلوں کا حصہ بنایا ہے۔ اساتذہ کی زمین میں غزلیں کہنا بہت آسان کام ہے لیکن اسے نباہ لے جانا مشکل امر ہے۔ ان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اساتذہ کی زمین اور پامال مضامین کو اس ڈھنگ سے باندھا ہے کہ اس میں ایک طرح کی تازگی اور طرفگی آگئی جس کی بدولت ان کی غزلوں کی حیثیت دوبالا ہوجاتی ہے۔ ایک شاعر کے یہاں فطری طور پر جو مادۂ تجسس ہونا چاہیے، وہ اثر کے پاس موجود تھا۔ اسی وجہ سے اثر کامیاب شاعر ہو پائے۔ ان کے یہاں زبان و اسلوب کی شستگی وصراحت موجود ہے۔ انھوں نے فارسی شاعری میں سعدی، حافظ، عرفی اور نظیری کے انداز تغزل کی کیفیت سے استفادہ کیا ہے لیکن حافظ کے مقابلے میں فارسی کے دوسرے غزل نگاروں کو زیادہ ترجیح نہیں دی۔ حافظ کے یہاں عشق کی جوئے ہے، اسے اثر نے زندگی کو ہشاش وبشاش رکھنے کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کی غزلوں سے متاثر ہوکر انھوں نے انگریزی میں ایک ترجیع بند قصیدہ 'حافظ کے بعد' (After Hafiz) کے عنوان سے لکھا۔ ان کی انگریزی نظم کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

حافظ کے بعد

وہ بلبل ہرے بھرے آشیانے میں رہ کر
میری روح کو پیار بھرے گیت کے ذریعے حوصلہ افزائی کرتی ہے
گلاب کھلتے ہوں بہاروں کے چھینٹوں سے
(اور) میرا دل آتشِ گل کی محبت کے ساتھ
تب تم پگھلے ہوئے لعل کو بہہ جانے دو
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

(2)

سرگوشی کرتی ہوئی محبت کیسی مسرت پیدا کرتی ہے!
کیسا لطف کششِ حسن سے ظاہر ہوتا ہے!
ایسے وقت میں ناگہاں بہار کے زمانے کے آشیانے ڈھونڈنے لگتے ہیں

اور بہت زیادہ مت سوچو بے قدر سونے کے بارے میں
چمکتے ہوئے جام میں اپنے غم کو ڈبودو
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

(3)

ناصحوں کی نصیحت اور مجنوؤں کی دعا کی کیا حقیقت ہے
آہ! بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ بیوقوفوں اور مسخروں کی مدح وثنا ہوں
جب گلاب کھلے، بلبل پیش کرے
وہ سب کچھ جسے پیش کرنے کے لیے روح آمادہ کرے
وہ تیرے کان کو پیار بھری سرگوشی عطا کرے
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

(4)

میں محبت کرتا ہوں اور بے شک میں محبت کے لیے جان دے سکتا ہوں
اس جذبے کو میں کبھی فرو (ختم) نہیں ہونے دوں گا
میری قسمت ایک سے زیادہ کا فیصلہ سناتی ہے
میں اسے بدل نہیں سکتا ہوں، مجھے ناصحوں کے بارے میں جاننے دو
وہ جو ایک سے زیادہ ہے وہ دوست ہے، کوئی دشمن نہیں
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

(5)

سب، سب نے ہی حسن کی طاقت کو تسلیم کیا ہے
کوئی صوفی، فقیر اس کی جادوگری سے انکار نہیں کرسکتا
زلیخا کی جان لیوا گھڑی کے بارے میں سوچو
جب پہلے پہل اس نے اپنے آپ کو یوسف کی بانہوں کے سپرد کیا
کس خوب صورتی کے ساتھ اس نے اس کے دل کو اپنے قبضے میں کرلیا، یہ سب کو معلوم ہے
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

(6)

حافظ کے گیت نہایت ہی شیریں ہیں
لیکن اس سے زیادہ شیریں امداد کے وہ گیت ہیں
جو اس کی شان وعظمت کے اعتراف میں قصیدے کی صورت میں لکھے گئے ہیں
میرے کان اس کی شاعرانہ صلاحیت سے آشنا ہیں
شیریں لے میں نغمے کو جاری رہنے دو
تازہ بہ تازہ، نو بہ نو

یہ نظم حافظ شیرازی سے متاثر ہے۔ یہ دراصل قصیدے کے فارم میں اثر نے اس نظم کو لکھا ہے، چونکہ حافظ کی شاعری میں جذبات عشق کی مکمل ترجمانی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں امداد امام اثر نے گل وبلبل کی داستان دہرائی ہے اور اس نظم کو عشقیہ جذبات کے منتہا تک پہنچانے کے بعد اپنے عجز بیان کا اعتراف کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہ نظم حافظ کی مدح میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حسن ودلکشی پیدا ہوگئی ہے ورنہ میرے اندر وہ صلاحیت نہیں ہے کہ میں اتنی خوبصورت نظم لکھ سکوں جس میں ہر قلم پر تازگی کا احساس ہو۔ فراق اسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی ہے مگر تیری رہ گزر پھر بھی

حسن وعشق کا ڈیفینیشن یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔ ودیاپتی کا ایک مصرع ہے:

نیو نیو لاگت ہے جَوں جَوں نہاریوں

ہندی کے ایک نامعلوم شاعر کا یہ شعر:

تجھ سے جتنی بار ملا ہوں
پہلی پہلی بار ملا ہوں

حسن کے اتنے کریکٹرز ہیں کہ جب جب اس سے ملیے گا اس سے نئی نئی چاشنی اور تازگی کا احساس ہوتا رہے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تحقیق کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اثر کے انگریزی سانیٹس اور نظمیں پردۂ غیاب سے کوئی باہر لائے، جن سے ہمیں لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے۔ اثر نے کلاسیکی شعریات کی روایات کو آگے بڑھایا ہے خصوصاً اس عہد میں جب غزل کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور غزل کی اصلاح کی بات کی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ الطاف حسین حالی کی غزل پر عشقیہ ہونے کا اعتراض تھا۔ اس کے مقابلے میں نیچرل شاعری کا تصور لایا گیا تھا لیکن اثر نے غزل کے عشقیہ ہونے کو ہی اس کی شعریات کا مرکزی اصول ٹھہرایا اور عشق کو زندگی کے لیے تروتازگی کا سامان قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حافظ شیرازی کے عشقیہ تغزل سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ ان کی عشقیہ شاعری سے صرف کسب فیض ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی بارگاہ میں خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں جس کی زندہ مثال مذکورہ قصیدہ ہے۔ اب تک اثر کی ایک ہی انگریزی نظم بازیافت ہوسکی ہے، جس سے ان کی انگریزی شاعری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب تک مجھے جو مواد دستیاب ہوئے ہیں اس بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اثر اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انگریزی میں بھی شاعری کی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی ایک دو نظم لکھ کر شاعر نہیں ہوسکتا اور نہ اسے شاعر قرار دیا جانا چاہیے لیکن اثر کی اور بھی انگریزی نظمیں اور سانیٹس ملنے کے امکانات ہیں۔ اس لیے اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔

حوالہ جات

(1) نقوش- مکاتیب نمبر، نومبر 1957 لاہور، ص: 256

(2) کاشف الحقائق، مرتبہ وہاب اشرفی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2002، ص 369

(3) کاشف الحقائق -ایک مطالعہ، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1998، ص 43

(4) اردو شاعری کا فنی ارتقا، مرتبہ فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1998، ص 508

(5) نقوش- مکاتیب نمبر، نومبر 1957، لاہور، ص 256

(6) ایضاً ص 257

(7) شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر عظیم آبادی' رضا قاسم مختار۔ مشمولہ 'ندیم' گیا، اکتوبر 1937، ص 224

(8) 'پس نوشت' دیوان اثر، (طبع ثالث) مرتبہ، صادق امام زیدی، کراچی، 1998، ص 482

(9) ہفت روزہ 'کامریڈ' جلد نمبر 3، شمارہ نمبر 2، تاریخ 13 جنوری 1912، سنیچر، کلکتہ ایڈیشن

Mohammed Imteyaz Alam,241, Periyar Hostel, J.N.U. , New Delhi - 110067

ابوالکلام قاسمی

بڑا ہے درد کا رشتہ

(قرۃ العین حیدر کی یاد میں)

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شاید اردو میں سب سے ممتاز دانش ور تھیں۔ اتفاق سے ان سے ناچیز کی محض رسمی راہ ورسم نہ تھی۔ نیازمندانہ روابط رکھنے، بے تکلفانہ باتیں کرنے اوران کی خوش مزاجی سے بھی لطف اندوز ہونے کے مواقع ان کے ساتھ بار بار ملے۔ اس لیے ان کے علمی، دانش ورانہ اور ہمہ جہت باخبری کے باعث اکثر اس بات پر ناز بھی ہوتا تھا کہ اپنے زمانہ کی ممتاز ترین ادیبہ اور بابصیرت دانش ور سے ہمیں بھی نیاز حاصل ہے۔ان سے پہلی ملاقات سری نگر میں مظہرامام کے گھر پر ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ اپنے بعض عزیزوں کے ساتھ کشمیر گئی ہوئی تھیں اور مظہرامام کے گھر کے قرب میں ہی کسی سرکٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھیں، وہ جسٹس جرارحیدر اوران کے بچوں کے ساتھ کشمیر گئی تھیں۔ میں اپنی بیگم دردانہ قاسمی کے ساتھ پہلی بار کشمیر کے سفر پر گیا تھا اور ہم دونوں مظہرامام کے ساتھ ہی قیام پذیر تھے۔ سری نگر پہنچ کر ہم ٹھہرے تو ایک ہوٹل میں تھے مگر مظہرامام صاحب نے ایک دو روز بعد ہی اصرار کر کے ہمیں اپنے گھر منتقل ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ یوں بھی مظہرامام کے اخلاق و تواضع کے ان کے تمام جاننے والے قائل رہے ہیں۔ میرے ساتھ تو یوں بھی ان کا دوہرا تعلق تھا۔ ایک تو وہ میرے ہم وطن تھے اور دوسرے میرے رسالے 'الفاظ' کے شماروں میں ان کی شاعری متعدد بار چھپ چکی تھی۔ مظہرامام کے گھر پر ان کی بیگم، اپنے زمانے کی اہم افسانہ نگار مبینہ امام اور بیٹی ڈولی (فرزانہ) تھیں۔ ان کے صاحب زادے شہیرامام ان دنوں سری نگر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مبینہ بھابھی بڑی اپنائیت سے پیش آنے والی خاتون تو تھیں ہی، فرزانہ، دردانہ سے عمر میں کچھ ہی چھوٹی رہی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم سب لوگ دو ایک روز میں ہی گھل مل گئے تھے۔ ہم لوگ تقریباً پندرہ روز تک وہاں بالکل اپنے گھر کی طرح رہے۔ عینی آپا اکثر مظہرامام صاحب کے گھر پر آجایا کرتیں اور دیر دیر تک بے تکلفانہ باتیں کیا کرتیں۔ ہم دونوں سے ان کو بے تکلف ہونے میں زیادہ وقت اس لیے نہیں لگا کہ دردانہ، ان دنوں عینی آپا کے والد سید سجاد حیدر یلدرم پر ریسرچ کررہی تھیں اور عینی آپا سے ان کی متعدد بار خط وکتابت ہوچکی تھی۔ میں نے بھی اپنے رسالے میں ان کا ایک افسانہ چھاپا تھا اور اس سلسلے میں میری بھی ان سے خط وکتابت رہ چکی تھی۔ ان کے مزاج کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں، تنک مزاج ہیں، لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں وغیرہ وغیرہ... مگر ہمیں ان کی شخصیت میں، شروع میں اس طرح کی کوئی بات دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہ تو وقت کے ساتھ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ حددرجہ نازک مزاج اور زودرنج تو ضرور ہیں مگر جن لوگوں کو ناپسند نہیں کرتیں ان کے ساتھ ان کا رویہ اکثر معتدل بلکہ خوش مزاجی کا ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریس کے شغل سے وابستہ ہوئے محض چار سال ہوئے تھے مگر اپنے زمانے کے قدرے معیاری اور مقبول ادبی رسالے کی ادارت کے سبب مجھے ادبی حلقوں میں خاصا جانا جانے لگا تھا۔ دردانہ کی ریسرچ آخری مراحل میں تھی اور انھوں نے اس وقت تک یونیورسٹی کی ملازمت کا آغاز نہیں کیا تھا۔ سری نگر میں شمیم احمد شمیم، جسٹس جرار حیدر، کشمیری لال ذاکر اور ان کے علاوہ کئی اور ادیبوں، صحافیوں اور ممتاز لوگوں سے عینی آپا اور مظہرامام کے وسیلے سے ملنے اوران کی محفلوں میں شریک رہنے کا موقع ملا۔ عینی آپا تقریباً روز ہی صبح یا شام ٹہلتی ہوئی مظہرامام کے گھر آجایا کرتیں اور دیر دیر تک بیٹھتیں۔ اس سفر کی ایک بات ہنوز یاد ہے کہ مظہرامام چوں کہ سری نگر ٹی.وی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے اس لیے انھوں نے عینی آپا کے متعدد پروگرام ریکارڈ کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ ہیچ مداں کو بھی شرف بخشا اور انٹرویو کے ارادے سے ایک روز وہ مجھے لے کر ٹی وی اسٹیشن کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ عینی آپا اچانک ان کے گھر آگئیں۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد انھیں اندازہ ہوگیا کہ ہم لوگ ٹی.وی اسٹیشن جارہے ہیں اور وہاں ہم دونوں کی گفتگو ریکارڈ اور نشر ہوگی، تو بے تکلفی سے بولیں کہ پھر تو صاحب ہم یہیں بیٹھیں گے، آپ لوگوں کا لائیو پروگرام دیکھیں گے اور مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں کہ دیکھیں کہ تم کیا عالمانہ باتیں کرتے ہو... یہ ان کا بے تکلفی میں عام انداز تکلم ہوا کرتا تھا۔

کشمیر سے واپسی کے چند ہی ماہ بعد عینی آپا جامعہ ملیہ میں وزیٹنگ پروفیسر بن کر آگئیں۔ ان کا زیادہ تر وقت شمیم حنفی کے گھر گزرتا۔ ان سے کشمیر میں ہی طے ہوگیا تھا کہ ان کے دہلی آنے پر ان سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ دردانہ نے ان سے ملنے اور تحقیقی مقالے کے سلسلے میں ان کی بعض وضاحتوں کو آخری شکل دینے کا

منصوبہ بنایا۔ کشمیر کی ملاقاتوں نے ہمارے درمیان کی اجنبیت کو پوری طرح ختم کر دیا تھا اور یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ اپنے خاندان بالخصوص اپنے والد بزرگوار کے بارے میں ہر طرح کا تعاون دینے کو تیار ہیں۔ دردانہ نے کچھ عرصہ پہلے جب ان کے نام بمبئی کے دورانِ قیام خط لکھے تھے تو انھوں نے بڑی دلچسپی لے کر جواب دیے تھے۔ دہلی میں جب شمیم حنفی صاحب کے گھر میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو یلدرم سے متعلق اَن گنت کارآمد باتیں معلوم ہوئیں جن کی وجہ سے دردانہ کو اپنی تھیسس کے آخری مراحل میں خاصی سہولت رہی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ثریا حسین سربراہ ہو کر ویمنس کالج سے آ گئی تھیں۔ عینی آپا سے ان کی عزیزداری بھی تھی اس لیے وہ خاص طور پر اس بات کے لیے کوشاں رہیں کہ عینی آپا وزیٹنگ پروفیسر ہو کر علی گڑھ پہنچ جائیں۔ جامعہ میں تو ان کی مدت قیام محض چند ماہ کی تھی مگر علی گڑھ میں سال ڈیڑھ سال کی مدت کی بات چل رہی تھی۔ اس سلسلے میں کاغذی کارروائی چل ہی رہی تھی کہ عین اس زمانے میں شعبۂ اردو کی طرف سے سجاد حیدر یلدرم کی صدی تقریبات منانے اور ان پر ایک بڑا سمینار منعقد کرنے کا پروگرام طے ہوا اور عینی آپا سمینار میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائیں۔ ثریا حسین اور ان کے اہلِ خانہ کے بعد عینی آپا کے شناساؤں میں شہریار اور ہم دونوں میاں بیوی نمایاں تھے۔ چنانچہ اچھا خاصا وقت ان کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ وہ بہت لمبے عرصے کے بعد علی گڑھ تشریف لائی تھیں۔ ان کو دیکھنے، ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا علی گڑھ کے باذوق ادب دوست حضرات کا اشتیاق قابلِ دید تھا۔ شاید وہ چھٹی دہائی کے آغاز میں پاکستان سے 'آگ کا دریا' کی اشاعت کے بعد آئی تھیں بلکہ وہ باقاعدہ طور پر پاکستان چھوڑ کر ہندوستان لوٹ آئی تھیں۔ انھوں نے ایک محفل میں اپنا افسانہ بھی سنایا تھا۔ ان کے والد اور خاندان کا علی گڑھ سے ربط، پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے ان کی تاریخی حیثیت اور سب سے زیادہ عینی آپا کی تحریروں کی علی گڑھ میں غیر معمولی پذیرائی نے ان کی علی گڑھ آمد کو ایک بڑے واقعہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ یلدرم سمینار کے بعد ہی وزیٹنگ پروفیسر شپ کے مراحل بھی طے ہو گئے، وہ اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت ایک پروفیسر وابستہ ہو گئیں۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کی فراہم کردہ رہائش کے بجائے انھوں نے قیام کے لیے پروفیسر ثریا حسین صاحبہ کے گھر کا ہی انتخاب کیا۔ وہ ہر روز شعبۂ اردو آتیں اور باقاعدہ کلاس لیتیں۔ ان کی کلاسوں کی نوعیت بالخصوص ریسرچ اسکالرز کے لیے روزانہ کم از کم دو گھنٹے اور ایم۔اے کے طلبا و طالبات سے ہفتے میں دو تین بار ملاقاتوں اور استفادے پر مبنی تھی۔ علی گڑھ میں ان کے قیام اور ان کی محفل میں متواتر بیٹھنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے دوران ان کے مزاج کو سمجھنے کا اچھا خاصا موقع ملا۔ گویا ان کے افسانوں، ناولوں خاص طور پر 'آگ کا دریا' اور دوسری تحریروں نے جس نوع کا رعب و دبدبہ ہمارے ذہن پر قائم کر رکھا تھا، ان سے ملاقات اور اندازِ گفتگو نے اس میں اعتدال سا پیدا کر دیا۔ وہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ طالب علموں سے گفتگو کرتیں اور

وہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ طالب علموں سے گفتگو کرتیں اور تدریس کے پیشے سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات پر دیر دیر تک لکچر دیتی رہتیں۔ ہم سب لوگ محدود جامعاتی انداز کے درس و تدریس سے وابستہ رہنے کے باعث بڑی حدتک رسمی لکچر دینے اور سننے کے عادی رہے ہیں۔ اس عالم میں عینی آپا کی آزاد دانش ورانہ گفتگو ایک تو رسمی ہونے کا تاثر نہیں قائم کرتی تھی اور دوسرے ان کا علم و فضل اتنا پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھاکہ شاید وہ خود بھی بہت شعوری تیاری کرکے ایسے عالمانہ اور مربوط انداز میں توسیع علم سے ہمیں آشنا نہ کرپاتیں۔

تدریس کے پیشے سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات پر دیر دیر تک لکچر دیتی رہتیں۔ ہم سب لوگ محدود جامعاتی انداز کے درس و تدریس سے وابستہ رہنے کے باعث بڑی حد تک رسمی لکچر دینے اور سننے کے عادی رہے ہیں۔ اس عالم میں عینی آپا کی آزاد دانش ورانہ گفتگو ایک تو رسمی ہونے کا تاثر نہیں قائم کرتی تھی اور دوسرے ان کا علم و فضل اتنا پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ شاید وہ خود بھی بہت شعوری تیاری کر کے ایسے عالمانہ اور مربوط انداز میں توسیع علم سے ہمیں آشنا نہ کر پاتیں۔

علی گڑھ میں عینی آپا کا قیام اس زمانے کی عام ادبی سرگرمیوں کے نقطۂ عروج تک پہنچانے کا محرک بنا رہا۔ انھوں نے علمی اور ادبی طور پر خود کو بھی بے حد مصروف رکھا اور اپنے متعلقین کو بھی۔ ان کا قیام اس اعتبار سے بھی بڑا ثمر آور تھا کہ اپنے قیام علی گڑھ میں طلبا کی رہنمائی اور بعض تحقیقی مقالوں کی نگرانی کے علاوہ انھوں نے شعبۂ اردو کی تاریخ پر ایک کتابچہ بھی مرتب کر دیا جس کی طرف اس سے پہلے کسی شخص نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس کتابچے سے مدد لے کر شعبۂ اردو کی پوری تاریخ کو پوری تفصیل کے ساتھ اور بڑے کارآمد انداز میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا افسانہ 'دریں گرد سوارے باشد' لکھا تھا، اور یہ وہی زمانہ تھا جب 'گردش رنگ چمن' (ناول) کا منصوبہ بنا کر انھوں نے اس کے موضوع پر ریسرچ کرنا شروع کر دی تھی۔ ڈیرہ دار طوائفوں سے متعلق واقفیت کے لیے انھوں نے لکھنؤ اور کلکتہ کے بعض اسفار بھی کیے تھے۔ ان کی پروفیسری کی مدت تو سال ڈیڑھ سال تھی جو بہت جلد ختم ہو گئی، لیکن 'گردش رنگ چمن' لکھنے کی مصروفیت کے سبب علی گڑھ میں مزید ایک سال تک قیام پذیر رہیں۔ ناچیز نے اس ناول کی تحریر کے زمانے میں عینی آپا کے ناول لکھنے کے انداز، ان کے ریسرچ کے مزاج اور بار بار نظر ثانی اور نظر ثالث کے طریقِ کار کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ عموماً ایک ایک باب کو بار بار لکھتیں اور اپنے کسی بھی مسودے سے آسانی سے مطمئن نظر نہ آتیں اور بسا اوقات اپنے لکھے ہوئے صفحے کے صفحے کو مسترد کر دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں کتابوں کی فراہمی اور دوسرے علمی تعاون کے لیے انھوں نے ڈاکٹر دردانہ، ڈاکٹر نیلم فرزانہ اور ڈاکٹر نسرین ممتاز سے بھی رابطہ رکھا، لیکن مسودے کی صفائی وہ کسی نہ کسی ایسے شخص سے معاوضتاً کرایا کرتی تھیں جو اردو زبان کی نزاکت سے کچھ زیادہ واقف اور املا شناس ہو۔ ناچیز نے ان کی 'میز پر گردش رنگ چمن' کے کم از کم پانچ مسترد مسودات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ان رویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتنی کہنہ مشقی کے باوجود اپنی کسی تحریر سے آسانی سے مطمئن نہ ہونے نے ہی شاید قرۃ العین حیدر کو 'قرۃ العین' بنایا تھا۔ انھوں نے اپنا کوئی ناول محض قصہ گوئی اور خالی خولی واقعات اور کرداروں کی کھتونی کی صورت میں نہیں لکھا۔ ہر ناول کا کوئی نہ کوئی تاریخی یا علمی یا ثقافتی پس منظر ہے جس کے لیے گہرے غور و خوض اور انتھک ریسرچ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ایم اے کے طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کے سامنے نظر ثانی کرنے، اصلاح کی غرض سے مسودے کو بار بار پڑھنے، اور ابتدائی ڈرافٹ کو حرفِ آخر

نہ سمجھ لینے کی تلقین کرتے ہوئے عینی آپا کے اس نوع کے تخلیقی عمل کی مثال پیش کی ہے۔ مجھے خود بھی اس طریقِ کار کے سبب خود تنقیدی کے مزاج کے باوجود مزید احتساب اور اپنی کسی تحریر سے جلد مطمئن نہ ہونے کا سبق ملا ہے۔

عینی آپا کے قیامِ علی گڑھ کے زمانے میں، میرے اصرار پر انھوں نے دو بڑے اہم اور غیر معمولی مضامین لکھے۔ ہوا یوں کہ رسالہ 'الفاظ' سے کنارہ کشی کے بعد میں نے کسی اور ادبی رسالے کے نکالنے کی ٹھان رکھی تھی، چنانچہ 'انکار' کے نام سے ایک نیا کتابی سلسلہ شائع کرنے کا تہیہ کرلیا۔ ان ہی دنوں وہ ثریا حسین صاحبہ کے ساتھ حیدرآباد کے سفر پر گئی تھیں اور یادوں کا نہ جانے کیا کیا خزانہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ وہ وہاں کی تاریخ، تہذیب، زبان، جغرافیہ اور بعض شناساؤں کا اکثر ذکر کیا کرتیں۔ میں مصر ہوگیا کہ رسالہ 'انکار' کے پہلے شمارے کے لیے آپ حیدرآباد کا سفرنامہ لکھ ڈالیں۔ ابتدا میں تو انھوں نے خاموشی اختیار کی، مگر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس سفرنامے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوگئی ہیں۔ بعض حقائق کی تلاش وجستجو اور بعض دکنی مصنفین کی نثر ونظم کی کتابیں ان کے مطالعے میں رہنے لگیں اور جب ایک روز موصوفہ نے یہ بشارت دی کہ دیکھو تمھارے لیے مجھے جو سفرنامہ لکھنا ہے اس کا میں نے عنوان ڈھونڈھ لیا ہے۔ یہ ملا وجہی کا ایک مصرع تھا ع دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں... ظاہر ہے اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں تو نہال ہوگیا اور دو چار ہی ہفتوں میں انھوں نے سفرنامہ مکمل کرکے میرے حوالے کردیا۔ میں نے جب پہلے شمارے میں اس سفرنامے کو چھاپا تو گویا اس شمارے کا سب سے بڑا سرمایہ وہی سفرنامہ بن گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'انکار' کے لیے دوسری تحریر ایران کے انقلاب پر لکھی تھی۔ انقلاب کا عمل جاری تھا اور پاسدارانِ انقلاب کے بارے میں ہیبت ناک خبریں آرہی تھیں۔ عینی آپا نے اس انقلاب پر جو مضمون لکھنا شروع کیا اس میں خاصا روشن خیال نقطۂ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ اسی لیے واجب القتل، واجب القتل کی تکرار اس میں بہت تھی اور لہجہ احتساب اور تنقید کا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ عینی آپا نے اس مضمون (جس کا نام عالم آشوب رکھا گیا تھا) میں کثرت سے مرزا دبیر اور بعض مقامات پر میرانیس کے مراثی کے مصرعے کے مصرعے استعمال کرڈالے تھے۔ پہلی نظر میں تاثر یہ ہوتا تھا کہ انھوں نے لکھنوی مرثیوں کی بنیاد پر کوئی اسمبلاژ سا تیار کیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ درمیان میں بعض مصرعوں کی معنویت اور خود مصنفہ کے قائم کردہ سیاق وسباق نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے اور بصیرت کے ساتھ عبرت کی فراوانی دکھائی دیتی تھی۔ اس عالم آشوب کا ذیلی عنوان تھا ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'' جو حضرت مرزا دبیر لکھنوی کے ایک مرثیے سے لیا گیا تھا۔ اس عالم آشوب کے لکھنے کے زمانے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہوئی کہ جب کبھی میں ان سے ملنے جاتا تو دیکھتا کہ وہ مرثیوں کے متعدد بند بہ آواز بلند دُہرایا کرتی ہیں اور جو مصرعے یاد نہ آتے انھیں یاد کرنے یا حوالہ دیکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں حیرت انگیز طور پر ان کی مدد پروفیسر ثریا حسین کے خاوند پروفیسر اظہار حسین کیا کرتے۔ اظہار صاحب ادب دوست کی حیثیت سے ضرور جانے جاتے تھے مگر کیا پتہ تھا کہ علم ریاضیات کے ایک ممتاز اور نامور عالم اور پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی گھٹی میں شعروادب بالخصوص مرثیوں کی روایت اس حد تک پڑی ہوئی تھی کہ وہ جب سنانے پر آتے تو مختلف مرثیہ نگاروں کے مرثیے جگہ جگہ سے اپنی یادداشت سے سناتے چلے جاتے۔ خود عینی آپا جو اظہار حسین صاحب کی طرح سکہ بند شیعہ روایات کی شاید پروردہ نہ رہی ہوں مگر انھوں نے مرثیے کی معنویت میں کچھ ایسے اضافے کیے جن سے روایت اور روشن خیالی دونوں کی آمیزش ناگزیر طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ ویسے قرۃ العین حیدر کے بارے میں اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ شاعری میں ان کا ذوق نہایت بالیدہ تھا۔ ان کو کثرت سے اساتذہ کے ہی نہیں اپنے زمانے کے بھی پسندیدہ شعرا کا کلام از بر تھا۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں تک کے عنوان میں عموماً کسی نہ کسی شعر سے استفادہ کیا ہے ع: اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے، ع: میرے بھی صنم خانے تیرے بھی صنم خانے، ع: گردش رنگ چمن ہے ماہ وسال عندلیب، ع: دونیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس، ع: اگلے جنم موے بٹیا نہ کیجو، وغیرہ وغیرہ۔ ان مصرعوں کی معنویت کو نظر انداز کرکے ان کے فکشن کی تحت البیان کو بہت زیادہ سمجھا بھی نہیں جاسکتا۔ فیض احمد فیض کی بہت سی نظمیں اور غزلوں کے اشعار اچانک ان کی زبان پر آجایا کرتے۔ میں نے فیض کی نظم 'انتساب' پہلے بھی ایک سے زیادہ بار پڑھی تھی اور یوں ہی سرسری گزر گیا تھا۔ ایک روز جب انھوں نے یوں ہی پڑھا ع آج کے نام اور آج کے غم کے نام... آج کا غم کہ ہے...، تو میں نے ان سے پوچھ لیا کہ یہ کون سی نظم ہے تو بولیں، ارے تمھیں یاد نہیں کیا اور لگاتار کئی مصرعے پڑھ ڈالے۔ ''آج کا غم کہ ہے، زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا + کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام/ تانگے والوں کے نام/ ریل بانوں کے نام/ کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام...... بادشاہِ جہاں،

والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض دہقاں کے نام/ جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے/ جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ... ان دکھی ماؤں کے نام/ رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں، اور نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں/ دکھ بتاتے نہیں/ منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں.... اس لیے ناچیز کو اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں کہ فیض کی اس نظم کی معنویت مجھ پر عینی آپا کی باتوں سے نئے سرے سے منکشف ہوئی۔ اس گفتگو کے بعد جب میں نے فیض صاحب کی اس نظم کو مزید توجہ سے پڑھا اور اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس میں تو ترقی پسند جمالیات کا سارا جوہر سمٹ آیا ہے۔

عینی آپا کے قیام علی گڑھ میں انھیں مختلف موڈ اور کیفیت میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شعبے میں ایک رفیقِ شعبہ کی حیثیت سے، ان سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ایک استاد اور دانش ور کی حیثیت سے اور ذاتی ملاقاتوں میں ایک بزرگ اور شفیق معاصر اور دوست کی حیثیت سے۔ انھیں اپنے والد اور اپنے خاندان سے جو جذباتی لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان کی عام تحریروں سے بھی کیا جا سکتا ہے اور خاص طور پر ان کی کتاب 'کارِ جہاں دراز ہے' سے۔ وہ میری بیگم دردانہ قاسمی سے کبھی ان کی ریسرچ کے حوالے سے اور کبھی ذاتی خوش گپی میں دیر دیر تک اپنی والدہ اور والد کے معمولات کی تفصیل بتلاتی رہتی تھیں۔ ان کا اور والدہ کا ساتھ چوں کہ عرصۂ دراز تک رہا اور ہندوستان سے پاکستان ہجرت اور پھر واپسی جیسے تمام مراحل میں والدہ ان کے ہمراہ رہیں، اس لیے اس طرح کی گفتگو میں والدہ کی یاد زیادہ غالب رہتی۔ ایک بار دردانہ نے انھیں کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ اس زمانے میں ہمارا گھر محض دو چھوٹے چھوٹے کمروں اور ایک ناکافی وارنڈے پر مشتمل تھا۔ پہلے سے تو انھوں نے کھانے میں نمک نہ ڈالنے یا سبزی اور گوشت کے بارے میں اپنی پسند و ناپسندیدگی پر متعدد ہدایات دے دی تھیں مگر جب آئیں تو حد درجہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ دروازے کی چوکھٹ، کمروں کے دروازوں اور ریفریجریٹر وغیرہ پر جو آیتیں اور دعائیں لگائی گئی تھیں ان کو پڑھتیں اور مجھ سے ان کے معنی دریافت کرتی رہیں۔ ویسے ان آیتوں اور دعاؤں کا ہلکا سا مفہوم ان پر پہلی نظر میں واضح بھی لگتا تھا۔ پھر بولیں کہ خدا کا شکر ہے کہ کوئی تحریر بے موقع اور نامعقولیت سے نہیں لگی ہوئی۔ بھئی تم تو خاصے معقول آدمی ہو۔ چوکھٹ پر گھر کی حفاظت، دروازوں پر عام صحت و عافیت اور فریج پر رزق سے متعلق آیتوں کو پڑھ کر انھیں خوب

> **وہ معمولی معمولی باتوں سے انسان کے معمولات اور رویوں کے بارے میں گھرائی سے رائے قائم کیا کرتی تھیں۔ ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ان سے ہم کلام تھا کہ میں نے کسی وجہ سے گھڑی دیکھ لی، پھر کیا تھا وہ اچانک چراغ پا ہوگئیں۔ بولیں، اگر آپ کو کہیں جانے کی جلدی ہے تو آپ جاسکتے ہیں، باربار گھڑی کیا دیکھ رہے ہیں**

اندازہ ہوگیا تھا کہ جو آیت جس جگہ تھی اسے وہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے انسان کے معمولات اور رویوں کے بارے میں گہرائی سے رائے قائم کیا کرتی تھیں۔ ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ان سے ہم کلام تھا کہ میں نے کسی وجہ سے گھڑی دیکھ لی، پھر کیا تھا وہ اچانک چراغ پا ہوگئیں۔ بولیں، اگر آپ کو کہیں جانے کی جلدی ہے تو آپ جا سکتے ہیں، بار بار گھڑی کیا دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوران اردو فکشن کے مطالعے اور مقبولیت کا ایک سروے بھی کرایا تھا۔ ہوا کچھ ایسا تھا کہ انھوں نے ایک سوال نامہ تیار کیا جس میں نام، دلچسپی، شعبے کا نام، ناولوں کے نام، اہم ناول اور افسانہ لکھنے والوں کے نام وغیرہ درج تھے۔ یہ سوال نامہ یونیورسٹی کی مختلف فیکلٹیوں اور شعبوں کے ایسے لوگوں کے پاس بھیجے گئے جو الگ الگ علوم وفنون کے ماہر ہونے کے ساتھ اردو ادب کے قاری بھی تھے۔ دراصل اس سروے سے یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ فکشن کی مقبولیت اور عدم مقبولیت کی صورت حال کیا ہے اور یہ بھی کہ کون کون سی تحریریں زیادہ پڑھی جاتی ہیں اور کون سی کم۔ ممکن ہے اس پورے عمل میں بحیثیت فکشن نگار خود اپنی مقبولیت یا درجہ بندی کا اندازہ لگانا بھی ایک ضمنی مقصد رہا ہو۔ اس طرح جب سروے مکمل ہوا تو اس کے نتائج بہت دلچسپ اور اہم نکلے۔ انھوں نے ان نتائج پر مبنی ایک رپورٹ بھی تیار کرنا شروع کی تھی۔ پتہ نہیں بعد میں اس رپورٹ کا کیا بنا۔ تاہم اگر وہ نتائج چھپ جاتے تو ان کی بنیاد پر اردو فکشن کی مقبولیت، نامقبولیت، معیار وغیرہ پر خاصی کارآمد گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اس سروے کی تیاری اور نتائج وغیرہ کی ترتیب و تدوین میں انھیں پروفیسر ثریا حسین اور پروفیسر اظہار حسین کا بھی تعاون حاصل تھا۔ پروفیسر ثریا حسین نے عینی آپا کے قیامِ علی گڑھ کے زمانے میں خود بھی متعدد علمی کاموں کا منصوبہ بنایا۔ 'پیرس و پارس' کے نام سے اپنا ایران اور فرانس کا سفرنامہ لکھا، ''جمالیات شرق و غرب'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور متعدد مضامین قلم بند کیے۔ ان چیزوں میں انھیں عینی آپا کے بھرپور تعاون کے ساتھ ان کی رہنمائی بھی حاصل رہا کرتی تھی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں ایک تو وہ شعبۂ اردو کی صدر ہو چکی تھیں اور باقاعدہ طور پر ادبی نظم و نسق میں شریک بھی رہا کرتی تھیں۔ چوں کہ اس سے پہلے ان کا کوئی خاص علمی کام سامنے نہیں آیا تھا اس لیے عینی آپا کے ورود کو ان کے لیے ورود مسعود سے کم نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔

ایک بار مجھے عینی آپا کے ساتھ یونیورسٹی کے

رجسٹرار آفس جانے کا اتفاق ہوا۔ شاید امتحان کے کسی کام کے معاوضے کا معاملہ تھا۔ (پیسے وغیرہ کے معاملے میں وہ اپنے واجبات کو کبھی ثانوی حیثیت نہ دیتی تھیں) وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہیں اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہنے لگیں کہ شاید یہ وہی عمارت ہے جو بچپن میں ہمارا گھر ہوا کرتا تھا، جس میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی کوٹھی سچ مچ وہی تھی جس میں کئی سال تک یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار سجاد حیدر یلدرم قیام پذیر رہ چکے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ میرا حافظہ یوں تو بہت اچھا نہیں مگر جیسا بھی ہے، ہے فوٹو جینک، یعنی ان کی یادیں تصویری شکلوں میں ان کے حافظے میں محفوظ رہا کرتی تھیں۔ یادوں کی بازگشت کے اس عمل کی انوکھی کارفرمائی ان کی تحریروں میں جگہ جگہ بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

علی گڑھ سے واپسی کے بعد وہ بمبئی کے بجائے باقاعدہ طور پر دہلی منتقل ہوگئیں اور ذاکر باغ میں رہنے لگیں۔ اس وقت BCCI کی طرف سے ہندوستانی ادیبوں کے وظیفے کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ کئی سال تک اس پروگرام کی سربراہ رہیں۔ ہم لوگ جب بھی دہلی جاتے ان سے ملاقات کی غرض سے ذاکر باغ ضرور جاتے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہم اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر جاکر ان سے ملا کریں۔ یاد آتا ہے کہ ایک بار انھوں نے آموں سے ہماری ضیافت کی تھی۔ بچوں کو الگ الگ بٹھا کر سامنے اخبار بچھا دیے تھے۔ اسی موقع پر ہمارے چھوٹے بیٹے سمیر کی تیزی اور شرارت کی وجہ سے اس کا نام انھوں نے چالو چکر رکھ دیا۔ بعد میں عرصے تک وہ اس کی خیریت چالو چکر کے نام سے ہی پوچھا کرتی تھیں۔ ذاتی تعلقات میں وہ یوں بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کی خاصی پرواہ کیا کرتی تھیں اور خیال بھی زیادہ رکھا کرتی تھیں۔ دہلی میں ان کے مراسم پروفیسر شمیم حنفی، صبا بھابی اور ان کے بچوں سے بہت گہرے رہے۔ ان کے گھر عینی آپا کا آجانا بھی بہت تھا اور شمیم صاحب کی ذاتی اور ادبی باتوں کو وہ اہمیت بھی بہت زیادہ دیا کرتی تھیں۔

دہلی کے زمانۂ قیام میں ان کی روحانی عقیدت ایک صوفی 'میاں صاحب' سے بہت گہری ہوگئی تھی جو بہ ظاہر دیکھنے میں خاصے ماڈرن اور روشن خیال لگتے تھے۔ وہ جب دہلی آتے تو عینی آپا کے ہی گھر ٹھہرتے۔ ان کے ساتھ عموماً ان کے دو چار مریدین اور عقیدت مند بھی ہوتے۔ جب تک وہ وہاں ٹھہرتے ان سے ملنے والے لگا تار آتے جاتے رہتے۔ وہ عینی آپا، جو بے حد نفاست پسند تھیں اور غیر ضروری بھیڑ بھاڑ کو ناپسند کرتی تھیں، وہ اب نہ صرف اپنے پیر کی عادات و اطوار سے مطمئن تھیں بلکہ ان کی ناز برداری میں بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتی تھیں۔ وہ خود بھی عینی آپا کو آپا ہی کہا کرتے اور اکثر اپنی گفتگو میں حسِ مزاح کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ ان سے عقیدت کے معاملے میں عینی آپا کی غیر معمولی سنجیدگی

کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ناول 'گردشِ رنگ چمن' میں ان کے اور ان کے بعض عقیدت مندوں کے کرداروں پر تقریباً سوڈیڑھ سو صفحات صَرف کیے ہیں اور ان کے کردار کو ماورائی کے بجائے حقیقی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو بعض لوگوں نے اس صوفی کردار پر اعتراضات بھی کیے ہیں مگر زندگی کے معمولات میں اگر اس نوع کے کردار، ان سے غیر معمولی عقیدت اور بعض محیر العقول واقعات کو ہم تسلیم کیے رہتے ہیں تو ناول کی یہ کون سی حقیقت نگاری ہوتی ہے کہ کردار کے ظاہر کے ساتھ باطن اور نفسیات کی ساری پیچیدگیوں کو اُبھارنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر انسانی زندگی کے تضادات کو ناقابلِ یقین حد تک بیان کرنے کو تہہ دار حقیقت نگاری کا نام دیا جائے یا اگر آزاد تلازمۂ خیال وغیرہ کی تکنیک کی مدد سے تخلیقی عمل کے سارے داخلی رشتوں تک رسائی حاصل کرنے کو کردار کی زیادہ بہتر پیش کش کا بدل قرار دیا جائے، تو ایسے رویوں کو ناول نگاری کا حصہ بنانا قابلِ اعتراض کیوں کر کہا جاسکتا ہے؟

قرۃ العین حیدر نے ہمیشہ تجرد کی زندگی گزاری۔ وہ جس حد تک نازک مزاجی اور اپنی پسند و ناپسند کے ساتھ جینا چاہتی تھیں، شاید ان کا یہ فیصلہ زیادہ دانش مندانہ تھا۔ وہ اپنی زود رنجی کی بنا پر بلا تکلف اپنے غصے کا اظہار کر دیا کرتی تھیں اور کسی رورعایت کی قائل نہ تھیں۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے اوائل میں انھیں گیان پیٹھ کے اعزاز سے نوازا گیا تھا اور صحیح معنوں میں اس طرح اردو کے جس ممتاز ترین ادیب، دانش ور اور عالم کو اس انعام کا سب سے زیادہ استحقاق حاصل تھا وہ فرض پورا ہوا۔ اگر اردو والوں کو اس بات کا رنج ہوتا ہے کہ ہندوستانی ادبیات میں ٹیگور کو نوبل ایوارڈ ملا اور علامہ اقبال کو نہیں ملا تو اس بات کی خوشی ضرور ہونی چاہیے کہ اگر نوبل انعام نہیں تو کم از کم گیان پیٹھ کے انعام کو قرۃ العین حیدر کی پذیرائی کر کے وہ عزت ملی جو بلا تفریق زبان بہت کم ایوارڈ یافتگان کی پذیرائی کی بدولت مل سکتی تھی۔ عینی آپا اس موقع پر بھی علی گڑھ تشریف لائی تھیں جب اس ایوارڈ کا اعلان ہوا تھا۔ علی گڑھ میں مختلف جگہوں پر اس اعزاز کے سلسلے میں تقریبات منائی گئیں۔ شعبۂ اردو کی تقریب میں اس موقع سے انھوں نے اپنا قدرے پرانا اور غیر معمولی افسانہ 'ملفوظات گل بابا بیگ تاشی' پڑھ کر سنایا تھا۔ یاد آتا ہے کہ اس موقع پر ناچیز اور شہریار نے ان سے ایک طویل گفتگو یا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ بعد میں یہ انٹرویو شعر و حکمت میں شائع ہوا۔ ان کے شائع شدہ انٹرویوز میں شاید یہ انٹرویو سب سے زیادہ کارآمد، جامع، معلوماتی اور گہری سنجیدگی پر مبنی گفتگو پر مشتمل تھا۔ شاید اسی باعث اس انٹرویو کو بعد میں میری معلومات کے مطابق کم از کم آٹھ دس جگہ نقل کیا جاچکا ہے۔

■

Prof. Abul Kalam Qasmi,Department of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh 202002 (UP)

مصنف: ویرونود چھابڑا　　ترجمہ: صبیحہ انور

اب کوئی نہیں آتا ہے یہاں

یہ تحریر اردو کے معروف اور مقبول افسانہ نگار رام لعل کے بیٹے کی یادیں ھیں جو رام لعل کی پھلی برسی کے موقع پر 16اکتوبر 1997 کو لکھی گئیں۔ ویر ونود چھابڑا ھندی کے مشھور صحافی ھیں۔ خاص کر کھیل کود کی دنیا کی خبریں ان کا موضوع ھیں۔ کرکٹ ان کا پسندیدہ موضوع تحریر ھے۔

میرے پتا جی، جنھیں ادب کی دنیا رام لعل کے نام سے جانتی تھی، کے انتقال کو آج ایک برس ہوگیا۔ بڑا مشکل ہوتا ہے اس شخص کو بھلانا جس سے آپ جنمے ہوں اور جس کے ساتھ لگ بھگ چھیالیس طویل برسوں کے پل پل گزارے ہوں، بڑے پیار اور جذبوں سے بھرپور۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے اس گزرے ہوئے وقت کو قلم بند کرنا، کیونکہ جذبوں کی شدّت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ قلم کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کرے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوتی ہیں کاغذ صاف نظر نہیں آتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ان کے بارے میں اس لیے بھی لکھنا مشکل ہے کہ وہ میرے پتا ہی نہیں بلکہ اردو دنیا کی ایک عظیم شخصیت بھی تھے۔ کسی بھی ادب سے وابستہ شخص کا سر سے پاؤں تک پھیلاؤ اتنی دور دور تک ہوتا ہے کہ اسے چند الفاظ میں سمیٹنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ موت کا منظر کسی کا بھی بھلانا ناممکن ہے، خاص طور پر جب وہ جنم داتا ہو، میں بھی بھول نہیں پایا۔ اس دن صبح صبح میری بیوی نے بے حد گھبرائے ہوئے مجھے جگایا تھا،

''دیکھیے پتا جی بول نہیں رہے ہیں''، یکبارگی ایک کپکپی سارے جسم میں دوڑ گئی۔ آخر وہ نامراد وقت آ ہی گیا۔ میں پلک جھپکتے ان کے کمرے میں پہنچا، وہ کمرے میں بے حس و حرکت لیٹے تھے، چہرہ بغل والے تخت پر بیٹھی ماں کی طرف تھا۔ جن کا بایاں حصّہ کچھ مہینے پہلے لقوے کا شکار ہوگیا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں مُنہ بھی تھوڑا کھلا تھا، شاید ماں سے کچھ کہنا چاہتے تھے شاید یہی ''میں تو چلا، اپنا خیال رکھنا'' میں نے فوراً ان کا سر اپنی گود میں لے لیا تھا، پتا جی کیا ہوا؟ کچھ تو بولیے، مگر وہ کچھ نہیں بولے تھے، ایک چھوٹی سی ہچکی کے سوا۔ سب ختم ہو چکا تھا، میں بھونچکا تھا جب کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا حالانکہ یہ اپنے میں بڑی سفاکی اور بڑی شرمناک بات ہے، لیکن پچھلے لگ بھگ ساڑھے تین برس سے میں اپنے پتا کی موت کی اس دل ہلا دینے والی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا، ان کے دائیں گردے پر گوشت کا ایک کافی بڑا لوتھڑا تھا جسے ڈاکٹر نے کینسر بتایا تھا۔ دل کے تین والوز گڑبڑ تھے۔ گال بلیڈر میں پتھری تھی، گٹھیا کے پینتیس برس سے مریض تھے، P.G.I. سے انھیں لا علاج کہہ کر ڈسچارج کیا گیا تھا اور بتایا تھا کہ موت کسی بھی وقت اچانک آ سکتی ہے، پتا جی کو اس بات کا سخت افسوس تھا کہ ان کا آپریشن نہیں ہوسکا تھا۔ اس سچ کو جاننے کے بعد بھی کہ آپریشن ٹیبل پر موت ہونے کے خاصے امکانات تھے مگر وہ موت سے آر پار کی لڑائی کا پورا ارادہ کر چکے تھے۔ وہ بڑے مایوس گھر لوٹے تھے۔ مجھ سے پوچھا تھا مجھے ڈاکٹروں نے اور زندہ رہنے کا

کتنا وقت طے کیا ہے۔ میں کیا جواب دیتا، کئی بار ٹالا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہی ہے۔ مگر وہ میرے مُنہ سے ہی سننا چاہتے تھے، سب کچھ صاف صاف، آخر ہار کر بتانا ہی پڑا تھا۔ ''کینسر اور ہارٹ پرابلم... ڈھائی تین مہینے بتائے ہیں ڈاکٹر نے'' یہ سن کر ان کا مایوس چہرہ اور بھی مایوس ہوگیا تھا۔ کوئی پتا اپنے بارے میں اپنے بیٹے سے یہ سن کر اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ مجھے بے حد کوفت ہوئی تھی کہ میں نے کیوں بتایا۔ یہ صدمہ وہ برداشت نہیں کر پائیں گے مگر دوسرے پل ان کے چہرے پر پرانی رونق، پی جی آئی (Post graduate institute of medical sciences) جانے سے پہلے والی لوٹ آئی ''ٹھیک ہے جتنا بھی وقت ہے کافی ہے، انجوائے کیا جائے، کچھ دن کینسر کے ساتھ بتانے کا تجربہ بھی حاصل کیا جائے اور واقعی انھوں نے بہت انجوائے کیا، ایک ایک پل کو نئے انداز سے گزارا ایک مقامی ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا علاج شروع کیا، ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہومیو پیتھک دواؤں کا جادو تھا یا زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش اور مضبوط قوت ارادی کہ انھوں نے ڈھائی تین مہینے کے بجائے لگ بھگ ساڑھے تین برس بغیر کسی بڑے جھٹکے کے گزارے۔ اس وقت کو انھوں نے دوسری اننگ کی طرح کھیلا اور خوب کھیلا، ڈھیر ساری کہانیاں لکھیں ایک ناول 'چاچی کا ڈھابا' لکھا، خورشید ملک صاحب نے ان کے خطوط کو کتاب کی شکل دی 'قند مکرر' جو پچھلے پچاس برس سے انھیں اردو اور ہندی کے تمام ادیبوں، شاعروں اور

نقادوں نے لکھے تھے اور جنھیں انھوں نے ایک خزانے کی طرح احتیاط سے رکھا تھا، اسی طرح ہما جمال رضوی صاحبہ نے ان کی پچاس برس کی ڈائری کا مجموعہ 'رام لعل کے شب و روز' شائع کی۔ ڈھیر سارے انعامات بھی ملے۔ مگر سب سے یادگار تھا 'کھیرؤ' کے لیے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کا ملنا۔

ساہتیہ اکادی انعام کی خواہش ہر چھوٹے بڑے ادیب کو ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں بھی تھی کیونکہ جب کبھی ان انعامات کا اعلان ہوتا تھا تو ان میں ایسے ایسے نام ہوتے تھے جن کی اردو ادب میں زیادہ خدمات نہیں ہوتی تھیں، یا کم سے کم میرے پتا جی سے کم ہوتی تھیں۔ میں اکثر حیران اور جذباتی ہو کر پوچھتا کہ ''آپ کو کیوں نہیں ملا'' چہرے پر کچھ پل کے لیے مایوسی چھا جاتی تھی... غصہ بھی ہوتا کہتے تھے ''اس لیے کہ میں ہندو ہوں مسلمان نہیں۔'' مگر کچھ پل بعد ہی پرسکون بھی ہو جاتے تھے، کہتے تھے کہ میں ایوارڈ کا بھوکا نہیں ہوں اردو دنیا میں ہندو ہونے کی وجہ سے بہت سارے انعاموں سے محروم بھلے ہی رکھا گیا ہوں مگر پایا اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انھیں بے پناہ شہرت اور لوگوں کا پیار ملا، کوئی سویڈن میں تھا تو کوئی پاکستان میں، کوئی ناروے میں تو کوئی امریکہ میں، کہاں کہاں سے خط نہیں آتے تھے۔ سب سے بڑی چیز تھی کہ انھیں بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی اردو میں لکھ کر... وہ اردو کے اتنے بڑے حمایتی تھے کہ کہتے تھے کہ ''اردو کے لیے جان بھی دینی پڑے تو پیچھے نہیں ہٹوں گا'' پی جی آئی سے لوٹ کر انھوں نے زندگی کو اردو کے لیے وقف کر دیا تھا۔

جب انھیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا تھا تو بہت خوش تھے مگر انھیں تھوڑی تکلیف بھی تھی۔ دراصل انھیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ شاید یہ ایوارڈ انھیں اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔ اصلیت کیا تھی یہ تو ایوارڈ دینے والے ہی جانتے ہیں مگر اس کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ مشہور ہندی ادیب کنھیا لعل نندن جی کے اس طنز سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایوارڈ لینے کے بعد پتا جی اور ہم پریوار کے لوگ بنگالی مارکیٹ رکے تھے۔ وہیں نندن جی کی منڈلی سے ملاقات ہوگئی تھی۔ انھوں نے پتا جی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا، ''رام لعل جی آپ خوش قسمت ہیں کہ ستر سال کی عمر میں پرسکار پا گئے یہاں ہندی میں تو اسّی برس تک انتظار کرنا پڑتا ہے، ہر ادب کے لیکھک کی تراسدی (المیہ) ہے کہ اس قسم کے انعام زندگی کے آخری پڑاؤ کے پاس پہنچ کر ہی ملتے ہیں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ پتا جی کو اردو نے بہت شہرت دلائی۔ ان کے کچھ نقاد دوستوں کا خیال ہے کہ وہ شہرت پسند تھے۔ اشتہاریت پسند تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ شہرت نے خود ان کے قدم چومے جس کے وہ حقدار بھی تھے، ان کو اس زبان سے بے پناہ محبت تھی، انھیں یہ بات سخت ناپسند تھی اور بہت غصہ آتا جب کوئی یہ کہتا کہ اردو ایک فرقے کی زبان ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں اکثر کے Brain wane آتی تھی کہ جس میں اردو زبان کو زندہ رکھنے ایسی تمام پروگرام اور اسکیمیں شامل ہوتی تھیں، جس سے ثابت ہو سکے کہ اردو کسی ایک فرقے کی زبان نہیں، ہندوستانی عوام کی زبان ہے، غیر مسلم اردو رائٹرس کانفرنس اسی Brain wane کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے پہلی کانفرنس 1973 اور دوسری 1981 میں منعقد کی تھی۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ محض تماشہ تھا۔ بہت سی بحثیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں لکھنے والے چھوٹے ہی سہی مگر سیکڑوں اردو ادیب پورے ہندوستان سے سرکار سے یہ مانگ کرنے کے لیے لکھنؤ میں جمع ہوئے تھے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے..... اس کانفرنس کی زبردست مخالفت بھی ہوئی تھی۔

ان کانفرنسوں کے نتیجے میں اتنے اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ اردو کا رتبہ بڑھانے اور اسے واجب مقام دلانے کا اہم اور اصل مقصد پیچھے چلا گیا تھا۔ پہلی کانفرنس میں مشہور شاعر رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری کا ایک بیان بحث کا موضوع بن گیا۔ ان کے بیان کو بہت توڑا مروڑا گیا تھا، ہندی والوں نے سمجھا تھا کہ فراق صاحب انھیں گنوار کہہ رہے تھے۔ جب کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فراق صاحب کا مطلب یہ تھا کہ جو ہندی والے ٹھیک سے ہندی نہیں بولتے ہیں وہ انھیں گنوار لگتے ہیں۔ پتا جی نے بہتیری کوششیں کی تھیں ہندی والوں کو سمجھانے کی مگر ناکام رہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جان بوجھ کر سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

ان کانفرنسوں کے علاوہ بھی پتا جی نے اردو کے لیے کئی مہم چلائیں۔ 1985 میں ایک رابطہ کمیٹی قائم کی۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب کے ساتھ پورے صوبے کا دورہ کیا۔ عوام تک گئے۔ 1991 میں اردو کے لیے جیل بھی گئے مگر تمام کوششوں کے باوجود اردو کی ترقی نہ ہوتے دیکھ کر وہ رنجیدہ ہوتے اور حیران بھی ان کی تمنا تھی کہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی اسکولوں اور کالجوں میں لازمی طور پر پڑھائی جائے۔ اسے روٹی روزی کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ سرکاری نوکریوں میں اردو جاننے والے کو چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ہو ترجیح دی جائے مگر ایسا ہو نہیں پایا۔ پتا جی لوگوں کو یہ سمجھانے میں ناکام رہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، اس دن میں ان کے بے جان جسم کے پاس بیٹھا تھا تو ان کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی، بالکل تازہ دم تھے۔ چہرے پر چمک تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ موت اپنا قہر برپا کر چکی ہے۔ انھوں نے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ جتنی تکلیفیں سہی تھیں اس سے زیادہ خوشیاں بھی ملی تھیں۔ اپنے قلم کی بدولت کئی بار دنیا گھومی تھی۔ کل ملا کر دیکھا جائے تو وہ ایک بہت کامیاب انسان کی طرح دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا وہ اردو کی لڑائی ہار چکے تھے، میں خود ان کی ہار کی سب سے بڑی مثال ہوں، تمام لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ رام لعل اتنے بڑے ادیب اور ان کے بیٹے کو اردو نہیں آتی۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ پتا جی پر یہ سوال کئی بار داغا گیا تھا۔ ان کا ہر بار جواب ہوتا تھا میرے بیٹے سے پوچھیے، لیکن کسی نے مجھ سے نہ پوچھا، آج رام لعل صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں یہ سوال اندر ہی اندر چبھ رہا ہے کہ ان کی ناکامیابی کی سب سے بڑی مثال میں کیوں ہوں۔ لہٰذا خود ہی جواب دے رہا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مجھے اردو زبان اچھی نہیں لگتی تھی۔ یا میں سیکھنا نہیں چاہتا تھا، یا پتا جی مجھے سکھانا نہیں چاہتے تھے... یہ ایک المیہ یا سچائی ہے کہ میں نے جب ہوش سنبھالا تو گھر میں مفلسی کا عالم تھا۔ آئے دن

ادبی محفلیں سجتی تھیں۔ خوب کھانا پینا ہوتا تھا مگر سب قرض چلتا تھا۔ مہینوں قرض نہ چکا پانے کی وجہ سے کبھی کبھی دکاندار ادھار دینے سے منع کر دیتا تھا تو اڑوس پڑوس سے آٹا دال ادھار لینا پڑتا تھا۔ ہم بیمار پڑتے تو علاج بھی ڈاکٹر سے ادھار پر ہوتا تھا، مفلسی کی وجہ سے ہمیں اچھے اسکولوں میں تعلیم بھی نہیں ملی، میونسپلٹی کے اسکولوں میں پڑھے لیکن اس کے باوجود ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں خوشی ہوتی تھی کہ ان کی تخلیق کاری میں ہم بھی حصّے دار ہیں اگر انھوں نے گھر گرہستی کی طرف دھیان دیا ہوتا تو اردو کی خدمت کیسے کرتے۔ مجھے 1960 کے آس پاس کا وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ پتا جی تنخواہ لے کر گھر آئے تھے۔ ہم بڑی بے صبری سے ان کا انتظار کر رہے تھے کہ آج ڈھیر ساری چیزیں آئیں گی اور اچھا کھانا پکے گا۔ ہر پہلی تاریخ کو یہی ہوتا تھا مگر اس دن پیچھے پیچھے وہ دکاندار بھی آیا تھا جس سے کئی مہینوں سے راشن ادھار آ رہا تھا۔ اس نے ساری تنخواہ ان کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی تھی۔ یہ منظر میرے دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ میری زندگی کی ترجیحات میں سب سے اوپر یہی بات تھی کہ میں جلدی سے بڑا ہو جاؤں اور ڈھیر ساری دولت کما کر گھر کی مفلسی دور کروں۔ میں نے رات کو چوری چھپے لفافے بنائے۔ ایک بار سینما کے ٹکٹ بھی بلیک کیے۔ ممیرے بھائی کی اسکوٹر پارٹس کی دوکان پر کام کیا۔ ایک پندرہ روزہ اخبار 'سجیلا' میں پنڈت اشونی کمار دیویدی کا معاون رہا۔ انھیں کے ساتھ ایک ادبی رسالے ''کاتائینی'' میں بھی کام کیا، ہندی کے اخباروں اور رسائل میں مضامین لکھے۔ اس سے گھر کی مفلسی تو دور نہیں ہوئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ اپنے کالج کی فیس اور جیب خرچ میں خود کمانے لگا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ میں ایک سیلف میڈ آدمی بننے کا شوق پیدا ہوا، بالکل اپنے پتا جی کی طرح، وہ مکمل طور پر سیلف میڈ آدمی تھے، مجھے اچھی یاد ہے کہ 1969 میں مجھے سوتنتر بھارت میں ایک مضمون کا سات روپیہ معاوضہ ملا تھا۔ یہ میری پہلی کمائی تھی۔ میں بے حد خوش ہوا تھا۔ اس کی یاد آتے ہی میں آج بھی خوش ہو جاتا ہوں۔ اتنی خوشی تو مجھے نوکری ملنے اور پھر افسر بننے پر بھی نہیں ہوئی۔ یہ میری پہلی کمائی تھی جو قلم سے ملی تھی۔ بہرحال جب میں نے اپنے قلم کی پہلی کمائی پتا جی کے قدموں میں رکھی تھی تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اور کہا تھا کہ مجھے تو کئی برس لکھنے کے بعد محنتانہ ملا تھا۔ ویسے بھی اردو کے بہت کم ماہنامے اجرت دیتے تھے، شمع اور بیسویں صدی سے ہی کچھ ملتا تھا اگرچہ پتا جی

اردو میں ہی لکھتے تھے مگر وہ ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے ان کی کہانیاں جتنی اردو میں پسند کی جاتی تھیں اتنی ہی ہندی میں بھی۔ ان دنوں نہاریکا، مایا، ساریکا، ارون کہانی، نئی کہانی وغیرہ ہندی کے اہم رسائل تھے۔ بچوں کی من موہن، راجہ بھیا، بالک اور پراگ بھی تھیں۔ ان میں بھی

مجھے 1960 کے آس پاس کا وہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ پتا جی تنخواہ لے کر گھر آئے تھے۔ ہم بڑی بے صبری سے ان کا انتظار کررہے تھے کہ آج ڈھیر ساری چیزیں آئیں گی اور اچھا کھانا پکے گا۔ ہر پہلی تاریخ کو یہی ہوتا تھا مگر اس دن پیچھے پیچھے وہ دکاندار بھی آیا تھا جس سے کئی مہینوں سے راشن ادھار آرہا تھا۔ اس نے ساری تنخواہ ان کے ہاتھ سے تقریباً چھین لی تھی۔

پتا جی کسی کسی میں لکھتے تھے۔ بچوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا اور تا عمر رہا۔ میں نے اپنے بیٹی بیٹے سے جتنا پیار کیا پتا جی نے ان سے اس سے کہیں زیادہ پیار کیا۔ پتا جی کو بچوں کی ہم سے زیادہ فکر رہتی تھی۔ وہ ہم لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ہمارے بیچ سے ہی کہانی نکال کر لکھتے تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں گھر کے کچھ خرچ ہندی میں شائع ہونے والی کہانیوں سے ملنے والی رقم سے چلتے تھے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں بڑی بے صبری سے اس کا انتظار بھی رہتا تھا۔ کیونکہ ہمیں اس دن سینما دیکھنے اور بازار گھومنے کا موقع بھی ملتا تھا۔

کل ملا کر میری اور پتا جی کی اوّلیت میں فرق تھا۔ سماجی، معاشی اور سیاسی اولیت، وقت اور صورت حال بھی الگ الگ تھی اور فوقیت طے کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ یوں بھی ہر شخص کو اپنی زندگی اپنی طرح جینے کا پورا حق ہے، مجھے بھی یہ حق حاصل تھا۔ میں نے اپنا اچھا یا برا آشیانہ خود بنایا اس میں پتا جی نے کوئی دخل نہیں دیا۔ لیکن مجھے حیرت ہے اور خوشی بھی ہے کہ جو کام میں نہیں کر پایا میرا بیٹا اسے پورا کرنے کی طرف قدم بڑھا چکا ہے۔ پچھلی 15 اگست کو سب بچوں نے بورڈ پر آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر جملے لکھے تھے۔ مگر میرے بیٹے نے سب بچوں سے مختلف اپنا جملہ اردو میں لکھا تھا۔ میرا بھارت مہان، میرا پیارا ہندوستان۔ پتا جی زندہ ہوتے تو اپنے پوتے کی اس بات پر یقیناً فدا ہو جاتے۔

بہرحال پڑھنا اور لکھنا مجھے اپنے پتا جی سے ورثے میں ملا۔ کرکٹ سے جنون کی حد تک لگاؤ بھی انھیں سے ملا۔ میں آج بھی وہ نظارہ بھول نہیں پایا ہوں جب 1959 میں کانپور ٹسٹ میں ہندوستان نے آسٹریلیا کو ہرایا تھا۔ جسو پٹیل نے اس میں ایک انگ میں 9 وکٹ اور میچ میں کل 14 وکٹ لیے تھے۔ تب ہمارے گھر میں ریڈیو نہیں تھا ہم عالم باغ میں رہتے تھے، چوراہے پر ایک سندھی کا ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے ایک نیم کا پیڑ تھا۔ ہوٹل والا اسی پر ریڈیو رکھ دیتا تھا اور لوگوں کا ہجوم اس کے اردگرد کھڑے ہو کر بڑے شوق سے کمنٹری سنتا تھا میں بھی اپنے پتا جی کی انگلی پکڑ کر کمنٹری سنتا تھا۔ انگریزی کی کمنٹری پلّے نہیں پڑتی تھی۔ تب پتا جی اس کا ترجمہ مجھے سمجھاتے تھے اور ساتھ ہی کھیل کی باریکیاں بھی۔ اس دن بھارت کی جیت پر سب بہت خوش تھے۔ لوگ پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ پتا جی بھی ان میں شامل تھے۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ لیکن خوشی کے اصلی معنی مجھے تب پتہ چلے جب پتا جی سائیکل پر بٹھا کر مجھے حضرت گنج لے گئے تھے ایک فلم دکھائی اور پھر لوٹتے ہوئے ایک ڈھابے پر مجھے عمدہ گوشت کھلایا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن کرکٹ میری رگ رگ میں اس طرح سمایا کہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا

تصور ہی نہیں کرسکتا ہوں۔ چھوٹا قد اور ذرائع کی تنگی کی وجہ سے میں محلے کی سطح سے اوپر کرکٹ کبھی کھیل نہیں پایا مگر میں نے کرکٹ پڑھا، خوب ایک تماشائی کی طرح۔ لکھا بھی خوب زندگی کو دَم دار بنانے کے لیے۔ میں نے کرکٹ کی ڈھیروں کتابیں خریدیں، ہوسکتا ہے کہ میں نے یہ سب کتابیں نہ پڑھی ہوں مگر پتاجی نے خوب پڑھیں۔ بلکہ کئی بار مجھے مشورہ دیتے تھے کہ فلاں کتاب کا فلاں چیپٹر ضرور پڑھ لینا۔ انھیں کھلاڑیوں کی سوانح حیات بہت پسند تھیں۔ شاید اپنی کہانیوں کے کچھ کردار تراشنے یا تلاش کرنے میں انھیں مدد ملتی تھی۔ میں نے بہت سے کرکٹ میچ ان کے ساتھ دیکھے۔

ایک بار 1960 میں وہ مجھے امرتسر اپنے ساتھ لے گئے تھے، پاکستان اور ایسٹ پنجاب کا میچ دکھانے کے لیے۔ 64-1963 میں انگلینڈ کے خلاف میچ دکھانے مجھے کانپور لے گئے۔ فاروق انجینئر کا پہلا ٹسٹ تھا وہ۔ امریگر کی سنچری اور انگلینڈ کو فالو آن ملا تھا۔ ٹی وی سے چپک کر کرکٹ میچ دیکھنا ان کا پسندیدہ شغل تھا۔ شام کو جب میں لوٹ کر گھر آتا تو دن بھر کی تفصیل مجھے ان سے مل جاتی تھی۔ مگر اب ان کے بغیر سب بے جان لگتا ہے، ٹی وی میچ دیکھنا اور خاص کر جب بھارت جیتتا ہے۔

پتاجی نے اردو کے علاوہ ہندی میں لکھا تو صرف پیسے کمانے کی غرض سے نہیں دراصل ہندی میں لکھنے کی اصلیت یہ تھی کہ وہ اپنے تخلیقی جذبے کو عوام تک پہنچانا چاہتے تھے انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے ان رسائل میں بھی لکھا جو پیسہ دینے کی حالت میں قطعی نہیں ہوتے تھے۔ ہاں وہ ہندی اردو کے بعض ایڈیٹروں سے یہ ضرور پوچھتے تھے کہ رسالے کے بجٹ میں اس شخص کا نام کیوں نہیں ہوتا جس کی مدد سے صفحے بھرے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انھیں جتنی شہرت اور بلندی اردو میں لکھ کر حاصل ہوئی، ہندی میں نہیں، ہندی والے ہمیشہ انھیں اردو کا ادیب مانتے رہے۔ یہ صحیح بھی ہے وہ اردو میں ہی سوچتے اور لکھتے تھے۔ بعد میں ہندی میں مگر اس کے باوجود انھیں ہندی والوں نے بہت عزت دی۔ مجھے فخر ہے اور دعویٰ بھی کہ پتاجی کسی بھی محلے میں رہے ہوں ایک ہمارا ہی گھر ایسا رہا جہاں ہندی اور اردو دونوں کے ادیب بڑی تعداد میں تشریف لاتے رہے۔ فراق گورکھپوری، بھگوتی چرن ورما، یش پال، امرت لعل ناگر، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، قرۃ العین حیدر، منظور الامین، علی عباس حسینی، اندیور، خواجہ احمد عباس، شری لعل شکل، ڈاکٹر بشیشر پردیپ، رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ستیش بترا، داکٹر گیان چند جین، ویرراجہ، کامتاناتھ، رتن سنگھ، عابد سہیل، کے پی سکسینہ، لیلا دھر جگوڑی، ویرندر یادو، شکیل صدیقی، ڈاکٹر صبیحہ انور، راکیش، عائشہ سلام صدیقی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، سلمان عباسی وغیرہ تمام ہندی اردو کے ادیبوں سے ہمارا گھر روشن رہا... دراصل پتاجی ہندی اردو کے بیچ ہمیشہ ایک پل کا کام انجام دیتے رہے، اب ان کے نہ رہنے سے یقیناً یہ پل ڈھ گیا۔ اب کوئی نہیں آتا ہے، ہاں ان کے دوست اچھن میاں کبھی کبھی فون پر حال چال پوچھ لیتے ہیں، ڈاکٹر بشیشر پردیپ بھی کبھی آجاتے ہیں اور دیر تک بیٹھتے ہیں، پہلے کی طرح اس امید پر کہ رام لعل صاحب ٹہل کر ابھی لوٹتے ہی ہوں گے، ہمارضوی بھی انتظار کرکے لوٹ جاتی ہیں۔

پچھلی 15اگست کو سب بچوں نے بورڈ پر آزادی کی پچاسویں سالگرہ پرجملے لکھے تھے۔ مگرمیرے بیٹے نے سب بچوں سے مختلف اپنا جملہ اردو میں لکھا تھا۔ میرا بھارت مہان، میرا پیارا ہندوستان۔ پتا جی زندہ ہوتے تو اپنے پوتے کی اس بات پر یقینا فدا ہوجاتے۔

پتاجی نے اردو کو بہت کچھ دیا اور باوجود اس سچ کے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن کمی ہو رہی تھی، انھوں نے اردو میں لکھنا کبھی کم نہیں کیا بلکہ زیادہ ہی لکھا یہ بھی سچ ہے کہ اردو نے بھی انھیں بہت کچھ دیا، ڈھیر سی شہرت اور نیک نامی جو کم ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے ہندو ہوتے ہوئے بھی اردو میں اتنا لکھنا بڑے جگر کی بات ہے، یہ ان کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا جسے انھوں نے خوشی سے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اسے بخوبی انجام بھی دیا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ جتنی فکر انھوں نے اردو کے لیے کی اتنی ان لوگوں نے نہیں کی جو اردو کو ایک فرقے کی زبان سمجھتے تھے اور جسے کسی دوسرے فرقے کے شخص کی اتنی فکر اور دلچسپی گوارا نہیں تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ شہرت کی جن بلندیوں پر وہ پہنچے اس میں اردو کے علاوہ ان کی شخصیت کا بھی ہاتھ تھا۔ نجی زندگی میں انھیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر انھوں نے اپنی شخصیت کو کبھی بکھرنے نہیں دیا۔ ہمیشہ زندگی سے بھرپور رہے خوشیوں بھرے قہقہے لگاتے رہے۔ کینسر اور دل کی بیماری کے ساتھ انھوں نے جس بہادری سے زندگی گزاری اور موت کو ساڑھے تین سال تک اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ وہ ان کی زندہ دل شخصیت اور زندہ رہنے کی بھرپور خواہش کا نتیجہ تھا اور سچ مچ موت آئی بھی تو دبے پاؤں۔ وہ ایسی ہی موت کے خواہش مند تھے۔ موت سے کچھ مہینے پہلے سوتنتر بھارت کو دیے گئے ایک انٹرویو میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کس قسم کی موت چاہیں گے، تو ان کا جواب تھا، ''ہارٹ فیل تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو'' اور سچ مچ ان کی خواہش کے مطابق ان کی موت ہوئی، بہر حال ایسی موت یقیناً صرف سنتوں کو حاصل ہوتی ہے یہ کہنے کا مطلب ہر گز نہیں کہ وہ کوئی سنت تھے، ان میں بھی تمام انسانی کمزوریاں تھیں، بے حد جذباتی تھے اور پوری طرح ناستک۔ شراب بھی پیتے تھے اور چین اسموکر بھی تھے، مگر کینسر کا سامنا کرنے کے لیے انھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ مرغ کے بے حد شوقین تھے، خواہ بعد میں دوا کھانی پڑے۔ ہمیشہ ٹپ ٹاپ رہنا پسند کرتے۔ ان کے وارڈ روب میں آج بھی درجنوں سوٹ ٹنگے ہیں۔ وہ ہر کامیابی کا جشن مناتے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے ان سے زیادہ لگاؤ تھا، یا انھیں مجھ سے۔ مگر یہ طے تھا کہ وہ میرے معاملے میں بہت زیادہ جذباتی تھے۔ مجھے ذرا سا سردی زکام بھی ہوجاتا تو اپنے پاس سلاتے تھے، راتوں کو اٹھ کر مجھے ٹٹولتے تھے۔ میں کئی بار جھنجھلا جاتا کہ معمولی بیماری ہے دو تین دن میں چلی جائے گی۔ آج یاد آتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہوں، دراصل یہ ایک باپ کی اپنے بیٹے کے لیے محبت تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اکثر رات رات بھر پڑھتے اور لکھتے تھے، میں اپنے کمرے میں پڑھتا لکھتا رہتا، کمرے کی لائٹ دیکھ کر مجھے آواز دیتے کہ ''ونود ایک کپ چائے مجھے بھی دینا۔'' میں اپنے اور ان کے لیے چائے بناتا پھر ہم دونوں دیر تک سیاسی، سماجی موضوعات پر دیر تک باتیں کرتے بحث کرتے۔ مگر آج کچھ بھی نہیں۔ مجھے آج بھی رات بھر نیند نہیں آتی ہے، میں ان کے کمرے میں جاکر ان کی تصویر کے سامنے بیٹھ جاتا ہوں۔ ان کے کمرے میں آج بھی کتابیں بھری ہیں۔ ان کی تمام ٹرافیاں اور ایوارڈس رکھے ہیں۔ بس اگر کچھ نہیں ہے تو ان کی موجودگی، ادبی بحثیں، قہقہے، لطیفے، ہر طرف گہرا سناٹا ہے مگر جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے، سنائی دیتا ہے، ایسے میں آنکھیں کھولنے کو دل نہیں چاہتا۔

■

Sabeeha Anwar, Nami Press Building
Nakhas, Lucknow - 3

محمد طیب شمس

ذوق کا نظریہ تعلیم

ذوق کا نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوق تخلص ہے۔ 1789 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ محمد رمضان غریب سپاہی تھے۔ ذوق شاہ نصیر کے شاگرد اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور جدید نظم کے بانی محمد حسین آزاد کے استاد تھے۔ 1837 میں جب شہزادہ ظفر کے سر پر تاج رکھے گئے تو ذوق استاد شاہ کہلانے لگے۔ انھیں خاقانی ہند، ملک الشعرا اور خان بہادر جیسے خطاب سے نوازہ گیا۔ غالب اور مومن کے ہم عصر ہوئے اور اردو قصیدہ میں سودا کے بعد دوسرے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ذوق کی شاعری کو سودا اور غالب کی شاعری کے ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے مگر انھوں نے اپنی شاعری میں جس طرح عشق و محبت کے افسانے اور ذہنی تعیش پرستی کے سامان بہم پہنچائے ہیں اس سے کہیں زیادہ اپنی شاعری میں قوم وملت کے اخلاقی اور علمی پہلو کو اجاگر کیا ہے اور حیات و کائنات کے راز جاننے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں علم نجوم، علم طب، علم نفسیات، علم منطق و فلسفہ، سماجیات، عمرانیات، تصوف و موسیقی جیسے فنون سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیا ہے۔

ذوق کی شخصیت ان کی شاعری کی طرح علم و عمل کا نمونہ تھی۔ ان کی شہرت اور عزت ان کی کسی خاندانی وجاہت، برتری اور بلندی کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ اپنے علم وفضل، محنت و مشقت، حلم و بردباری کی بنیاد پر تھی۔ دربار سے وابستہ رہے مگر درباداری نہیں آئی۔ فخر ومباہات سے پرہیز کیا۔ دنیاوی شان وشوکت ہوتے ہوئے سادگی اور اجنبی پن کو ترجیح دی۔ اعلیٰ رہائش کو ترک کر کے معمولی مکان میں رہنے پر قانع ہوئے۔ بقول فریمین یہ کسی بھی شخصیت کا بڑا وطیرہ ہے:

''ایک نقادفن یا محقق کیسا ہی دقیقہ سنج اور نکتہ رس دماغ رکھتا ہوا گر اس کا کردار بلند نہیں تو جیسا فریمین نے لکھا ہے کچھ بھی نہیں۔'' (قاضی عبدالودود، کلیات حسرت موہانی، ص85)، 68 سال کی عمر میں 1854 میں دہلی میں علم وعمل کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔

ذوق کا دور پرآشوب دور تھا۔ مغل سلطنت کا آخری چراغ بجھنے کو تھا۔ حکومت کی ساری باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایسے ناموافق حالات میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ علم وعمل ہی ایسا ہتھیار ہے جس سے کائنات کی تسخیر کی جاسکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقعے پر اٹھارہ زبانوں میں اٹھارہ شعر لکھ کر ملک الشعرا کے علاوہ سلطان الشعرا کا خطاب بھی حاصل کیا۔ ذوق نے زندگی کو گزارنے کے لیے بہترین اصول پیش کیا ہے کہ یہ زندگی قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ اس کو خوشی خوشی، مشکلات، سے سامنا کرتے ہوئے اور لطف لیتے ہوئے بسر کرنا ہے۔ دیکھیے یہ شعر:

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کائنات میں والدین کے ساتھ سب سے بڑا رشتہ استاد اور شاگردی کا رشتہ ہے۔ یہ ایک مقدس رشتہ ہے۔ کوئی بھی شاگرد اچھا اور باہنر استاد ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک وہ اپنے اساتذۂ کرام کی عزت اور قدر نہ کرے۔ ذوق نے اپنی شاعری میں استاد کی قدر و منزلت کو نہایت پاکیزہ، صاف، شائستہ انداز میں بیان کیا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

دنیا کے تمام ماہر تعلیم کی طرح ذوق نے بھی انسانیت ہیومنزم کو تعلیم کا اعلیٰ مقصد بیان کیا ہے اور اس علم کو بیکار اور بے بنیاد بتایا جس میں قول وعمل میں یکسانیت نہ ہو:

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا توتے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا

علم وعمل کا مسلمہ اصول ہے کہ آہستہ آہستہ ادنی سے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی چیز، کوئی بھی کام چاہے وہ کتنا ہی حقیر اور کمتر کیوں نہ ہو اس کی قدر و قیمت ہرگز کم تر نہیں ہے:

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

علم و ہنر سے جب کوئی بڑی منزل حاصل کرتا ہے تو انھیں ہر طرح کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے اور مصائب پر صبر کرتے ہوئے اپنی ذمے داریوں کو بخوبی انجام دینا چاہیے:

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

انسان کی فطرت ہے وہ ہمیشہ ترقی کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ترقی کی بنیاد اگر ہوس پرستی پر رکھی گئی ہو تو اس کا انجام بہت خطرناک ہوتا ہے اور اگر اس کی بنیاد عشق پرستی پر قائم ہو تو انسان اپنی منزل کو حاصل کرتا ہے اور ان میں صبر و رضا، انکساری اور عاجزی کی کیفیت آجاتی ہے۔ ساری چیزوں میں خدا کی نشانی موجود پاتا ہے جب انسان اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ مقام پر فائز ہوجاتا ہے۔ دنیا کے عظیم ماہر تعلیم کی طرح ذوق نے بھی تعلیم کو روح کا تزکیہ کرنا اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بتایا ہے۔

ذوق ایک ماہر تعلیم ہی تھے کہ انھوں نے وقت کو سب سے قیمتی چیز قرار دیا ہے کیونکہ وقت ہی وہ چیز ہے جو گزر جانے کے بعد پھر کسی بھی قیمت میں دوبارہ لوٹ نہیں سکتی۔ وقت کی اہمیت کو انھوں نے عشقیہ انداز میں بتایا ہے:

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

دنیا فانی ہے یہاں کسی بھی انسان کو ہمیشہ خوشی میسر نہیں ہوسکتی ہے۔ کبھی خوشی تو کبھی غم، کبھی جیت تو کبھی ہار، کبھی صحت یاب تو کبھی ناساز، کبھی گرمی تو کبھی سردی، کبھی دن تو کبھی رات۔ کوئی اچھا تو کوئی برا، کوئی امیر تو کوئی غریب کوئی آقا تو کوئی غلام، کوئی ظالم تو کوئی مظلوم کوئی استاد تو کوئی شاگرد یہی اس کار جہاں کی فطرت ہے۔ غم کے مقابلے انسان کو خوشی کم ہی میسر ہوتی ہے کیونکہ غم اور فراق ہی اس دنیا اصلیت ہے۔

ذوق نے انسانی حیات کے تمام گوشے کو انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ اس حیثیت سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف وہ ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ماہر تعلیم بھی تھے۔

□

Md. Taiyab Shams, Research Scholar RUR, Sector II, HEC Building, 8 N O 274, Dhurwa Ranchi - (Jharkhand)

انتخابِ کلامِ ذوق

نالہ اِس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

دے دعا وادیِ پرخار جنوں کو ہرگام
داد یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارہ تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا

پنجۂ مہر کو بھی خونِ شفق میں ہر صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

روشِ اشک گرا دیں گے نظر سے اک دن
ہے اِن آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

کون گھر آئینہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جاروب صفائی دیتا

ساغرِ مے بھی ترے کشتۂ انداز کو یار
بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر انھیں آکے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل لوٹتا ہے تم نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوق تیرا آہ گر مارا تو کیا مارا

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اِدھر دیکھو!
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کر شراب و کباب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری
ہیں یہ چشمِ پُرآب کی باتیں

مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

تجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں

جاو ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

جامِ مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

نہ سمجھو دشت، شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغِ قاتل کو
لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا مرا خوں اُس نے اپنے کوچہ میں
اُسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمھاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سن کے کیا سمجھو

تمھیں ہے نام سے کیا کام مثلِ آئینہ
جو روبرو ہو اُسے صورت آشنا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

○

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لاشراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھاتا گریہ ہے گر سوز دل کو آب تو دے
اور آگ میں یونہی دینا ہے گر عذاب تو دے

نشے میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دلِ شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

جواب نامہ نہیں گر تو رکھ دو نامۂ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ حباب تو دے

بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوزِ جگر
بجھا پر ان کی ذرا آتشِ عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشتِ خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اِک بار آگ و آب تو دے

کرے گا قتل وہ اے ذوق تجھ کو سرمہ سے
نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہوں گا سرِ منزل فنا اے ذوق
مثال نقش قدم کرنے پا تراب تو دے

○

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

زال دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر
مرد دیندار کو بھی دہریہ کردیتی ہے

تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھ کو
تہمت اُس زلفِ سیہ فام پہ دھر دیتی ہے

رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گزری
کیا طباشیر سفیدیِ سحر دیتی ہے

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا
اب تو اکسیر بھی دیجیے تو ضرر دیتی ہے

غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے
چٹخنا منہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے

شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

نخل مژگاں سے ہے کیا جانئے کیا چشم ثمر
چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے

کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجریں پر
نالۂ دل کا جواب آہِ جگر دیتی ہے

کوئی غماز نہیں میری طرف سے اے ذوق
کان اُس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

○

مزہ تھا ہم کو جو لیلیٰ سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکر بے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمر گزشتہ کا لیجیے گر ذوق
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

○

چھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تاب رخِ سیم تن میں ہے
پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھیے کس کس کے نام سے
اِس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

وہ دل کہ لانہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب
زیرِ شکنجہ زلفِ شکن در شکن میں ہے

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزہ
بھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق
دیکھیں سہیل کیونکہ چمکتا یمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا درد سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

○

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

میری حقیقتِ پُردرد کو کوئی اُس سے
بہ آہ و نالہ نہ کہوے بہ چشمِ تر تو کہے

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

بقدر مایہ نہیں گر ہر اک کا رتبہ و نام
بھلا حباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے

جو چپ لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

بھرے گا بارِ محبت کی کیا فلک حامی
یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے

بلا سے ہووے مرا مرغ نامہ بر بھونرا
کہ اس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو کہے

سرشک چشم مرے ہیں کہ ہوگئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

○

لائی حیات، آئے-قضا لے، چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اِس بساط پر ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا ذوق و شوق
سن کر فغان قیس بجائے حدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

○

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جب تک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمھاری سب غش ہیں ہم سے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی و سب سنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے
گالی کے ساتھ اُس نے ایک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہے گا کچھ کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں مجھے تو اے بے خودی سنائی

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی آدھی کبھی سنائی

صورت دکھائے اپنی دیکھیں وہ کس طرح سے
آواز بھی نہ جس نے ہم کو کبھی سنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا پھر اس نے ہم کو کھوٹی کھری سنائی

○

چشمِ قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچے میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے

خاکساری ہے عجب وصف کہ جوں جوں ہو سوا
ہو صفا اور دلِ اہلِ صفا یاد رہے

ہو یہ لبیکِ حرم یا بہ اذانِ مسجد
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ
دیکھیے کب تک انھیں میری خطا یاد رہے

○

برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی
کچھ جو خاکستر بچا آندھی اُڑا کر لے گئی

اس کے قدموں تک نہ بیتابی بڑھا کر لے گئی
ہائے دوپلٹے دیے اور پھر ہٹا کر لے گئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہمیں دم بھر کے بعد
بدگمانی ان کے گھر سو گھر پھرا کر لے گئی

واہ اے سوزِ دروں کوچہ میں اس کے برق آہ
رات ہم کو ہر قدم مشعل دکھا کر لے گئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا
کیا کہوں تقدیر اسے کیونکر اٹھا کر لے گئی

دشتِ وحشت میں بگولا تھا کہ دیوانہ ترا
روح مجنوں بہر استقبال آکر لے گئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو
آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لے گئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ
دل اڑا کر لے گئی یا پر لگا کر لے گئی

ذوق مرجانے کا تو اپنے کوئی موقع نہ تھا
کوئے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لے گئی

○

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں ہونٹھ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری
شکوہ کیا کیجے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پاؤں کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارۂ مصحفِ دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آتے پاؤں کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آکے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزنِ در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گہہ گھٹاتا ہے گہے مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شبِ ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں اک نالہ سے میں حشر میں برپا سو حشر
شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

تھے تہی نکلے جو اُس دامِ بلا سے اے ذوق
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آئے تو سہی

○

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

سامنے چشمِ گہربار کے کہہ دو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اُتر جائیں گے

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں پھر اور ٹھہر جائیں گے

خالی اے چارہ گرو ہوں گے بہت مرہم داں
پر نہیں زخم مرے ایسے کہ بھر جائیں گے

لائے جو مست ہیں تربت پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائیں گے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملّا
ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

○

دل بچے کیونکر بتوں کی چشمِ شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سیکڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی آ کہ تو واقف نہیں
اس دلِ بیتاب و جانِ مضطرب کے ڈھنگ سے

بل بے باریکی کہ گویا ہر ترا تارِ سخن
جنتری میں کھنچ کے نکلے ہے دہانِ تنگ سے

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغِ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھے گا کہاں تو ہم سے اے رنگیں ادا
ہوگا تو جس رنگ میں مل جائیں گے اُس رنگ سے

جوشِ گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اس کی تیغِ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نمازِ عشق میں
دل سے کہہ دیجے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہوگئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریشِ سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی مئے گلرنگ سے

■

ماخذ: کلیاتِ ذوق

ملا رموزی

خفیہ بیوی

یہ بیوی ہندستان کی حیاتِ اجتماعی، ان کی دولت، ان کے اخلاق اوران کے بین الاقوامی وقار اور اعزاز کے لیے نہایت درجہ ذلت انگیز اور برباد کرنے والی ہے۔ یہ ماں باپ سے پیدا ہونے کے بعد جن مقامات اور جن حالات سے بیوی بنتی ہے وہ یہ ہیں۔

مکانات کے برامدے، کوٹھے، اٹاریاں، ٹھنڈی سڑک، پارک، اسکول آتے جاتے، خطوط، ناول، تھیٹر، سنیما، غزلوں، ادبی رسالوں کے افسانوں، پھر افلاس، ماں باپ کی دولت مندی سے آزادی اور کبھی کبھی طبعی افتاد اور لالچ سے۔

اس کا شوہر بھی بدترین اخلاق اور ذلیل تر ذہنیت کا انسان ہوتا ہے، اسی لیے وہ اس بیوی کے لیے حقوق شکنی، قانون شکنی اور مذہب شکنی تک پر آمادہ ہوکر چوری سینہ زوری، اغوا، قتل اور کبھی کبھی 'قتلِ عام' سے بھی باز نہیں رہتا اور ''رات کے وقت لے بھاگنے کی مشق'' تو بہت خاصی ہوتی ہے اور اسی لیے یہ سب سے پہلے خاندان، پھر محلے اور پھر پولس والوں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے اور مصیبت بن جاتی ہے۔

زیادہ مقدار میں اس کا شوہر کنوارا نہیں بلکہ بیوی والا ہوتا ہے۔ یہ بغیر منگنی کے ایک دم پوری بیوی بن جاتی ہے۔ اس کے باضابطہ نکاح میں صرف ملا رموزی اور اس کے شوہر کا ایک دوست شریک ہوسکتا ہے تاکہ قانوناً 'دوگواہ' کہے جاسکیں۔ نکاح سے پہلے یہ اور اس کا شوہر جس درجہ مشکلات اور جانی اور مالی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے، نکاح کے بعد یہ مصیبتیں گزر جاتی ہیں۔ اب یہ شوہر نہ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔ چنانچہ سب سے پہلا عذاب جو اس کے شوہر پر مسلط ہوتا ہے وہ یہ کہ اب یہ اس لیے بے حیا بیوی کے لیے اپنے محلے سے دور ایک مکان کرایے پر لیتا ہے اور اس گھر میں عام انسانی ضروریات کے اوزار عرف سامان فراہم کرتا ہے۔ ایک ڈیڑھ ملازم یا ملازمہ رکھتا ہے، دن بھر اس گھر سے غائب رہتا ہے، مگر اس کا دل اسی گھر کے دروازے پر پڑا رہتا ہے، اس ڈر سے کہ ''کہیں موقع پاکر بھاگ نہ جائے'' وہ نوکری کرتا ہے مگر دماغ اسی الجھن سے تباہ ہوتا رہتا ہے کہ ''کہیں بھاگ نہ جائے''۔

وہ رات کو اس گھر میں آتا ہے مگر اس طرح کہ ہر قدم پر ڈرتا ہے، لرزتا، کانپتا ہے، جھجکتا ہے، کہ کہیں محلے والے مارے جوتوں کے میرا سر پراٹھا نہ کردیں، کہیں ملا رموزی صاحب کو خبر نہ ہوجائے، کہیں پولس والے میرا تعاقب نہ کررہے ہوں۔

یہی حال اس بیوی کا ہوتا ہے کہ وہ دن بھر شوہر سے جدا رہنے اور تنہائی کے اوقات میں ادنیٰ سی آواز اور حرکت سے کانپ جاتی ہے کہ کہیں میرے والد کو میرا پتہ نہ چل گیا ہو، کہیں بھائی نہ آگیا ہو، کہیں پولس والے نہ آگئے ہوں اور کہیں ملا رموزی صاحب نے میرے والد سے جاکر نہ کہہ دیا ہو کہ وہ تمھاری بیٹی فلاں گھر میں موجود ہے۔ اِن خطرات کے بعد وہ تنہائی میں اس اُلجھن سے گھٹتی رہتی ہے کہ:

- ہے شیطان تو نے کیسی میری مٹی پلید کی۔
- مجھے موت کیوں نہ آگئی کہ میں نے اپنے خاندان کی آبرو اس کمبخت ملا رموزی کے لیے برباد کردی اور اب یہ ملا رموزی یقیناً میرا ساتھ چھوڑ دے گا، لعنت ہے میرے اوپر۔
- اے خدا تو اب مجھے موت دے دے۔
- اور اے خدا تو اس ملا رموزی کو غارت کردے جس نے مجھے میرے گھر سے نکالا اور اب مجھے پوچھتا نہیں اور اپنے بیوی بچے میں خوش ہے یا کبھی تھا کہ میری خوشامدیں کرتا پھرتا تھا۔
- اچھا تو اب مجھے یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہیے۔
- نہیں نہیں میں بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں، اس لیے مجھے خموشی سے زہر کھا کر مرجانا چاہیے۔

ان دونوں کو اس عذاب میں مبتلا سن کر اس کے شوہر کی پہلی بیوی جو دعا کرتی رہتی ہے وہ یوں ہوتی ہے:

- اے خدا تو اُس بدذات سے میرے شوہر کو بچا۔
- اے خدا تو اس بے حیا کو موت دے۔
- اے خدا تو اس پر اپنا قہر نازل فرما جس نے میرے شوہر کو مجھ سے اور میری اولاد سے جدا کیا۔

عین اسی حالت میں اگر سابق بیوی کے پاس کوئی عورت چلی جائے تو اس سے یہ بیوی جو گفتگو کرتی ہے وہ یوں ہوتی ہے کہ:

- آہ! بہن کیا کہوں تم سے کہ کیوں بیمار ہو رہی ہوں۔
- اور بیمار کیسی بہن اب تو دعا کرو کہ خدا مجھ کمبخت کو جلد ایمان سے اٹھالے۔
- تو کیا تمھیں خبر نہیں بہن کہ وہ یعنی (شوہر) کب سے مجھ سے علاحدہ ہوچکے ہیں۔
- آہ بہن آج پورے تین سال ہوتے ہیں کہ انھوں

نے ایک خفیہ نکاح کرلیا ہے اور مجھ دُکھیاری کی صورت سے بے زار ہیں۔ وہ تو یہ بچوں کا واسطہ اور کچھ اپنے باپ کا ڈر ہے کہ دن میں گھنٹے سوا گھنٹے کو آجاتے ہیں، سوا ایسے بدحواس کہ بات کرو کہیں کی اور جواب ملے کہیں کا اور مجھ سے تو وہ اُسی وقت سے بات چیت بند کرچکے ہیں جب سے وہ پری اُن کے نکاح میں آئی ہے۔

- کون؟
- اے بہن وہی جو تمھارے مکان کے سامنے والے پکّے مکان میں رہتے ہیں، ان کی منجھلی بیٹی۔
- ہاں رہنے والی تو یہاں کی نہیں مگر اس کے ماں باپ کو آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔
- خیر بہن میں تو اب چلی قبر میں مگر غم ہے تو ان بے قصور بچوں کا کیونکہ وہ تو اپنے ہوش میں نہیں ہیں اور خدا کی قسم بہن اگر تم آج کل ان کا چہرہ دیکھو گی تو کبھی نہ پہچانو گی کہ یہ ملّا رموزی ہیں تو وہ تو دن رات اُسی غم میں گھلے جارہے ہیں۔
- اے خدا تمھیں اجر دے گا بہن، اگر تم ملّا رموزی صاحب سے مجھے کوئی تعویذ لادو گی۔
- مگر بہن آج کل تو نہ کوئی تعویذ کام دیتا نہ میری دعا ہی قبول ہوتی۔
- خیر تمھارا کہنا بھی پورا کرتی ہوں، خدا اسی سے انھیں راہِ راست پر لے آئے۔
- تو لو یہ پانچ روپیہ اور اللہ کی قسم بہن میں نے تو خفیہ طور پر انھی تعویذ گنڈوں میں اپنا تمام زیور پھنسا دیا مگر کروں کیا کہ ایک چیز کا بھی تو اثر نہیں ہوتا۔ خدا جانے اس بدذات نے کون سا جادو کیا ہے ان پر کہ وہ ہیں کہ جب پڑھتے ہیں تو اسی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔
- خیر تو اب یہ بتاؤ کہ یہ تعویذ تم کب تک لاؤ گی۔
- اور دیکھو، بہن میری طرف سے تم ملّا رموزی صاحب سے ہاتھ جوڑ کر کہہ دینا کہ ملّا صاحب خدا نے آپ کو دین کا بزرگ بنایا ہے اور یہ ایک نیک کام ہے، اگر اللہ نے آپ کے تعویذ سے ان کو سیدھا کردیا تو میں عمر بھر آپ کی لونڈی بن کر رہوں گی۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کبھی کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ چیز خلافِ دین اور جاہلوں کو لوٹنے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ پہلی بیوی اپنے شوہر کے غم میں اب اس قدر بیمار ہوتی ہے کہ بالآخر وہ مرجاتی ہے یا دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اس خفیہ بیوی کی اطلاع پاتے ہی پہلی بیوی اپنے میکے میں چلی جاتی ہے اور اس کے ماں باپ اور بھائی وغیرہ اس کے خفیہ بیوی والے شوہر پر عدالت میں اس عنوان سے مقدمہ چلاتے ہیں کہ:

- نمبر ایک یہ کہ ملّا رموزی صاحب اپنی بیوی کو دن کے دو بجے سے عصر کی نماز کے بعد تک مارتے ہیں۔
- نمبر دو یہ کہ یہ ملّا رموزی مدعا علیہ اپنی بیوی کو کپڑے نہیں دیتے۔
- نمبر تین یہ کہ ملّا رموزی مدعا علیہ اپنے بچوں کو پاس تک نہیں آنے دیتے اور نہ اپنی بیوی سے بات کرتے ہیں۔
- نمبر چار یہ کہ ملّا رموزی مہینوں گھر میں قدم نہیں رکھتے اور یہ سب کچھ اس لیے کہ اس ملّا رموزی مدعا علیہ نے ایک خفیہ نکاح کرلیا ہے اور اگر عدالت معائنہ کرے تو ہم بتاسکتے ہیں کہ ملّا رموزی کی یہ خفیہ بیوی وہ سنیما کے سامنے والے مکان میں رہتی ہے اس لیے۔
- نمبر پانچ یہ کہ عدالت ہماری لڑکی کا مبلغ بیس ہزار روپیہ مہر ملّا رموزی کی ذات اور جائیداد سے دلا کر ہماری

لڑکی کے طلاق کی کارروائی عمل میں لائے اور ہاں صرفہ مقدمہ بھی ملّا رموزی کی تنخواہ سے دلائے۔

اس کے بعد یہ خفیہ بیوی والے ملّا رموزی صاحب یا عدالت میں ذریعہ سمن، وارنٹ گرفتاری یا پھر ذریعہ وکیل تشریف لے جاتے ہیں جہاں ان دونوں کے رشتے کا یوں اظہار ہوتا ہے۔

- کیا تم فلاں کی فلاں لڑکی کے شوہر ہو؟
- اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ اس لڑکی سے تمھارا نکاح کب ہوا؟
- کہاں ہوا؟
- کس وقت ہوا؟
- کس کے سامنے ہوا؟
- کس طرح ہوا؟
- کس کے کہنے سے ہوا؟
- اچھا جس وقت یہ نکاح ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا یا ہونے کے قریب تھا یا بس ہونے ہی والا تھا یا ہونے ہی کو تھا یا بالکل ہو رہا تھا تو اس وقت تمھارا منہ کس طرف تھا اور تم کس رنگ کے کپڑے پہنے تھے اور تمھارے منہ میں یا منہ کے کسی حصے میں پان بھی تھا یا نہیں یا اگر منہ میں پان تھا تو اس میں الائچی بھی تھی یا نہیں اور اگر الائچی تھی تو اسے کس دکان سے خریدا تھا اور خریدتے وقت اس دکان پر کوئی اور گاہک بھی تھا یا نہیں اور یہ کہ تم الائچی کب سے کھانا سیکھے اور کس کے کہے سے کھانا سیکھے، تم نے نکاح سے پہلے کبھی الائچی کھائی تھی؟
- اچھا تو یہ بتاؤ کہ جب تمھارا نکاح اس خفیہ لڑکی سے ہوا اس وقت تم اپنی پہلی بیوی اور اپنے خاندان والوں سے اپنے ذمہ کے حقوق معاف کرا چکے تھے یا نہیں؟
- اور بتاؤ کہ جب ایک بیوی اور اس کے چند بچے پہلے سے موجود تھے تو تم نے اس خفیہ بیوی سے کیوں نکاح کیا؟
- اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس خفیہ نکاح کی تحریک لڑکی نے کس رنگ کے لفافے کے ذریعہ کی تھی اور یہ لفافہ اس نے کس جھروکے سے باہر پھینکا تھا۔
- اور تم اس لفافے کا جواب دینے شب کے کتنے بج کر کتنے منٹ پر اس خفیہ لڑکی کے مکان کے قریب پہنچے تھے۔
- اور اس وقت اس خفیہ لڑکی کی ملازمہ کو کس قسم کی آواز دے کر تم نے لفافہ لے جانے کو بلایا تھا؟
- اچھا مانا کہ خفیہ لڑکی اپنی ملازمہ کے ذریعے تمھیں خط بھیجا کرتی تھی اور تم ملازمہ کو روپیہ دیتے تھے۔
- تو یہ بتاؤ کہ کبھی اس ملازمہ نے تمھیں یہ دھمکی کیوں نہ دی کہ دیکھو اگر آئندہ تم کوئی خط ہماری بیگم صاحبہ کے نام لے کر آؤ گے تو ہم تمھارا خط بیگم صاحبہ کے والد کے سیدھے ہاتھ میں دے دیں گے۔ اچھا یہ بھی مانا کہ آج کل گھر کی خدمت گار عورتیں جاہل اور مفلس ہوتی ہیں اس لیے وہ لالچ میں آکر ایسے کام کرتی رہتی ہیں اس لیے عدالت کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ہمیشہ ماما، دایا اور ملازمہ سے علاحدہ رکھے، مگر تم یہ بتاؤ کہ تم نے اتنے بڑے کے بیٹے ہوکر اس خفیہ لڑکی کے خط کو اپنے حلقے کے داروغہ یا کوتوال کو کیوں نہیں دے دیا تاکہ وہ اس کے باوا کو بلا کر بتادیتے کہ:
- ابے او اُلّو دیکھ تو میرے حلقے کا گو بہت بڑا آدمی ہے مگر اندھے دیکھ یہ تیری لکھی پڑھی لڑکی نے ملّا رموزی صاحب کے لڑکے کو کیسا خط لکھا ہے، بس اگر آئندہ تو نے اپنی بے حیائی اور عیش پسندی سے اپنی اولاد سے بھی غفلت برتی تو پھر یہ حوالات کی تنگ و تاریک کوٹھری ہوگی، اتنا بڑا آدمی اولاد کا تیری یہ حال ہے بے غیرت

بس جا اگر آئندہ تیری بیٹی نے گھر میں ہارمونیم باجہ بجایا ہے تو مزا چکھاؤں گا تجھ کو۔

- ہاں ہاں بے حیا یہ باجہ بجانے ہی سے لکھی پڑھی لڑکی میں آوارگی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دیکھ کبھی تو نے ملّا رموزی صاحب کے گھر سے بھی باجے کی آواز سنی؟

- اور سن اگر اب تو نے کبھی شادی سے پہلے اپنی لڑکی کو پمپ جوتا پہنایا ہے تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا اور اسی دن تیرا چالان کردوں گا بے غیرت۔ ابے ہاں! ہم کہتے ہیں تجھ سے کہ جوانی کے عالم میں لڑکی کو نہایت سادہ، میلا اور ادنیٰ قسم کا لباس پہنانا چاہیے، بس زبان بند کر۔ تو کیا جانے انسانی خواص کے ان نازک نکتوں کو۔ اچھا تو اگر تم نے اس خفیہ لڑکی کے خط کو حلقے کے کوتوال کو نہیں دیا تھا تو پھر تمھیں یہ اندیشہ کیوں نہ پیدا ہوا کہ وہ جو میری پہلی بیوی گھر میں تین معصوم بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے اس کے مصارف اور حقوق میں فرق نہ آئے گا۔ اچھا تو اگر تم نے اپنی اس مدعیہ بیوی کو ملّا رموزی صاحب کے ذریعہ اطلاع دے دی تھی کہ اب میں فلاں صاحب کی خفیہ لڑکی سے شادی کررہا ہوں تو کیا تم ملّا رموزی صاحب کو شہادت کے لیے حاضرِ عدالت کرسکتے ہو؟ اب اگر آپ نے کہہ دیا کہ ہاں تو بس پھر آپ کی بیوی کے اس جھگڑے کو تمام دنیا میں شہرت دینے کے لیے ملّا رموزی کے نام اس قسم کا حکم آجائے گا کہ:

''عدالت کے پاس امر کے باور کرنے کے لیے بے شمار وجوہ موجود ہیں کہ تم بمقدمہ مسماۃ فلاں بنت فلاں بنام مسمّی فلاں ابن فلاں کے خفیہ نکاح اور اس کی تفصیلات کو اس درجہ کھول کھول کر بیان کرسکتے ہو کہ جواب نہیں لہٰذا تم کو ذریعۂ ہٰذا پابند کیا جاتا ہے کہ تم مورخہ ایک اپریل 1931 بوقت 12 بجے دن کے حاضرِ عدالت ہوکر بیان دو اور جو تم نے اس معاملہ میں کسی حیلے یا بہانے سے کام لیا تو حسبِ دفعۂ فلاں، قانون فلاں، مجریہ فلاں، نمبری فلاں، ضمیمہ ایکٹ فلاں کی دفعہ فلاں ترمیم شدہ ضابطہ فلاں، تعزیرات فلاں بابتہ سنہ فلاں بہ منظوری گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل تمھارے مقابل کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ آج ہمارے حکم اور مہر عدالت سے جاری ہوا۔

دستخط بخط انگریزی حاکمِ عدالت ضلع فلاں، بلدۂ فلاں اور شہر فلاں''۔

اس کے بعد جو ملّا رموزی صاحب گواہی کے لیے پہنچے تو ایک بے لکھے پڑھے چپراسی نے چلا کر کہا اور تین مرتبہ کہا کہ:

- ملّا رموزی گواہ حاضر ہے؟
- ملّا رموزی گواہ حاضر ہے؟
- ملّا رموزی گواہ حاضر ہے؟

اب جو ملّا رموزی صاحب اجلاس پر پہنچے تو ایک طرف سے آواز آئی کہ کہو کہ میں جو کچھ بیان کروں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر اور بہ اقرارِ صالح۔ اس کے بعد عدالت نے سوالات شروع کیے:

- کیا آپ مسماۃ فلاں مدعیہ کو جانتے ہیں؟ اور کیا آپ مسمّی فلاں ابن فلاں بی۔ اے پاس کو بھی جانتے ہیں جو اس مقدمہ میں مدعا علیہ ہیں۔

- اچھا تو بتایئے کہ ان بی۔ اے پاس مدعا علیہ نے اپنی حقیقی بیوی کو چھوڑ کر اُس خفیہ لڑکی سے خفیہ نکاح کیا۔ تو آپ اس نکاح میں خود شریک تھے یا کسی سے سنا تھا؟

- آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ جو خفیہ نکاح ہورہا ہے

اس میں اس خفیہ لڑکی نے محض اپنے دولت مند عیش پسند اور بڑے گھرانے کے ماں باپ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر یہ آوارگی اختیار کی؟

- اچھا کیا آپ کو یاد ہے کہ وہ 1918 میں جرمنی کی لڑائی ہوئی تھی، اس وقت مدعا علیہ کہاں ملازم تھا؟

- اور وہ جو 1857 کے غدر میں ایک لڑکی شہر بریلی سے بھاگ گئی تھی، اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟ ہاں اندازے سے بتایئے، گھبرایئے نہیں۔

- اچھا ملّا صاحب یہ جو آپ مضامین لکھتے ہیں تو ان کا معاوضہ آپ نے 1929 میں کتنا پایا تھا اور 1930 میں کتنا؟

- اور اچھا ملّا صاحب یہ بتایئے کہ لوگ باگ آپ کے مضامین پڑھتے وقت تو مارے خوشی اور لطف کے آپ کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور جب روپیہ سے امداد کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی لوگ بے وقوف، بھولے، ناواقف اور گدھے کیوں ہوجاتے ہیں اور آپ کی نقد امداد سے کیوں منہ موڑ لیتے ہیں یا پھیر لیتے ہیں اور پھیر لیتی ہیں؟

- اچھا تو جب مدعا علیہ نے اس خفیہ لڑکی سے نکاح کیا تو آپ نے خود دیکھا تھا کہ اس خفیہ لڑکی کے والد صاحب اور بھائی صاحب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور انھیں غیرت کا پسینہ نہ پیشانی پر آیا نہ بغل کے اندر؟

- اچھا ملّا صاحب گھبرایئے نہیں اور یہ تو بتایئے کہ آپ نے مدعا علیہ سے جب یہ کہا تھا کہ دیکھو احمق اس خفیہ نکاح سے تو اور تیرا خاندان دنیا میں عمر بھر ذلیل رہے گا تو اس وقت مدعا علیہ کے پاس کوئی اور شخص بھی موجود تھا؟

غرض اس قسم کے مقدمہ کا فیصلہ دو تین سال میں یہ ہوا کہ:

''روداد مثل سے ثابت ہے کہ مدعیہ مدعا علیہ کی پہلی بیوی ہے اور اسے مدعا علیہ کے خفیہ نکاح کرلینے سے جو صدمہ ہوا ہے اس سے اسے دق کا مرض ہوچکا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے منسلکہ مثل سرٹیفکیٹ سے ثابت ہے اور ڈاکٹر صاحب کو عدالت خود جنگ بلقان کے زمانے سے جانتی ہے اور جیسا کہ ملّا رموزی صاحب گواہ نمبر ایک کے بیان سے ثابت ہے اور عدالت خود ملّا رموزی صاحب کو جانتی ہے کہ تمام دولت مند لوگ ملّا صاحب کے مضامین سے خوش ہوتے ہیں مگر انھیں نقد روپیہ دینے میں ہمیشہ گھبراتے ہیں، لہٰذا عدالت کے نزدیک ثبوت کافی ہے اس لیے حکم ہوا کہ مدعا علیہ اگر اپنی خفیہ بیوی کے پاس رہنا چاہتا ہے تو رہے، مگر اپنی پہلی بیوی کا مہر تعدادی مبلغ بیس ہزار روپیہ اپنی اور اپنے والد صاحب کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ سے نصف اس وقت ادا کرے اور نصف ملّا رموزی صاحب کو دے دے تاکہ وہ اس روپے سے ایک دارالاشاعت قائم کرکے زبانِ اردو میں بہترین اور لطیف کتابیں لکھ کر قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں۔ خرچہ فریقین ذمہ فریقین۔

مدعیہ اور وکیل مدعیہ کی اطلاع یابی لکھالی جائے۔

آج میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری ہوا''۔

اس عام رسوائی اور ذلّت کے بعد یہ بیوی ایک مرتبہ آپ کے نکاح سے بھی ''بھاگ جاتی ہے''۔ نکاح سے بھاگ جانے کا یہ مطلب ہے کہ خفیہ نکاح والوں میں 'دائمی اتحاد' کی وجہ باقی نہیں رہتی، محض اس لیے کہ ابتدا میں کسی خاص جذبے کے تحت دونوں مشتعل ہوتے ہیں اور اسی اشتعال کے تحت ایک دوسرا تمام نقصانات اور ذلّتوں کو برداشت کرکے رشتہ پیدا کرتا ہے لیکن اس رشتے

کے پیدا کرنے سے پہلے دونوں زیادہ نقصانات برداشت کرچکے ہوتے ہیں، اس لیے اب جو نکاح سے سکون حاصل ہوا تو اب پچھلی خطائیں اور نقصانات یاد آکر اس حاصل شدہ سکون کو برباد کرتے رہتے ہیں، اس لیے کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس بیوی کو شوہر صاحب ہی پہلے راستہ بتاتے ہیں اور پھر اپنے پرانے بیوی بچوں سے جا ملتے ہیں اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ خفیہ بیوی صاحبہ کسی دوسرے ملّا رموزی صاحب کے ساتھ پنجاب میل کے ذریعہ بمبئی اور اگر موقع مل جائے تو ولایت تک بھاگ جاتی ہیں اور یہ 'فرار مکرر' کی قوت ان کے اندر اس لیے پیدا ہوجاتی ہے کہ 'فرار اول' کے وقت ان کے نادیدہ شوہر نے ان کے لیے جو اسبابِ عیش فراہم کیے تھے زمانہ گزر جانے پر اب اس رنگ کے اسباب فراہم نہیں ہوسکتے۔ دوسرے اس لیے بھی یہ فرار عمل میں آتا ہے کہ اپنے گھر سے بھاگتے وقت مزاج اور غیرت میں جو ضعف اور ذلت پیدا ہوجاتی ہے وہ اب کسی دوسرے فرار سے نادم نہیں ہونے دیتی، اس لیے ایسی بیوی کے لیے سنا ہے کہ عمر بھر اس کے نئے نئے نکاحوں کا سلسلہ ہی ختم نہیں ہوتا۔

اس قسم کی بیوی سے شوہر کی ذہنی قوتیں برباد ہوتی رہتی ہیں اور اسی لیے ان میں خوشگوار کی جگہ پچھلی خطاؤں کی یاد ان کے ہر عیش کو برباد کرتی رہتی ہے۔

اس کی اولاد بھی بے حد بزدل، کمینہ صفات، بے حیا اور ذلیل اعمال اولاد ہوا کرتی ہے اور خصوصاً شوہر اس کی اولاد کی تربیت اور پرورش پر کبھی اُس جوش سے متوجہ نہیں ہوتا جس جوش سے وہ اپنی پہلی اولاد کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

البتہ اگر 'بھاگنے والی' اونچے اور شائستہ گھرانے کی ہے تو وہ اپنی پہلی خطا کے حجاب سے اس شوہر کے حق میں بے حد وفادار، جاں نثار، منتظم اور اولاد کی پرورش میں بھی بے حد سلیقہ مند ہوتی ہے مگر کمی کے ساتھ۔

اس قسم کی بیوی کے لیے یہ امر نہایت درجہ ضروری ہے کہ یا بیوی اعلیٰ درجے کے گھرانے کی بھاگی ہوئی ہوگی، یا شوہر صاحب اعلیٰ گھرانے سے بھاگنے والے ہوں گے کیونکہ ایسے مشاہدات کم ہیں جب کہ ایک فاقہ کش لڑکی ایک فاقہ کش مزدور کے ساتھ بھاگی بھی ہو اور بیوی بن کر عمر بھر بڑی لیاقت سے بیٹھی بھی رہی ہو۔

یہ بڑھاپے میں بڑی پارسا، بڑی عبادت گزار اور بڑی نیک ہوجاتی ہے۔ امورِ خانہ داری سے خاصی واقف اور زیادہ مقدار میں لکھی پڑھی۔

فی الجملہ اس کی مجموعی تعداد دوسری بیویوں سے کسی طرح کم نہیں۔ البتہ اس کی صحیح تعداد جو ظاہر نہیں ہوتی وہ اس لیے کہ اس کا ہر معاملہ خفیہ ہی رہتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگرچہ نکاح اس کو شرعاً معزز و ممتاز بنا دیتا ہے، مگر اخلاقاً ہمارے ننھے میاں کی والدہ کی قسم کی عورتیں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی ہیں، اس لیے خدا اس سے بچائے۔ آمین!

اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ کبھی کبھی جب یہ بیوی بننے کے شوق میں گھر سے فرار ہوتی ہے تو اس کے رشتے داروں کی 'رپٹ' لکھانے پر یہ کوتوالی میں اس طرح بھی نظر آتی ہے کہ ایک موٹے سے کوتوال صاحب جمائیاں لیتے جاتے ہیں اور اس سے کہتے جاتے ہیں:

- اری ادھر کو ذرا۔
- کھول منہ اپنا تا کہ تجھے پہچانوں۔
- ہے تجھ پر خدا کی مار۔
- اری کمبخت آخر یہ کیا کیا تو نے؟
- تو تجھے شرم نہ آئی اس حرکت سے؟
- آہ کس کی بیٹی ہے اور کہاں نکلی ہے۔
- اری مرجا کمبخت اس بے حیا زندگی سے۔
- کھولو جی داروغہ جی اس کا صندوق، دیکھوں کہ کیا کیا چیزیں لے کر بھاگی ہے۔
- اچھا بند کیجیے اسے حوالات میں صبح کو اس کا بیان لوں گا میں۔
- اور ہاں داروغہ جی ذرا سویرے ہی اس کے باوا کو بلا لینا حلقہ نمبر چار سے۔
- ہاں ہاں جی وہی تیس مار خاں صاحب جن کی یہ صاحبزادی ہیں۔
- لعنت ہے ایسے تیس مار خاں پر۔
- اری ہاں سن تو ذرا میری بات۔
- ادھر آ ادھر۔
- دیکھ یہ تو بتا کہ تو اب بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے یا نہیں؟
- ہاں ہاں ٹھیک ہے بدذات تو اب کاہے کو واپس جائے گی۔
- اچھا داروغہ جی اس کا بیان تو ابھی لے لو آپ اور صبح کو اس کے باوا کا بیان ہوجائے گا۔
- ہاں تو بتا تیرا پورا نام۔
- اچھا تو جب ملّا رموزی تجھے بھگانے گیا ہے تو اس کے ساتھ تو دروازے سے نکلی تھی یا دیوار پھاند کر بھاگی؟
- ذرا زور سے جواب دے ورنہ طمانچہ دوں گا اُلٹے ہاتھ کا تو منہ سے خون ڈالے گی ابھی بدمعاش کہیں کی۔
- اور جب نہ غیرت آئی جب گھر سے بھاگی تھی تو؟
- اور ہاں ذرا ادھر آؤ میاں ملّا رموزی صاحب۔
- کیوں جناب یہ آپ نے کیا حرکت کی؟
- ہاں ہاں سچ کہتے ہو آپ۔
- یہی بدمعاش ہے۔
- اجی وہ تو میں کہوں نا کہ مجھے اس کوتوالی میں آئے ہوئے یہ گیارہواں برس ہے۔ مجھے تو اس گھر کی سب کیفیت معلوم ہے۔ وہ آج سے چند سال پہلے اس بدذات کی خالہ بھی تو بھاگی تھی اسی طرح۔
- کیوں جی داروغہ جی صاحب یاد ہے آپ کو وہ جب ہم آپ اسے ریل گاڑی سے اتار کر لائے تھے اسٹیشن سے؟

اِن حالات پر فیصلہ کیجیے کہ یہ بیوی شوہر کے حق میں کتنی مفید ہوسکتی ہے؟ فقط۔

■

ماخذ: کلیاتِ ملا رموزی (جلد اوّل-حصہ دوم)، مرتب: خالد محمود، سنہ اشاعت: 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فاروق ارگلی

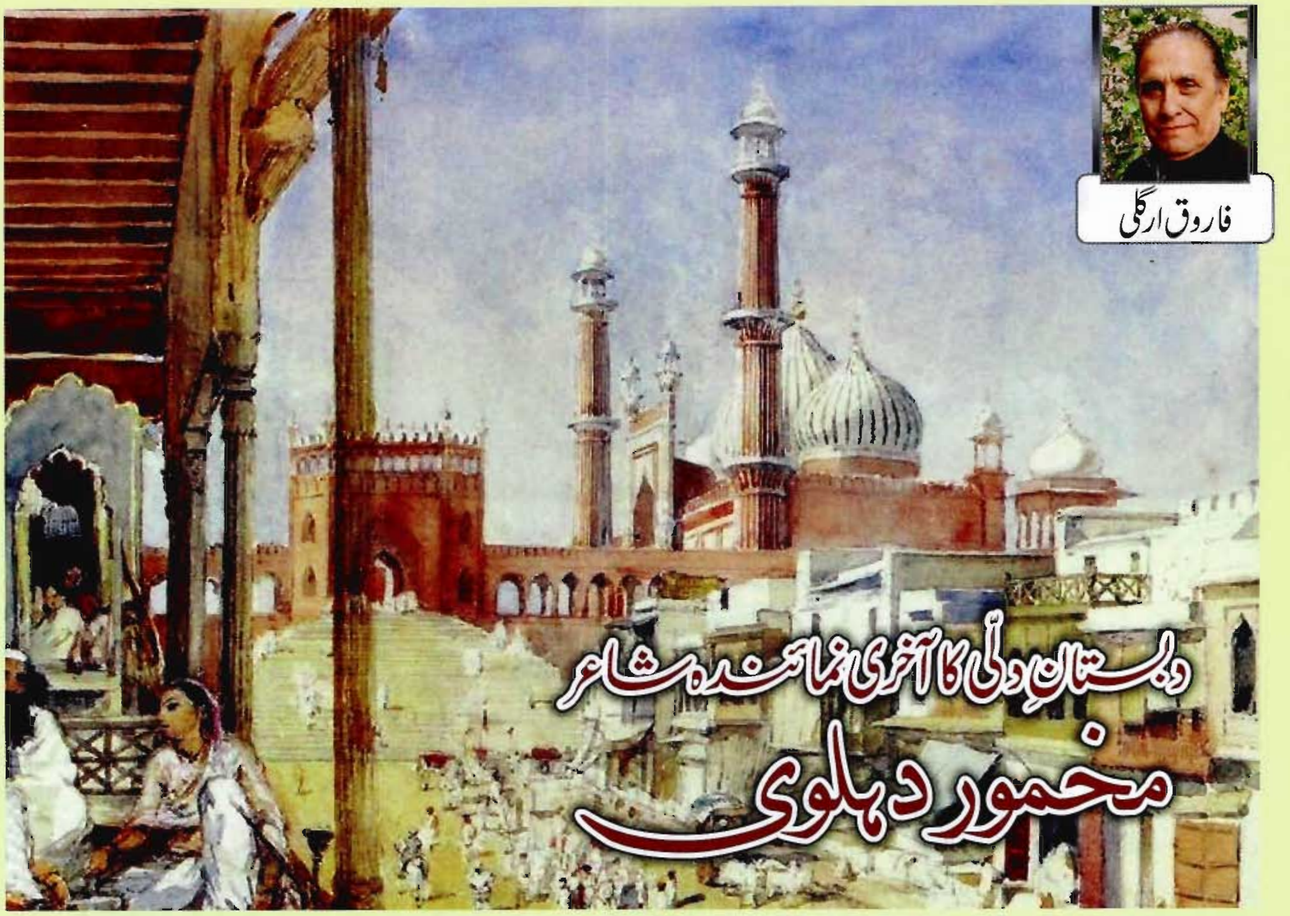

دبستانِ دلّی کا آخری نمائندہ شاعر

مخمور دہلوی

فانی، جگر مرادآبادی، حسرت اور جوش وفراق جیسے قادرالکلام سخنوروں کے عہد میں دبستانِ دہلی کی فضاؤں سے ایک سنجیدہ، تہہ دار، کرب انگیز اور حقیقت آمیز روحانی آواز نوکلاسیکی غزل کی تمام تر صباحتوں، ملاحتوں، سلاستوں، فصاحتوں اور بلاغتوں کے ساتھ ابھری اور اردو ادب و تہذیب کی تاریخ میں دائمی نقوش ثبت کر گئی۔ ملک کی تقسیم کے بعد چار پانچ برسوں میں برصغیر کے بڑے بڑے مشاعروں اور علمی مجلسوں میں اس عہد ساز شاعر کو لاکھوں نے سنا۔ عوام اور خواص نے داد وتحسین کے پھول برسائے۔ گھر گھر میں جس کے اشعار گونجے، تقسیم کے زخموں سے کراہتے ہوئے ماحول پر جس کے کلام نے محبتوں کی نغمگی بکھیری۔ اہلِ دانش نے جسے دورآفریں قرار دیا، جہانِ نقد ونظر نے جس کے فکر وفن کو بقائے دوام کی سند بخشی، اس طرحدار شاعر کا نام ہے فضل الٰہی مخمور دہلوی۔ آج اردو دنیا کا کون سا باشعور ذہن ہے جس میں چمنستانِ دلّی کے اس گلِ سرسبد کا یہ لافانی شعر موجود نہ ہو:

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اسے اردو کی نصابی تحقیق وتنقید کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ تہذیب ومعاشرت پر اپنی اخلاقی، روحانی اور فکری شاعری کی گہری چھاپ چھوڑنے والے عظیم شاعر کو فراموش کردینے کی حد تک نظرانداز کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ نئے ادبی زمانے کی مصلحت کوشیوں، کم نگاہیوں یا پھر بے اعتنائیوں کے اندھیرے خواہ کتنے ہی گھنے کیوں نہ ہوجائیں شہر میر وغالب کے اس آخری چراغ کی ضوفشانی اور تابنا کی ہمیشہ قائم رہے گی اور اردو کی ہر نسل میں وہ اہلِ نظر پیدا ہوتے رہیں گے جو مخمور دہلوی کی دل آویز، مترنم، اثرآفریں، خطیبانہ، ناصحانہ اور متصوفانہ شاعری کے نور سے اپنی کائناتِ شعور وادراک میں اجالا کرتے رہیں گے۔

فضلِ الٰہی مخمور دہلوی کے شاعرانہ مقام ومرتبے کا اندازہ اس بات سے باآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ نے ان کے انتقال پر اپنے رنج وملال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اگر ان کی زندگی ہمارے اختیار میں ہوتی یا ان کی زندگی میں کسی اور کی زندگی کا پیوند لگایا جاسکتا تو ان کی قدر

> مخمور اپنے طرز میں اور ان کا کلام اپنے مزاج میں دلّی والے ہیں، اور یہ اس سرزمین کی خصوصیت رہی ہے کہ اس کا رنگِ بیان شعر میں جھلکتا ہے، جیسے پانی کی لہروں میں سورج کی کرنیں۔ الفاظ کی سادگی، بندش کی چستی اور زبان کی روانی بتادیتی ہے کہ شعر کی زمین کیا ہے۔ مخمور کے کلام میں ان محاسن کے علاوہ دردمند دل کی پکار، درماندگی، عجز اور بے پناہ خلوص ومحبت بھی ہے۔ پھر بھی متانت ایسی کہ الفاظ اور تخیل دونوں ذہنی پستی سے پاک ہیں۔

کرنے والے اور ان سے محبت کرنے والے اپنی زندگیوں کے دامن پھاڑ پھاڑ کر ان کی زندگی میں جوڑ دیتے اور ان کے اچھوتے خیالات اور نصیحت آمیز شاعری سے فائدہ اٹھاتے''۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مخمور دہلوی کے بڑے قدردان تھے۔ مولانا نے ان کے کلام کی داد دیتے ہوئے کہا تھا ''میر و غالب کے بعد دہلی ابھی بھی مخمور جیسے شاعر سے آباد ہے۔'' شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے مخمور کی شاعری پر اپنی رائے اس طرح ظاہر کی تھی:

''مخمور اپنے طرز میں اور ان کا کلام اپنے مزاج میں دلّی والے ہیں، اور یہ اس سرزمین کی خصوصیت رہی ہے کہ اس کا رنگِ بیان شعر میں جھلکتا ہے، جیسے پانی کی لہروں میں سورج کی کرنیں۔ الفاظ کی سادگی، بندش کی چستی اور زبان کی روانی بتادیتی ہے کہ شعر کی زمین کیا ہے۔ مخمور کے کلام میں ان محاسن کے علاوہ دردمند دل کی پکار، درماندگی، عجز اور بے پناہ خلوص و محبت بھی ہے۔ پھر بھی متانت ایسی کہ الفاظ اور تخیل دونوں ذہنی پستی سے پاک ہیں''۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر آزادی کے بعد مشاعروں کی تاریخ کی سب سے نمایاں شخصیت ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے اس سنہرے دور میں مشاعروں اور مجلس آرائیوں کے حوالے سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی۔ آنجہانی کنور صاحب مخمور دہلوی کو اس طرح یاد کرتے ہیں ''مخمور صاحب کبھی مرحوم نہیں ہوسکتے، مخمور صاحب سے میری پہلی ملاقات ریاست پٹودی میں ہوئی۔ نواب افتخار علی خاں مرحوم میرے کالج فیلو تھے، ان کی دعوت پر ہم پٹودی پہنچے، قبلہ بیخود دہلوی ہمارے ساتھ تھے شام کے وقت ایک نہایت پرخلوص مجلس ہوئی، ہم سب نے اپنا کلام سنایا مگر مجلس جم نہ سکی تو نواب صاحب نے فرمایا'' آؤ میاں مخمور اب تم ہی کچھ سناؤ''۔ چنانچہ جب مخمور صاحب نے اپنے لحن داؤدی میں کلام سنایا تو تمام محفل پر وجد کا عالم طاری ہوگیا۔ داد کا یہ عالم تھا کہ بس چھتیں پھٹ رہی تھیں۔ وہ اپنے ترنم سے ایسا معیار قائم کرگئے ہیں جسے آج تک کوئی چھو بھی نہیں سکا'' (یادوں کا جشن)

پروفیسر عنوان چشتی مرحوم نے 'کلیاتِ مخمور' کی تقریظ میں مخمور کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''آزادی کے بعد مخمور دہلوی ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے خونِ دل سے کشتِ غزل کی آبیاری کی ہے۔ بیخود دہلوی نے اپنے جمالیاتی تجربوں کو لفظ و بیان کا پیکر عطا کرنے میں جس فن کارانہ آگہی کا ثبوت دیا ہے اس سے شاعر کی چابک دستی اور تخلیقی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے محبت کی نفسیات کو تہذیب عاشقی سے ہم آہنگ کرکے پیش کیا ہے۔ ان کی فنکاری کا جوہر دو سطحوں پر نمایاں ہوتا ہے۔ انھوں نے تخلیقی محل کی سطح پر خیال کو احساس اور فکر کو جذبہ کی لہر میں کامیابی سے تبدیل کیا ہے۔ اس لیے ان کی غزل کا ہر لفظ ایک جذباتی لہر ہے جس پر معنویت کا پورا منظر نامہ رقص کرتا ہے۔''

کلاسیکی غزل عشق و محبت کی نغمہ سنجی سے عبارت ہے مخمور غزل کے حساس اور جذباتی شاعر ہیں عشق و محبت کا جذبہ ان کے یہاں اپنی تمام تر پاکیزگی اور فکری بلندیوں کے ساتھ موجزن ہے:

شعلۂ عشق کا شامل ہے تصرف ان میں
میرے اشعار دہکتے ہوئے انگارے ہیں

چونکہ مخمور بنیادی طور پر ایک پاکباز صوفی ہیں، ان کا عشق مجازی نہیں حقیقی اور الوہی ہے، وہ عشق کو بشریت کی اساس اور انسانیت کی معراج مانتے ہیں۔ عشق کی بات کرتے ہوئے ان کا انداز خطیبانہ پیرایہ اختیار کرلیتا ہے، جو اربابِ تصوف کی خصوصیت رہی ہے:

عشق ہوتا ہے تو ہوتی ہے زباں دل کی رفیق
عشق ہوتا ہے تو ملتی ہے زبانِ صدیق
عشق انسان کو انسان بنادیتا ہے
عشق کر عشق جو اللہ تجھے دے توفیق

آدابِ بندگی نہیں آتے بغیر عشق
زاہد کمالِ زہد سے انساں نہ بن سکا

دردبن کر عشق دل کو اس طرح تڑپا گیا
بات تو ایمان کی یہ ہے، خدا یاد آگیا

مخمور دہلوی کی غزلیہ شاعری میں محبت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ مخمور داغ اسکول کے نمائندے ہیں۔ بیخود دہلوی کے شاگرد رشید ہیں، سلسلۂ داغ کے سبھی شعرا کے یہاں داغ کے رنگ میں عشق مجازی کی کارفرمائی ہے۔ داغ کے سبھی نامور جانشینوں نے اسی روش کا تتبع کیا جو داغ کی خصوصیت ہے۔ نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی، آغا شاعر قزلباش اور خود وحیدالدین بیخود نے اسی رنگ و آہنگ کو اپنایا، لیکن مخمور اس روایت کے برعکس اپنے لیے ایک الگ راہ اختیار کرتے ہیں جہاں محبت حقیقت کے روحانی پیکر میں ڈھل جاتی ہے، یہی اسلامی تصوف کا رنگ بھی ہے جس میں مخمور پوری طرح رنگے ہوئے تھے:

محبت اصل میں مخمور وہ رازِ حقیقت ہے
سمجھ میں آگیا ہے پھر بھی سمجھایا نہیں جاتا
محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

محبت عین مذہب ہے، محبت عین ایماں ہے
وہ کافر ہوں جسے آتا نہیں دیں دار ہوجانا

محبت اب کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیتی
خودی کی موت سمجھو روح کا بیدار ہوجانا

ہر عیش سے، دنیا سے کنارہ کرلے
غم کھا کے محبت میں گزارہ کرلے

ساقی نامہ

نئے رندوں کو راس آئی نہ صہبائے کہن ساقی
کہ ہے بہکی ہوئی سی انجمن کی انجمن ساقی
نہیں معلوم یہ بدمستیاں کیا رنگ لائیں گی
کہاں تک اور بگڑیگا ابھی ان کا چلن ساقی
نہیں ہے جو امیں تو نے امانت ان کو سونپی ہے
یہ وہ رہبر ہیں جن سے کانپتے ہیں راہزن ساقی
دل آزاری ستم رانی کی کوئی انتہا بھی ہے
ستائیں گے کہاں تک مجھ کو ابنائے وطن ساقی
تخیل میں کچھ اپنے حشر کے آثار پاتا ہوں
میری خلوت ہوئی جاتی ہے اب تو انجمن ساقی
یہاں جن سے وفا کا اب کوئی گاہک نہیں ملتا
بھلا بیٹھے ہیں سب اپنی روایاتِ کہن ساقی
یہاں انسانیت پر کوئی دو آنسو نہیں روتا
یہاں لاشے پڑے رہتے ہیں بے گور و کفن ساقی
وہاں بھی میرے استقلال نے دامن نہیں چھوڑا
جہاں امید کی دیکھی نہ تھی کوئی کرن ساقی
محبت کی زباں سے فرض جب آواز دیتا ہے
مجاہد اپنے سر سے باندھ لیتا ہے کفن ساقی
یہ سب کچھ بادلِ ناخواستہ کہنا پڑا مجھ کو
مجھے مجبور کرتی ہے مری خاکِ وطن ساقی
کسی فتنہ سے اب مخمور خائف ہو نہیں سکتا
یہی ہوگا کہ ہوجائے فراقِ جان و تن ساقی

ملتا ہے اگر دوست کے ہاتھوں سے تجھے
تو زہر ہلاہل بھی گوارہ کرلے

جذبۂ محبت مخمور کے یہاں عام مروجہ شے نہیں ہے بلکہ اس قدر خاص ہے کہ اس کا پانا ہر کس وناکس کے لیے ناممکن اور مشکل ہے:

لہو کی بوند ان آنکھوں سے اکثر دل سے آتی ہے
اس افسانے میں رنگینی بڑی مشکل سے آتی ہے

مخمور محبت کو دنیا کی سب سے بڑی الوہی دولت سمجھتے ہیں۔ اللہ جس دل کو یہ محبت عطا کردے پھر اسے دُنیا میں کسی شے کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ محبت وہ نعمتِ عظمٰی ہے جو قدرت ہر کسی کو ودیعت نہیں کرتی۔ مخمور اس رمز کی وضاحت کرتے ہیں:

محبت جس کو دیتے ہیں اسے پھر کچھ نہیں دیتے
اسے سب کچھ دیا ہے جس کو اس قابل نہیں سمجھا

فضلِ الٰہی مخمور دہلوی 7 نومبر 1900 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی نور احمد پرانی دہلی کے ایک شریف معزز اور دین دار انسان تھے۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی ضمیر احمد تھے جو بعد میں وائسرائے ہاؤس میں ملازم ہوئے۔ مخمور دہلوی پڑھنے لکھنے کے شوقین بچپن سے ہی تھے۔ 11 برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ جانشینِ داغ حضرت بیخود دہلوی کی شاگردی اختیار کی تو زبان وکلام اور عروض و بلاغت میں کامل ہوگئے۔ کمسنی میں ہی انھیں ریاست پٹودی میں اچھی ملازمت مل گئی۔ نواب افتخار علی خاں (نواب منصور علی خاں پٹودی کے والد) ان کی شاعری کے نہایت قدر دان تھے اور ان سے برادرانہ شفقت رکھتے تھے۔ مخمور دہلوی کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی کا انتقال جلد ہی ہوگیا، دوسری اہلیہ خوشنودی بیگم دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھیں، وہ شاعرہ بھی تھیں۔ اُن سے چار بچے ہوئے جو اُن کی یادگار ہیں۔ تیسری اہلیہ سے انھوں نے آخر میں خوشنودی بیگم کے انتقال کے بعد بچوں کی پرورش کے خیال سے نکاح کیا تھا۔ انھیں خدا نے دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کی تھیں۔ بڑے صاحبزادے بدرمخمور اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری افسر رہے ہیں۔ چھوٹے بھائی فخر بھی دہلی میں خوشحال اور کامیاب زندگی بسر کررہے ہیں۔ بڑی صاحبزادی نسیم مخموری صاحبہ کا شمار اردو دنیا کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ چھوٹی بیٹی لئیقہ بھی تعلیم یافتہ اور اسکول کی معلّمہ ہیں۔ بدرمخمور صاحب نے اپنے والد کا کلیات مرتب

کرکے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب میں انھوں نے اپنے والد کی سوانحی کوائف بھی بیان کیے ہیں:

''مخمور صاحب کی زندگی کا جو زمانہ پٹودی میں گزرا سب سے زیادہ حسین تھا، اس کی وجہ نواب افتخار علی خاں مرحوم کی محبت اور قربت تھی، ایک طرح سے وہ ان کے دوست اور ندیم تھے۔ ان کا زیادہ وقت نواب صاحب کے ساتھ شعروشاعری، شکار، کرکٹ اور سیاحت میں گزرتا تھا۔ نواب صاحب سے ملنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، ابھی گھر آئے ہیں کہ پیچھے پیچھے اردلی چلا آرہا ہے کہ نواب صاحب یاد کررہے ہیں۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیگم محترمہ سلطان بیگم آف بھوپال نے اپنے تاجدار کی رسم شفقت اور محبت کو مخمور صاحب اور ان کے بچوں کے ساتھ بے حد خوبصورتی اور ذمے داری کے ساتھ نبھایا۔ مخمور صاحب کے انتقال کے بعد بھی انھوں نے اپنا قیمتی وقت، نیک مشورے اور مالی امداد سے ہم سب کی گاہے بگاہے سرپرستی فرمائی''۔

آزادی کے بعد مخمور دہلوی ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے خونِ دل سے کشتِ غزل کی آبیاری کی ہے۔ بیخود دہلوی نے اپنے جمالیاتی تجربوں کو لفظ وبیان کا پیکر عطا کرنے میں جس فن کارانہ آگہی کا ثبوت دیا ہے اس سے شاعر کی چابک دستی اور تخلیقی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

1947 میں مخمور صاحب بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر دہلی آگئے۔ تقسیم وطن کے بعد دہلی پر فرقہ وارانہ فسادات کی جو قیامت نازل ہوئی وہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ انسانی قدروں کی اس بربادی پر انھوں نے اس طرح کے شعر کہے ہیں:

زمانہ ساتھ اپنے اک نیا طوفان لایا ہے
کوئی اس دور میں آسودۂ ساحل نہیں ملتا

چار تنکے جل گئے اس کا کسے افسوس ہے
غم تو یہ ہے آگ صحنِ گلستاں تک آگئی

جب دہلی فرقہ وارانہ حیوانیت کی آگ میں جل رہی تھی تو وہ منظر مخمور صاحب کے شعر میں ڈھل کر اس طرح ظاہر ہوا:

یوں بھی ہوتی ہے تزئینِ گلشن
جل رہے ہیں ہزاروں نشیمن

مخمور ایک سچے محبّ وطن اور کشادہ ذہن شخصیت کے مالک تھے۔ مذہبی تعصب سے پاک ذہن، اقدارِ انسانی میں یقین ان کی شخصیت کا بنیادی جز وتھا۔ ان کا ذہنی تعلق مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، جمعیۃ علماء ہند کے قوم پرست رہنماؤں سے تھا جو کسی قیمت پر ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ مخمور کو اپنے پیارے وطن ہندوستان کی عظمت پر فخر وناز تھا:

اس کی عظمت کے فسانے ہیں زبانِ حال پر
ہیں مقدر سرزمیں ہندوستاں میرے لیے
سرنہ کیوں نہ جھک جائے پرچم کی بلندی دیکھ کر
واجبِ تعظیم ہے قومی نشاں میرے لیے
باغباں اپنے چمن اپنا محافظ اپنے ہیں
اب مکمل ہوگئی یہ داستاں میرے لیے
ہوگئے آزاد زنجیرِ غلامی کٹ گئی
اب تو ہر ایک سانس ہے راحت رساں میرے لیے

مخمور گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد سے بے حد متاثر تھے اور اہنسا کے نظریے کو ہندوستان کی آزادی اور تعمیر وترقی کی روح تصور کرتے تھے۔ سالہا سال کی طویل قومی جدوجہد کے بعد جب ملک کو آزادی ملی تو انھوں نے دل کی گہرائیوں سے آزادی کے جشن میں حصہ لیا اور اس مبارک موقع پر 'کاروانِ آزادی' کے عنوان سے ایک نظم میں اپنے وطنی جذبے کا اظہار کیا:

ہزار شکر کہ اب مطمئن ہیں اہل وطن
گزر چکا ہے ہر اک امتحانِ آزادی
بہت کٹھن ہے اہنسا کی راہ پر چلنا
صلہ اسی کا تو ہے ارمغانِ آزادی
زمین ہند نہ کیوں معدن جواہر ہو
یہاں ہے سایہ فگن آسمانِ آزادی

اتحاد انسانی اور قومی یکجہتی ہندوستان جیسے کثیرالمذاہب ملک کے باسیوں کے لیے کس قدر لازمی ہے اس کے لیے مخمور کے اس شعر میں کس قدر تعمیری اور اثرانگیز پیغام پنہاں ہے:

اک ایسی راہ بھی جاتی ہے کوئے دوست کو
جو تجھے دیروحرم سے آشنا ہونے نہ دے

آزادی کے بعد ہندوستان میں بالا دست طبقے کی تنگ نظر سیاست کا جو دور شروع ہوا اُس نے مخمور جیسے وطن پرست شاعر کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اس صورتِ حال کو اپنے ایک ساقی نامہ میں بڑی دردمندی کے ساتھ بیان کیا ہے:

دل آزاری، ستم رانی کی کوئی انتہا بھی ہے
ستائیں گے کہاں تک مجھ کو ابنائے وطن ساقی

مخمور خالصتاً روایتی کلاسیکی شاعر تھے ان کا فکری تعلق کسی مخصوص نظریہ سے نہیں تھا، لیکن ترقی پسند تحریک ان کے دور میں شباب پر تھی اس لیے اس کا اثر ان پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا کیونکہ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں ترقی پسند شاعری کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ جبر واستحصال کا شکار محنت کش غریب کی حالت پر ظالم سرمایہ دار کو کس انداز میں مخاطب کرتے ہیں:

تیری آرائش کے سامانوں کا خالق ہے یہی
خون جو کھولا رہا ہے چلچلاتی دھوپ میں
اس کے تن پر چیتھڑے ہیں وہ بھی کچھ مسکے ہوئے
جسم تیرا ریشمی پوشاک میں ملبوس ہے

مخمور شخصی طور پر ایک راست باز، قناعت پسند، قلندر صفت، ملنسار اور محبتی انسان تھے۔ ان کے احباب اور قدردانوں میں مفتی اعظم حضرت کفایت اللہ، لالہ سری رام دہلوی، نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، گوپی ناتھ امن، بیرسٹر نورالدین احمد، معروف سیاسی رہنما کیلاش ناتھ کاٹجو، حاجی صالح علی، جان والے، نواب سلطان یار خاں، مرزا محمود بیگ، حافظ یوسف دہلوی (مدیر ماہنامہ شمع)، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جامع مسجد نئی دہلی کے امام قاری محمد ادریس صاحب جیسی اہم شخصیات شامل تھیں۔

مخمور دہلوی کا نعتیہ کلام بے حد مقبول تھا۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی نعتیں پوری دنیا میں سنی اور سراہی گئیں۔ حمد ونعت اور سلام جیسی اصناف میں بھی ان کی شان تغزل نمایاں ہے:

دامن آل نبیؐ کا جب سہارا مل گیا
ڈوبتی کشتی کو طوفاں کا سہارا مل گیا
عذابِ حشر سے تو کیوں مجھے ڈراتا ہے
تجھے معلوم بھی ہے فردِ عصیاں کون دیکھے گا

مخمور ایک صاحب عقیدہ وسلسلہ، صوفی صافی مسلمان تھے۔ انھیں سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ حضرت اشتیاق صاحبؒ سے شرف بیعت حاصل تھا۔ حضرت مخدوم صابر کلیریؒ کا فارسی کلام وردزبان رہتا تھا۔ طرز حیات درویشانہ اور قلندرانہ تھا۔ قناعت پسندی اور خودداری کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اپنے مزاج کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے:

فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
سوالی ہوکر مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا

فقیر وہ ہے جو دستِ طلب نہ پھیلائے
ہزار شکر مجھے عادتِ سوال نہیں

مخمور ایک سچے محبّ وطن اور کشادہ ذہن شخصیت کے مالک تھے۔ مذہبی تعصب سے پاک ذہن، اقدارِ انسانی میں یقین ان کی شخصیت کا بنیادی جزو تھا۔ ان کا ذہنی تعلق مولانا آزاد، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، جمعیۃ علماء ہند کے قوم پرست رہنماؤں سے تھا جو کسی قیمت پر ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔

ترے فقیر تو دنیا طلب نہیں کرتے
اسے تو حرص ہوس کے غلام لیتے ہیں

مخمور دہلوی عنفوانِ شباب سے 1947 یعنی 47 برس کی عمر تک پٹودی میں ہی رہے، اس دور میں ان کی شاعری کا دائرہ زیادہ تر ریاست تک ہی محدود رہا۔ لیکن دہلی آنے کے بعد ان کی شہرت آسمان کو چھونے لگی۔ 1952 سے انھوں نے ہندوپاک مشاعروں میں شرکت کا آغاز کیا اور اس دور کے سب سے کامیاب شاعر ثابت ہوئے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی شاعر نے صرف چار برسوں میں ملک گیر عوامی مقبولیت حاصل کی ہو۔ مخمور دہلوی کو لوگ ڈاکٹر صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ہومیوپیتھی طریقۂ علاج میں مہارت حاصل کی تھی۔ پٹودی اور دلّی میں انھوں نے بہت سے مریضوں کا علاج کیا۔ مخمور صاحب کو کیمیا گری کا بھی شوق تھا۔ ایک کیمیا گر سے ان کی گہری دوستی تھی جس کے ساتھ وہ تجربات میں مصروف رہتے تھے۔ بدر مخمور کے مطابق: ''روزمرہ کی زندگی میں وہ رات کو عبادت میں مشغول رہتے تھے، ہر صبح قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ ان کے سرہانے رات بھر ایک شمع روشن رہتی تھی جو صبح تک ختم ہوجاتی تھی۔ تصوف اور اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ سیرتِ رسولِ اکرمؐ اور اللہ کے پیغمبروں کے واقعات بچوں کو سنایا کرتے تھے۔ صوفیائے کرام سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی۔

مخمور نے بہت سے شعرا کی رہنمائی اور فنی تربیت کی ہے۔ ان کے باقاعدہ تلامذہ میں کنہیا لال آزردہ، پریم لال شفا اور صوفی شاعر محمد یاسین صادق دہلوی وغیرہ نے شعروادب کے میدان میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ جس وقت مخمور کی شہرت اور کامیابیوں کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ 26 فروری 1956 کو مخمور صاحب کا انتقال ہوگیا، حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی قبر زبانِ حال سے اپنی مکین کا یہ شعر سنا رہی ہے:

جنھیں پھر گردش افلاک پیدا کرنہیں سکتی
کچھ ایسی ہستیاں بھی دفن ہیں گورِ غریباں میں

■

Farooq Argali, 25, Ganesh Park,
Rasheed Market, Delhi-110051

بنگلہ: ستیہ جیت رے
ترجمہ: عظیم اقبال

(بنگلہ کہانی)

'پتول بابو' فلمی اداکار

پتول بابو نے اپنا شاپنگ بیگ ابھی کندھے سے لٹکایا ہی تھا کہ نشی کانت بابو نے صدر دروازے سے ہانک لگائی—

''پتول، کیا آپ اندر ہیں؟''

''ارے، ہاں'' پتول بابو بولے—

''بس ایک منٹ۔'' نِشی کانت گھوش نیپال بھٹا چاریہ لین میں پتول بابو کے گھر سے تین گھروں کے فاصلے پر رہتے تھے۔ وہ ایک خوش مزاج شخص تھے۔

پتول بابو بیگ لیے باہر آئے — ''سویرے، سویرے کیسے آنا ہوا؟''

''سنیے، کس وقت آپ لوٹیں گے؟''

گھنٹہ بھر بعد— کیوں؟''

''اُمید ہے کہ اس کے بعد گھر پر ہی رہیں گے، کیونکہ آج ٹیگور جینتی ہے۔ کل اپنے سب سے چھوٹے برادرِ نسبتی سے نیتا جی فارمیسی میں میری ملاقات ہوئی۔ وہ فلمی کاروبار میں ہیں۔ پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ میں۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے، جس میں ایک سین کے لیے ایک اداکار کے متلاشی ہیں۔ جس طور سے انھوں نے کردار کے متعلق بتایا کہ وہ پچاس سے اوپر ہے، پستہ قد اور گنجا ہے، اسی سے آپ کی یاد آگئی۔ لہٰذا میں نے اُنھیں آپ کا پتہ دے دیا اور کہا کہ رات آپ سے مل لیں۔ اُمید ہے آپ انکار نہ کریں گے۔ اس کا معاوضہ وہ دیں گے۔''

پتول بابو کو دن چڑھتے ایسی خبر کی اُمید نہ تھی۔ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اُن جیسے گمنام آدمی کے لیے فلم میں کام کرنے کی یوں پیش کش ہوگی۔

''کہیے، ہاں یا نہیں؟'' نشی کانت بابو بولے— ''میرے خیال میں آپ نے کبھی اسٹیج پر کچھ اداکاری کی تھی؟''

''ہاں، درست ہے۔'' پتول بابو بولے—

''لگتا نہیں کہ انکار کر پاؤں گا۔ لیکن آپ کے برادر نسبتی سے پہلے بات تو کرلوں۔ اور تفصیل جان لوں۔ ان کا نام کیا ہے؟''

''نریش، نریش دت۔ تیس سال کے ہوں گے۔ لمبے تڑنگے جوان ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ساڑھے دس بجے کے قریب یہاں پہنچ جائیں گے۔

بازار میں چیزیں خریدتے ہوئے پتول بابو نے اہلیہ کی بتائی ہوئی چیزیں خلط ملط کردیں، پیاز کے بدلے لال مرچ خرید لیا، بیگن کے متعلق بالکل بھول گئے۔ یہ حیرت کی بات نہ تھی۔ کسی زمانے میں پتول بابو کو اسٹیج سے واقعتاً رغبت تھی۔ اس کے علاوہ اُنھیں کچھ جاترا، یا شوقیہ ناٹک کرنے والے، جوان کے پڑوس میں تھے، اُنھیں پتول بابو کی ہمیشہ پوچھ رہتی تھی۔ اَنگنت باردستی اشتہارات میں ان کا نام آیا تھا۔ ایک دفعہ جلی حروف میں اوپر کی طرف نام آیا تھا— ''سیتلا کانتورے— (پتول بابو) پراسر کے کردار میں۔ واقعی، ایک دور وہ بھی تھا جب لوگ اُنھیں دیکھنے کے لیے ٹکٹ خریدتے تھے۔

وہ تب کی بات تھی جب وہ 'کنچرا پاڑا' میں رہتے تھے۔ ریلوے فیکٹری میں ان کی نوکری تھی۔ 1934 میں کلکتہ کے ہڈسن اینڈ کیمبرج میں کلرک کے عہدے کے لیے انھیں زیادہ مشاہرہ کی پیش کش ہوئی اور وہ خوش بخت تھے کہ اُنھیں نیپال بھٹا چاریہ لین میں ایک فلیٹ مل گیا۔ انھوں نے فیکٹری کی نوکری چھوڑی اور اہلیہ کے ہمراہ کلکتہ چلے آئے۔ چند سالوں تک سب کچھ اچھا رہا اور پتول بابو باس کی نظر میں سمائے رہے۔ 1943 میں جب کہ وہ پڑوس میں ایک کلب کی ابتدا کرنے کے بارے میں سوچ وچار کرہی رہے تھے کہ اچانک جنگ کے سبب ان کے دفتر میں لوگوں کی چھٹنی ہونے لگی اور ان کی نو سال کی نوکری جاتی رہی۔

تب سے معاش کے لیے پتول بابو جہد کناں رہے۔ اولاً انھوں نے ایک ورائٹی اسٹور کھولا، جسے انھوں نے پانچ سالوں کے بعد بند کردیا۔ پھر انھیں ایک بنگالی فرم میں نوکری مل گئی لیکن مالک کے جارحانہ رویہ کے سبب انھوں نے نوکری چھوڑ دی۔ پھر دس طویل سالوں تک بیمہ فروشی کیا۔ پتول بابو نے حتی الامکان کوشش کی کہ کامیابی سے روزی کما سکیں لیکن وہ کبھی اپنی قسمت سنوار نہ سکے۔ حال کے دنوں میں وہ کباڑ کے ایک چھوٹے ادارے، جو لوہے کے بیوپار میں ہے، میں آتے جاتے ہیں، جہاں ان کے ایک چچازاد بھائی نے نوکری دلانے کا وعدہ کیا ہے۔

اور اداکاری؟ وہ تو قصہ پارینہ بن گئی ہے۔ ایسی چیز جسے وہ بارہا ایک آہ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اچھی یادداشت کے سبب پتول بابو کو اپنے عمدہ رول کی کچھ لائنیں اب بھی یاد ہیں۔ ''سنو، ارے سنو، گرج بھری ٹن ٹناہٹ، جو گندیوا کے پرزور دھنش کی ہے۔ وہ جو خونی معرکے میں مصروف کار ہے، اور پہاڑ جیسی مکدر کی غضب کی دھاڑ، جو بریکودارا، کے ہاتھوں میں ہے، ہوا میں جھنجھنا رہی ہے۔!'' ایسی لائنوں کی یاد سے ان پر کپکپی چھا جاتی—

نریش دت ساڑھے بارہ بجے وارد ہوئے۔ پتول بابو کو اُمید نہ رہی تھی اور غسل کے لیے جانے ہی والے تھے کہ سامنے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آیئے، آیئے جناب!'' پتول بابو قریب قریب نوجوان کو گھسیٹ کر لے آئے اور ٹوٹے بازو والی آرام کرسی ان کی طرف کھسکا دی۔ ''بیٹھیے، بیٹھیے۔''

''نہیں، شکریہ! میں—''

''ہاں، بڑی حیرت ہوئی، اتنے برسوں بعد۔''

''کیا اُمید کروں کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ اُس رول کے لیے میں ٹھیک رہوں گا؟'' پتول بابو نے جھجکتے ہوئے پوچھا نریش بابو نے پتول بابو پر ٹٹولنے والی نظر ڈالی اور سر ہلا دیا۔

''ہاں، ہاں'' وہ بولے۔

''اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ویسے شوٹنگ کل صبح ہو رہی ہے۔''

''کل؟ اتوار کو؟''

''ہاں، اسٹوڈیو میں نہیں، بتاؤں گا کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ بنٹنک اسٹریٹ اور مشن رو، کے چوراہے کے پاس، فاراڈے ہاؤس، سے تو آپ واقف ہوں گے؟ یہ سات منزلہ دفتری عمارت ہے۔ شوٹنگ دفتر کے باہر داخلی دروازے کے سامنے ہوگی۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ وہاں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جائیں گے۔ دوپہر تک آپ کو فرصت ہو جائے گی۔''

نریش دت نے رخصت ہونے کی تیاری کر لی۔

''لیکن آپ نے رول کے بارے میں بتایا نہیں۔'' پتول بابو متفکر ہوئے—

''ارے ہاں، معاف کریں، رول ایک راہ گیر کا ہے۔ ایک غائب دماغ، متلون مزاج راہ گیر کا۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کے پاس کوئی ایسا جیکٹ ہے جو گلے تک بند ہوتا ہو؟''

''میرے خیال میں ہے۔ آپ کی مراد پرانے فیشن والے سے ہے؟''

''ہاں! آپ اُسے ہی پہنیں گے۔ کس رنگ کا ہے؟''

''بھورے رنگ کا، لیکن اونی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کہانی جاڑے کے موسم کی ہے۔ لہٰذا، وہ ٹھیک رہے گا۔''

''کل ٹھیک آٹھ بجے۔ فاراڈے ہاؤس۔''

پتول بابو کو اچانک ایک اہم سوال سوجھ گیا۔

''میرے خیال میں کچھ مکالمے تو ہوں گے؟''

''بالکل! یہ پُر مکالمہ رول ہے۔ آپ نے پہلے اداکاری کی ہے نا؟''

''ہاں، کی تو ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے پاس ایک چلتے پھرتے رول کے لیے نہیں آیا ہوتا۔ اس کے لیے ہم سڑک سے لوگوں کو چن لیتے ہیں۔ یقیناً، مکالمہ ہے اور آپ کی لائنیں کل آپ کو پہنچتے ہی مل جائیں گی۔''

نریش دت کے جانے کے بعد پتول بابو نے یہ خبر اپنی اہلیہ کو سنائی۔

''سوچتا ہوں، رول بڑا نہیں ہے۔ ہاں، معاوضہ ملے گا، لیکن وہ اہم نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ یاد ہے میں نے اسٹیج پر کیسے کام کی ابتدا کی تھی؟ میرا پہلا رول یاد ہے؟ میں نے ایک مردہ سپاہی کا رول کیا تھا! صرف یہ کرنا تھا کہ اپنے ہاتھ اور پاؤں پھیلا کر اسٹیج پر پڑا رہوں۔ یاد ہے اس حال سے کیسے اٹھا تھا؟ یاد ہے مسٹر واٹس نے کیسے مجھ سے مصافحہ کیا تھا؟ یاد ہے ہماری بلدیہ کے چیئر مین نے چاندی کا تمغہ دیا تھا؟ یہ محض زینے پر پہلا قدم ہے۔ میری پیاری بیوی! ہاں، یہ پہلا قدم ہوگا۔ خدا نے چاہا تو یہ ہمارے محبوب شوہر کے لیے دولت اور شہرت کا آغاز ہوگا۔

''تم نے انڈے سینے سے پہلے ہی بچوں کی گنتی شروع کر دی نا؟ کوئی حیرت نہیں کہ تمھیں پہلے کامیابی کیوں نہ ملی!''

''لیکن اس وقت تو یہ ایک حقیقت ہے! جاؤ، ایک پیالی چائے بناؤ گی؟... رات میں ادرک کا عرق لینے کے بارے میں یاد کرا دینا، یہ حلق کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔''

اسپلانیڈ پر پتول بابو پہنچے تو میٹروپولیٹن عمارت کی گھڑی میں آٹھ بج کر سات منٹ کا وقت تھا— ''فاراڈے ہاؤس'' تک پہنچنے میں مزید دس منٹ لگے۔

عمارت کے باہر بڑی بھیڑ تھی۔ تین چار کاریں سڑک پر کھڑی تھیں۔ ایک بس بھی تھی، جس کی چھت پر ساز و سامان تھے۔ فٹ پاتھ کے کنارے تین پایوں والا ایک آلہ تھا، جس کے گرد مصروفِ کار افراد کا ایک جھنڈ تھا۔ داخلے کے قریب بھی تین پایوں والا ایک کھمبا تھا، جس کا ایک بازو بڑا لمبا تھا، جو اس کی اونچائی سے پھیل کر ہوا میں تھما ہوا تھا اور مستطیل بنا شہد کے چھتے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ان آلات کو کئی لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں پتول بابو کو کچھ بنگالی لوگ بھی دکھائی دیے۔ اُنھیں خبر نہ تھی کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔

لیکن نریش دت کہاں تھے، تنہا وہی تھے جو اُنھیں جانتے تھے۔

دل کی دھڑکن کی تھوڑی تیزی کے ساتھ پتول بابو داخلے کی جانب بڑھے۔ وسط گرمیوں کا موسم تھا اور اُونی جیکٹ جو گلے تک بند تھا، بھاری لگ رہا تھا۔ اپنے کالر کے گرد جمع ہوتی ہوئی پسینے کی بوندیں پتول بابو نے محسوس کیں۔

''ادھر سے، اُتل بابو!''

اُتل بابو؟ پتول بابو کی نظر نریش دت پر پڑ گئی، جو داخلے پر کھڑے تھے، اور اُنہی کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ان کا نام غلط پکارا تھا— حیرت کی کیا بات ہے، ان کی ملاقات تو بہت تھوڑے وقفے کی تھی۔

پتول بابو آگے بڑھے۔ نمسکار کے لیے ہاتھ جوڑے اور بولے— ''میرے خیال میں آپ نے اب تک میرے نام پر دھیان نہیں دیا۔ شیلا کانت راؤ— اگرچہ لوگ مجھے میرے لقب، پتول بابو، سے زیادہ واقف ہیں۔ اسٹیج پر بھی میں نے اس کا استعمال کیا۔''

''واہ! واہ! مجھے اعتراف ہے کہ آپ وقت کے بڑے پابند ہیں۔''

پتول بابو مسرور ہوئے—

''میں ہڈسن اور کیمبرلے میں نو برسوں تک رہا اور کسی دن بھی مجھے دیر نہ ہوئی۔''

''ایسا ہے؟ بہت خوب، میں کہوں گا کہ آپ وہاں چھاؤں میں چلے جائیں، اور انتظار کریں۔ ہمیں کچھ ضروری کام کر لینے ہیں، تبھی آگے بڑھیں گے۔''

''نریش!''

تین پایوں والے آلے کے پاس کھڑے ایک آدمی نے آواز دی—

''جناب؟''

''ہاں، جناب وہی ہیں— اس شاٹ میں جہاں ان کی آپس میں ٹکر ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ داخلے سے بھیڑ ہٹاؤ۔ ہمیں اب کام شروع کرنا ہے۔''

پتول بابو پیچھے ہٹ کر پان کی ایک دوکان کے سائبان میں چلے گئے۔ اس سے قبل انھوں نے فلم کی شوٹنگ نہیں دیکھی تھی۔ کتنی مشقت سے یہ لوگ کام کرتے تھے! تقریباً بیس برس کا ایک نوجوان تین پایے والے آلے کو اپنے کندھے پر اٹھائے چل رہا تھا۔ اس کا وزن کم از کم ساٹھ پونڈ تو ہوگا ہی—

لیکن ان کے مکالمے کا کیا ہوگا۔؟ وقت زیادہ بچا نہ تھا۔ تاحال اُنھیں پتہ نہ تھا کہ آخر اُنھیں کرنا کیا ہے اور کہنا کیا ہے—

پتول بابو یکا یک حواس باختہ ہو اٹھے۔ کیا کسی سے پوچھنا چاہیے؟ نریش دت تو وہاں تھے، کیا وہاں جائیں اور یاددہانی کرا دیں؟ کوئی بات نہیں، اگر رول کم ہو تو ہو، لیکن سب کچھ عمدگی سے کرنے کے لیے اپنے مکالمے کی خبر پہلے سے ہونی چاہیے۔ اگر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں اُن سے کچھ گڑبڑ ہوگئی تو کتنی سبکی ہوگی! اسٹیج پر پچھلی بار بیس برس پہلے انھوں نے اداکاری کی تھی۔

چتول بابو قدم بڑھانے ہی والے تھے کہ ایک کرخت آواز نے اُنھیں روکا۔ ''خاموش!''

اُس کے فوراً بعد نریش دت نے ہتھیلیوں کو منہ کے گرد رکھ کر اعلان کیا— ''شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ مہربانی کر کے چپ ہو جایئے۔ پلیز ڈولیے نہیں، براہِ کرم کیمرے کے سامنے بھیڑ نہ لگائیں۔''

ایک دفعہ پھر کرخت آواز سنائی دی۔ ''خاموش!'' شروع! اب بولنے والا چتول بابو کی نظر میں آ گیا۔ وہ درمیانے قد کا تھا۔ فربہ اندام، کیمرے کی بغل میں کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں چھوٹی دوربین کی طرح کچھ جھول رہی تھی۔ کیا وہ ہدایت کار تھا؟ کیسی عجیب بات ہے؟ انھوں نے اب تک ہدایت کار کا نام نہیں جاننا چاہا تھا۔

اب یکے بعد دیگرے کرخت آوازیں گونجیں ''ساؤنڈ!'' ''اسٹارٹ''! ''رننگ!'' ''کیمرہ!'' ''رولنگ!'' ''ایکشن!''

چتول بابو نے دیکھا کہ جونہی ''ایکشن'' کہا گیا چوراہے سے دوڑتی ہوئی ایک کار آئی اور دفتر کے داخلے پر ٹھہر گئی۔ پھر بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس گلابی میک اَپ میں ایک جواں سال کار کے عقبی حصے سے باہر آیا، اُس نے جلدی جلدی داخلے کی جانب قدم اٹھائے اور پھر یکسر تھم گیا۔ اگلے لمحہ چتول بابو کو ''کٹ!'' کی آواز سنائی دی اور فوراً بھیڑ میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔

چتول بابو کے پاس کھڑا ایک آدمی ان کی طرف مڑا— ''میرے خیال میں آپ نے اُس نوجوان کو پہچان لیا ہوگا؟'' وہ بولا—

''کیوں؟ نہیں تو...'' چتول بابو بولے

''چنچل سرکار'' آدمی نے کہا۔

''بڑی تیزی سے اونچائی پر جا رہا ہے— فی الحال چار فلموں میں کلیدی رول کر رہا ہے—''

چتول بابو بہت کم فلمیں دیکھتے تھے، لیکن اُنھیں لگا کہ چنچل کا نام انھوں نے سنا ہے۔ یہ وہی لڑکا تو نہیں جس کی اُس دن 'کوتی بابو' ستائش کر رہے تھے۔ بڑا اچھا میک اَپ کیا ہے۔ سوٹ کے بجائے اگر بنگلہ دھوتی پہنے ہوتا اور پنجابی، اور مور کی سواری کر رہا ہوتا تو بالکل کارتک دیوتا، کی طرح لگتا۔ کنچن پاڑا کا مونو توشی— جیسے اس کے لقب، چینو، سے لوگ زیادہ جانتے تھے، وہ بھی ٹھیک ایسا ہی لگتا تھا— زنانہ رول بخوبی کرتا تھا، چتول بابو کو یاد آیا—

چتول بابو اب اپنے ہم سایہ کی جانب مڑے اور سرگوشی میں پوچھ پڑے— ''ہدایت کار کون ہے؟''

آدمی نے بھویں ٹیڑھی کیں اور بولا— ''کیوں؟ کیا آپ کو خبر نہیں؟ بارین ملک ہیں۔ ان کی لگاتار تین فلمیں ہٹ ہو چکی ہیں۔'' چلو، اُنھیں کچھ مفید خبر مل چکی تھی۔ اگر ان کی اہلیہ پوچھ بیٹھتیں کہ وہ کس کی فلم میں کام کر رہے ہیں اور اداکار کون ہے تو ابھی انھیں اتنا کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ یہ تو نہ کہیں گے کہ پتہ نہیں۔ مٹی کے پیالے میں چائے لیے نریش دت ان کے پاس آ گئے۔

''آپ یہاں ہیں جناب! گرم چائے سے آپ کے حلق کو آرام ملے گا۔ آپ کی باری آنے ہی والی ہے۔''

چتول بابو اب مطلب پر آ گئے—

''بہتر ہوتا کہ میرا مکالمہ مجھے بتا دیجیے۔''

''آپ کا مکالمہ؟— آیئے میرے ساتھ۔''

نریش دت تین پایوں والے آلے کی جانب چتول بابو کے ساتھ بڑھے—

''سنیو، سوسانکو''

مختصر آستین والا نوجوان نریش دت کی جانب پلٹا— ''انھیں ان کا مکالمہ بتا دو۔ کاغذ پر لکھ کر انھیں دے کیوں نہیں دیتے؟ یہ وہی ہیں، جو—''

''جانتا ہوں، جانتا ہوں۔''

سوسانکو اب چتول بابو کی طرف مڑے۔ ''آیئے، محترم— سنو، جیوتی— کیا تمھارا قلم ایک سیکنڈ کے لیے مستعار لے سکتا ہوں؟ محترم چاہتے ہیں کہ ان کا مکالمہ تحریر کر دیا جائے۔''

جواں سال جیوتی نے جیب سے سرخ روشنائی کا جیٹر نکالا اور سوسانکو کو سونپا۔ سوسانکو نے اپنی نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑا، اس پر کچھ لکھا اور چتول بابو کو تھما دیا۔

چتول بابو نے کاغذ پر نگاہ دوڑائی— انھوں نے پایا کہ صرف ایک لفظ لکھا ہے— ''اوہ!'' یکا یک چتول بابو کے سر میں دھمک سی ہوئی— انھیں چاہت ہوئی کہ جیکٹ اُتار دیں۔ جیکٹ کی گرمی ناقابلِ برداشت تھی—

سوسانکو نے کہا— ''کیا بات ہے، محترم؟ آپ خوش نہیں دکھائی پڑ رہے ہیں!''

''کیا یہ لوگ ان سے دل لگی کر رہے ہیں؟ کیا سب کچھ کسی مذاق کا حصہ ہے؟ ان جیسا سیدھا، بے ضرر انسان اور وہ وسط شہر میں ان کی کھنچائی کرنے پر تلے ہیں— اتنا بے رحم کوئی کیوں کر ہو سکتا ہے؟''

چتول بابو ایسی آواز میں بولے جو مشکل سے ہی سنائی پڑے— ''یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہے۔''

''کیوں محترم؟''

''بس 'اوہ'! صرف اتنا ہی مجھے کہنا ہے؟''

سوسانکو کی بھویں تن گئیں—

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں محترم؟ آپ سوچتے ہیں کہ یہ کچھ بھی نہیں؟ کیوں؟ یہ تو مستقل بولی کا ایک حصہ ہے! بارین ملک کی فلم کا بولتا ہوا حصہ— کیا آپ کو خبر ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ سوچیے، آپ تو اداکاروں میں سب سے خوش قسمت ہے—

خبر ہے کہ تا حال ایک سو سے زائد لوگ اس فلم میں دکھائی دیتے ہیں، جنھیں کچھ نہیں کہنا تھا؟ وہ صرف کیمرے کے سامنے سے گزر گئے۔ چند تو چلے بھی نہیں، صرف ایک جگہ کھڑے رہے۔ دوسرے ایسے بھی تھے جن کا چہرہ تک نہ آیا— آج بھی— ان سارے لوگوں پر نگاہ ڈال لیں، جو لیمپ پوسٹ کے پاس کھڑے ہیں۔ ان سب کو آج کے سین میں نمودار ہونا ہے، لیکن اُنھیں کچھ بولنا نہیں ہے۔ ہمارا ہیرو چنچل کمار تک آج کچھ نہ بولے گا۔ ''صرف آپ ہیں، جنھیں بولنا ہے— دیکھ لیجیے؟''

اب نوجوان، جیسے جیوتی پکارتے تھے، آیا— اُس نے چتول بابو کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا— ''سنیے، محترم، میں بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا ہے چنچل کمار ایک ابھرتا ہوا جواں سال ایگزیکیوٹیو ہے۔ اسے خبر ملی ہے کہ دفتر میں پیسے کا کچھ گول مال ہوا ہے— اور وہ یہ دیکھنے آیا ہے کہ ہوا کیا ہے— وہ اپنی کار سے اُترتا ہے اور تیزی سے کنارے کی جانب بڑھ کر داخلے تک جاتا ہے۔ اُسی وقت ایک غائب دماغ راہ گیر سے اس کی ٹکر ہو جاتی ہے۔ وہ آپ ہی ہیں۔ آپ کو سر میں چوٹ لگتی ہے اور آپ کہہ اٹھتے ہیں— ''اوہ!'' لیکن چنچل کمار آپ کی طرف دھیان نہیں دیتا اور دفتر میں چلا جاتا ہے۔ آپ کو نظر انداز کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر بہت مصروف ہے۔ دیکھا؟ ذرا سوچیے کہ کتنا اہم شاٹ ہے۔

''میرے خیال میں اب سب کچھ صاف ہے۔''

سوسانکو بولا—

''اب جہاں کھڑے ہیں، وہاں سے آگے بڑھیں۔ یہاں جتنے کم لوگ ہوں گے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ایک شاٹ بچا ہے۔ پھر آپ کی باری، آئے گی۔''

چتول بابو آہستگی سے پان کی دوکان پر واپس آ گئے— سائے میں کھڑے ہو کر انھوں نے ہاتھ میں تھامے کاغذ پر نگاہ دوڑائی— پھر تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ آیا کوئی انھیں دیکھ تو نہیں رہا— انھوں نے کاغذ کو مروڑ کر ایک گولی بنائی اور سڑک کی بغل کے نالے میں پھینک دی۔

''اوہ!''

اُن کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکلی۔ صرف

ایک لفظ— نہیں، ایک لفظ بھی نہیں، ایک آواز—اوہ!''

گرمی ایسی تھی کہ گھٹن ہورہی تھی۔ جیکٹ اس قدر وزن ہوگیا تھا کہ ایک ٹن کا لگ رہا تھا۔ زیادہ دیر پتول بابو خود کو کھڑا نہ رکھ سکے—

پان کی دوکان سے آگے وہ دفتر تک جا پہنچے اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریباً ساڑھے نو کا وقت تھا۔ اتوار کی صبح کراتی بابو کے گھر میں کالی دیوی کے بھکتی گیت گائے جاتے تھے۔ وہاں چل پڑیں تو کیسا رہے؟ اس میں حرج کیا ہے؟ ان بے کار کے لوگوں کے درمیان اتوار کی صبح کیوں برباد کی جائے، اور مزید یہ کہ احمق دکھائی دیا جائے؟

بکواس! جہنم میں جائے خاموش! اتنی معمولی چیز کے لیے وہ کتنا دکھاوا کررہے تھے! اسٹیج پر سب کچھ عمدہ تھا۔

اسٹیج... اسٹیج!

پتول بابو کے ذہن میں ایک دھندلی سی یاد ہلچل مچانے لگی۔ چند بیش قیمت مشورے والے الفاظ، گہری پختہ آواز میں آئے— ''ایک بات یاد رکھنا پتول، کتنا بھی مختصر رول کیوں نہ دیا جائے، اُسے قبول کرنے میں اپنی ہتک نہ سمجھنا۔ فن کار کے بطور اپنے موقع سے بہترین کارکردگی تمھارا مقصد ہونا چاہیے۔ اپنے مکالموں سے معنی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا— ناٹک میں کتنے سارے لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں تاکہ ناٹک کامیاب ہوسکے۔''

جناب پکراش، گوگون پکراشی تھے جنھوں نے اُنھیں یہ مشورہ دیا تھا— وہ پتول بابو کے گرو تھے۔ بڑے قابل اداکار تھے۔ وہ، جن میں ذرا بھی گھمنڈ نہ تھا۔ درویش صفت آدمی تھے اور لاکھوں میں ایک اداکار تھے۔

کچھ مزید باتیں تھیں، جنھیں جناب پکراش کہا کرتے تھے۔ ''ناٹک میں بولا گیا ہر لفظ پیڑ کے پھل کے مترادف ہے۔ سامعین میں ہر کسی کی رسائی اس تک نہیں ہوسکتی۔ لیکن، تم جو اداکار ہو، تمھیں پتہ ہے کہ اس پھل کو کیسے توڑا جائے— اس کی معنویت تک پہنچو اور اُسے سامعین کے روبرو ان کے ذوق کی بہتری کے لیے پیش کرو۔'' اپنے گرو کی یاد سے پتول بابو کا سر احتراماً جھک گیا—

کیا یہ درست ہے کہ انھیں جو رول ملا ہے، اس میں کچھ بھی نہیں، انھیں محض ایک لفظ بولنا تھا— ''اوہ!'' لیکن اس لفظ میں کوئی معنی نہ تھا کہ جسے فوراً خارج کردیا جائے؟

''اوہ، اوہ، اوہ، اوہ، اوہ''

ہر بار فجائیہ کی ادائیگی میں انھوں نے مختلف طرح گردان کی۔ ایسا کتنی ہی بار کرنے پر اُنھیں حیرت ناک انکشاف ہوا۔ وہی فجائیہ، جب الگ، الگ طریقے سے ادا کیا گیا تو مختلف معنی پیدا ہوئے۔ مجروح ہونے پر کوئی اوہ! کہتا ہے تو مختلف انداز سے کہتا ہے۔ مایوسی میں دیگر طرح کا اوہ! پیدا ہوگا۔ رنج سے دوسری طرح کا پیدا ہوگا۔ حقیقتاً اس اوہ، کے کتنے روپ تھے۔ مختصراً اوہ، کہیں یا کھینچ کر اوہ کہیں، اوہ، کرختگی سے کہیں اور اوہ، سرگوشی میں کہیں۔ اونچی تان کے ساتھ اوہ کہیں یا تان گرا کر 'اوہ' کہیں۔ ہلکے سروں میں 'اوہ' کہیں اور اُسے اونچی تان میں ختم کریں۔ 'اوہ' اونچی تان سے شروع کریں اور نیچی تان میں ختم کریں حیرت ہے! یکا یک پتول بابو کو احساس ہوا

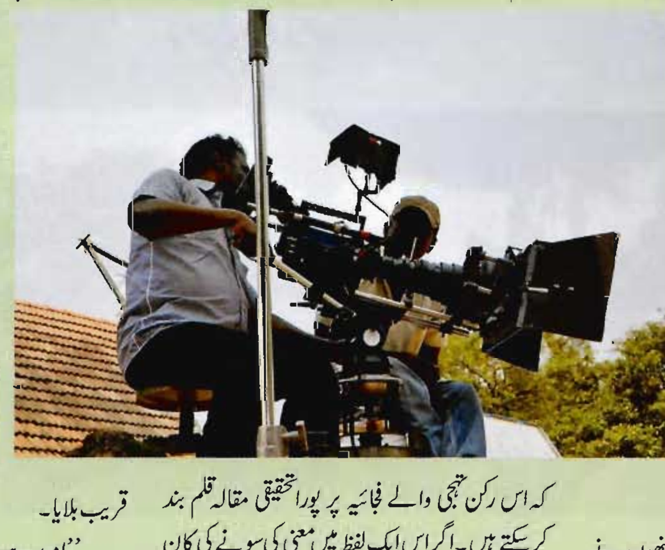

کہ اس رکن تہجی والے فجائیہ پر پورا تحقیقی مقالہ قلم بند کرسکتے ہیں۔ اگر اس ایک لفظ میں معنی کی سونے کی کان سمائی ہوئی ہے تو وہ دل گرفتہ کیوں ہوگئے تھے؟ اصل فن کار اس ایک رکن تہجی سے اپنا نقش چھوڑ سکتا ہے۔

''خاموش!''

ہدایت کار نے اپنی آواز پھر سے اٹھائی تھی۔ پتول بابو نے دیکھا جواں سال جیوتی بھیڑ کو ہٹا رہا تھا۔ وہ اُس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے کہ لپکتے ہوئے وہ اُس کے پاس گئے۔

''بھائی! میری باری کتنی دیر میں آئے گی؟''

آپ اتنے بے تاب کیوں ہیں۔ محترم؟ اس طرح کی مصروفیت کے لیے آپ کو صبر سیکھنے کی ضرورت ہے۔ آدھ گھنٹے بعد آپ کی پکار ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، انتظار کرلوں گا۔ سڑک کے اُس پار بغل کی گلی میں رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ چپکے سے کھسک نہ جایئے گا۔''

''ساؤنڈ اسٹارٹ!''

پنجوں کے بل چل کر پتول بابو نے سڑک پار کی اور بغل کی چھوٹی، پرسکون گلی میں چلے گئے۔ اچھا تھا کہ اُن کے پاس تھوڑا وقت تھا۔ اگرچہ یہ لوگ ریہرسل پر یقین نہیں کرتے، وہ اپنے رول کا ریاض کریں گے۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دفاتر ہونے کے سبب بہت کم لوگ یہاں رہتے تھے۔ جو لوگ یہاں رہتے تھے کہ مثلاً دوکاندار، وہ سب شوٹنگ دیکھنے گئے تھے۔

پتول بابو نے گلا صاف کیا اور رکن تہجی کی ادائیگی مختلف طریقوں سے کرنے گئے۔ اس کے ہمراہ انھوں نے منصوبہ بنایا کہ ٹکر ہونے کے بعد جسمانی طور پر وہ کیا ردعمل دکھائیں گے۔ ان کے چہرے پر درد کی اینٹھن کیسے اُبھرے گی، کیسے وہ اپنے بازو پھیلائیں گے، ان کا جسم کیوں کر سمٹے گا تاکہ درد اور تحیر کا اظہار ہو۔ سب کچھ انھوں نے کئی انداز سے کھڑکی کے بڑے شیشے کے روبرو کیا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے میں پتول بابو کی پکار ہوئی۔ اب انھوں نے پوری طرح اپنی بے دلی پر فتح پالی تھی۔ وہ پرامید تھے اور اپنے جوش کو دبائے ہوئے تھے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس سے بیس برس قبل اسٹیج پر جانے سے پہلے وہ دوچار رہتے تھے۔

ہدایت کار بارین ملک نے اُنھیں قریب بلایا۔

''امید ہے جو کچھ کرنا ہے وہ آپ جان گئے ہوں گے؟'' انھوں نے دریافت کیا۔

''ہاں جناب!''

''خوب! پہلے میں کہوں گا— ''اسٹارٹ ساؤنڈ'' ریکارڈسٹ جواباً کہے گا۔ ''رننگ'' یہ آپ کے لیے اشارہ ہوگا کہ آپ اُس کھمبے سے چلنا شروع کردیں۔ اور ہیرو کے لیے کار سے باہر آجائے۔ اور دفتر میں جانے کے لیے تیز تیز قدم بڑھائے۔ اپنے قدم گن لیں تاکہ ٹکر ٹھیک اس جگہ پر ہو۔ ہیرو آپ کی اَن دیکھی کرے گا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا۔ دفتر میں چلا جائے گا، جب کہ آپ درد کی نمائش کرتے ہوئے کہیں گے ''اوہ!'' چند سیکنڈ رکیں گے، پھر چلنا شروع کردیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

پتول بابو نے ایک ریہرسل کے لیے تجویز رکھی لیکن بارین ملک نے بے صبری سے سر ہلا دیا۔

''سورج کو ڈھکنے کے لیے بادل کا ایک بڑا ٹکڑا

بڑھتا آرہا ہے۔'' انھوں نے کہا ''اس سین کی عکاسی دھوپ میں ہونی چاہیے۔''

''ایک اور سوال۔''

''کہیے؟''

ریہرسل کرتے ہوئے ایک خیال ان کے ذہن میں آیا تھا۔انھوں نے بتایا—

''سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی کھلا اخبار ہاتھ میں ہو اور اُس وقت جب میری آنکھیں اخبار پر ٹکی ہوں، تب ٹکر ہو تو شاید...''

بارین ملک نے اُنھیں روکا اور ایک تماشائی، جو بنگلہ اخبار لیے ہوا تھا کو مخاطب کیا— ''اخبار کیا انھیں دینا پسند کریں گے، صرف ایک شاٹ کے لیے۔شکریہ— اب آپ اُس کھمبے کے پیچھے چلے جائیں۔چنچل، کیا تم تیار ہو؟''

''ہاں، جناب!''

''خوب! خاموش!''

بارین ملک نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور پھر اُسے نیچے لے آئے، بولے ''ایک منٹ کیٹو، میرے خیال میں اگر ہم راہ گیر کو مونچھیں لگادیں، تو زیادہ اچھا ہوگا۔''

''کس قسم کی جناب؟ والسرس رونالڈ کولمین یا بٹر فلائی؟ میرے پاس سارے ہی ہیں۔''

''بٹر فلائی، بٹر فلائی۔'' انھیں طرار بنا ڈالو!''

سن رسیدہ میک اَپ مین پتول بابو کے قریب گیا، ڈبے سے بھورے رنگ کی مونچھیں نکالیں اور پتول بابو کی ناک کے زیریں حصے میں اسپرٹ گوند سے چپکا دیں۔

پتول بابو بولے— ''اُمید ہے کہ ٹکر کے وقت یہ گرے گی نہیں؟''

میک اَپ مین مسکرایا—

''ٹکر؟ وہ بولا ''اگر دارا سنگھ سے کشتی بھی ہوجائے تو یہ اپنی جگہ پر ٹکی رہیں گی۔''

اُس شخص کے ہاتھ میں آئینہ تھا، جس میں پتول بابو نے ایک تیز نگاہ ڈالی۔یہ تو بالکل اصلی لگ رہی ہیں۔مونچھیں تو اُن پر کھل رہی ہیں۔دل ہی دل میں پتول بابو نے ہدایت کار کی سمجھ کی تعریف کی۔

''خاموش! خاموش!''

تماشائی مونچھیں لگانے کے عمل کے متعلق طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔اب بارین ملک کی کرختگی نے سب کو خاموش کر دیا۔

پتول بابو نے غور کیا کہ بیشتر تماشائیوں کی نگاہیں انھی کی جانب اٹھی تھیں۔

''اسٹارٹ ساؤنڈ۔''

پتول بابو نے حلق صاف کیا۔

ایک، دو تین، چار، پانچ قدم میں وہ اُس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ٹکر ہونی تھی اور چنچل کمار کو چار قدم چلنا تھا۔لہٰذا، اگر دونوں ایک ساتھ چلے تو پتول بابو کو ہیرو کی بہ نسبت ذرا سی تیزی دکھانی ہوگی، نہیں تو—

''رننگ!''

پتول بابو نے اخبار کھول کر ہاتھ میں تھاما— ''اوہ'' بولتے ہوئے جو کچھ کرنا تھا، اس میں ساٹھ فی صد خفگی اور چالیس فی صد تحیر کی آمیزش کرنی تھی۔

''ایکشن!''

ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ،— دھم!

پتول بابو کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ہیرو کا سر ان کی پیشانی سے ٹکرایا تھا، اور چند سیکنڈ کے لیے اٹھے تیز درد نے ان کا حواس چھین لیا تھا—

لیکن اگلے لمحے، زبردست قوتِ ارادی سے پتول بابو نے حواس یکجا کیے اور پچاس فی صد خفگی میں، پچیس فی صد تحیر اور پچیس فی صد جھنجھلاہٹ ملاتے ہوئے بولے—

''اوہ!'' اور ذرا سا رکنے کے بعد پھر چلنا شروع کر دیا—

''کٹ!''

''ٹھیک ہوا؟'' بارین ملک کی طرف متفکرانہ انداز میں بڑھتے ہوئے پتول بابو بولے۔

''بہترین! آپ تو عمدہ اداکار ہیں۔سوسانکو ذرا گاگلز لگا کر آسمان کو دیکھو تو''

اب جیوتی، پتول بابو کے قریب پہنچا۔''اُمید ہے کہ محترم کو زیادہ چوٹ نہ لگی ہوگی؟''

''مائی گاڈ!'' چنچل کمار اپنے سر کی مالش کرتے ہوئے بولا— ''آپ اتنے وقت سے پہنچے کہ میں تو تقریباً گر ہی گیا تھا۔''

نریش دت بھیڑ کو چیرتا ہوا پتول بابو کے پاس آیا اور بولا— ''براہِ کرم آپ جہاں کھڑے تھے، وہیں چلے جائیں۔میں ترت آپ کے پاس آؤں گا اور جو کچھ ضروری ہوگا، کروں گا۔''

پتول بابو ایک بار پھر پان کی دوکان کی بغل میں چلے گئے۔بادل نے آفتاب کو ڈھک لیا تھا اور درجۂ حرارت تھوڑا کم ہوا تھا۔پھر بھی پتول بابو نے اپنا جیکٹ اُتار دیا اور چین کی سانس لی، مکمل اطمینان کے احساس سے وہ سرشار ہوئے۔

واقعی انھوں نے اپنا کام بخوبی کیا تھا۔اتنے دنوں کی جدوجہد نے ان کی اداکاری کے جوہر کو کم نہ کیا تھا۔

گوگون پکراش ان کے کام سے خوش ہوئے ہوتے۔لیکن ساری مشقت اور سارا تخیل اس ایک شاٹ میں انھوں نے لگا دیا تھا، کیا یہ سارے لوگ اس کی تعریف کر پائیں گے، انھیں شبہ تھا۔وہ تو فقط چند لوگوں پر نگاہ رکھتے تھے، انھیں متحرک کرتے تھے، ان کی مشقت کے لیے پیسہ دیتے تھے اور پھر سب کچھ فراموش کر دیتے تھے۔''معاوضہ'' دیتے تو تھے، لیکن کتنا؟ دس، پندرہ، بیس روپے؟ یہ سچ تھا کہ انھیں پیسوں کی بہت ضرورت تھی، لیکن جو اطمینان، انھیں اُس مختصر سے کام کو کرنے سے ملا ہے، جسے تکمیل تک پہنچانے کے لیے انھوں نے اتنی لگن دکھائی۔اس کے مقابلے میں اس بیس روپے کی کیا اہمیت تھی؟

تقریباً دس منٹ بعد پتول بابو کی تلاش کرتے ہوئے نریش دت پان کی دوکان کے قریب گیا۔اُنھیں نہ پایا— ''عجیب بات ہے۔انھیں اب تک پیسہ بھی نہیں ملا تھا۔عجیب آدمی ہیں!''

''دھوپ نکل آئی ہے۔'' بارین ملک کرخت آواز میں بولتے ہوئے سنائی دیے۔''خاموش! خاموش! نریش جلدی کرواور ان سارے لوگوں کو راستے سے ہٹاؤ!''

■

Azeem Iqbal Adabistan, Ganj No One, Bettiah - 845438 (Bihar)

شہد ایک قدرتی غذا اور لاجواب دوا

محمد سفیان

شہد دنیا کی قدیم ترین غذاؤں اور دواؤں میں سے ہے۔ بوعلی سینا اور قانون کی شرح کرنے والوں نے شہد کی ماہیت کے بارے میں کہا ہے ''یہ ایک قسم کی شبنم خفی ہے جو پھلوں اور نباتات پر گرتی ہے اس کو ایک مکھی چوس کر اپنے چھتے میں کھانے کے واسطے جمع کر لیتی ہے۔''

(طب نبویؐ اور جدید سائنس، ڈاکٹر خالد غزنوی ص 170، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور 1987)

یہ وہ ابتدائی دور تھا جب لوگوں کو پھلوں پھولوں اور حیوانات کے بارے میں ثقہ معلومات میسر تھی۔ لیکن بعد میں کیمیا دانوں کی تحقیقات نے بے شمار طبی موشگافیاں کی ہیں۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں شہد ایک مفید غذا اور لاجواب دوا کے طور پر متعارف ہوا ہے۔

شہد کا سائنسی تعارف: شہد وہ منفرد مرکب ہے جس میں ہر قسم کے وٹامن موجود ہوتے ہیں۔ جسم انسانی کے لیے مطلوب کیمیائی مرکبات عموماً شہد میں پائے جاتے ہیں۔

عام طور سے شہد میں مندرجہ ذیل عناصر ہوتے ہیں: Proteins was Carbohydrates Potassium, Soduim, Calcium, Magnesium, Copper, Iron, Phosphorus, Sulpher, Chlorine

یہ عناصر فصل، موسم اور علاقے کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ایک سو گرام شہد میں ان عناصر کے علاوہ یہ جسم انسانی کو حرارت کے 3,7 حرارے بھی مہیا کرتا ہے۔ ابتدا ماء الحیات Nectar میں 50.80% فیصدی پانی ہوتا ہے۔ پھر اسے گاڑھا کیا جاتا ہے اور جب اس سے شہد بنتا ہے تو پانی کی مقدار 16.18% فیصدی کے درمیان رہ جاتی ہے، شہد میں موجودہ مشہور عناصر مٹھاس، فرکٹوس، فارمک ایسیڈ، فرازی تیل، موم اور پولن Pollen Grains ہوتے ہیں۔ 50-60 F. شہد دانے دار بن جاتا ہے۔

چند باتیں شہد کی مکھی کے بارے میں:

علم الحیوانات میں شہد کی عام مکھی کو Apis melipica یا Apis کہتے ہیں مکھیاں اپنے پسندیدہ حالات میں شدید جدوجہد کی زندگی گزارتی ہیں اپنے تحفظ کے لیے شہد کی مکھی خوبصورت اور منظم گھر بناتی ہے، مکھیوں کا چھتہ چھ کونوں والے خانے پر مشتمل ہوتا ہے، ان میں درجہ حرارت کو قائم رکھنے کے لیے ایئر کنڈیشن کا مربوط نظام بھی ہوتا ہے، چھتے کا اندرونی درجہ حرارت 93.3F. تک رہتا ہے۔ کارکن مکھیاں انڈوں سے بچے نکالنے، ان کو غذا مہیا کرنے اور ان کے رہائشی کمرے تیار کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں۔

کارکن مکھیاں پھولوں سے ماء الحیات Nectar تلاش کرتی ہیں، مکھیاں زراعت کے لیے بھی نہایت مفید خدمت انجام دیتی ہیں چونکہ نر پھولوں پر بیٹھتے وقت تولیدی دانے (Follen) مکھیوں کے جسموں کو لگ جاتے ہیں پھر جب وہ دوسرے پھولوں پر بیٹھتی ہیں تو ان کے نسوانی حصہ اپنی جانب کھینچ کر باروری حاصل کرتے ہیں۔ پھولوں کے تولیدی دانے پھیلانا اس کی اضافی خدمت ہے۔

شہد بطور غذا: شہد بلاشبہ ایک جامع اور مکمل غذا ہے جو لذیذ بھی ہے اور مفید بھی، یہ جسمانی قوتوں کو جلا بخشتا ہے، بھوک بڑھاتا ہے بوڑھوں کو توانائی اور مخرج بلغم ہے، پیٹ نرم کرتا ہے، مقوی بدن ہے اگر اسے جسم پر لگایا جائے تو یہ ایک عظیم نعمت ہے، جوؤں کو مار دیتا ہے، اس کا سرمہ آنکھوں کو روشن کرتا ہے اس کا منجن دانتوں کو چمکاتا ہے اور مسوڑھوں کی حفاظت کرتا ہے۔

شہد کو اگر مشروب کہیں تو مفرح اور مقوی مشروب ہے اور پیاس کو تسکین دیتا ہے جو لوگ شہد کو بطور غذا استعمال کرتے ہیں عموماً وہ بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

جناب محمدؐ کی حیات مطہرہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ شہد کو پانی میں گھول کر پیتے تھے اور ہمیشہ خالی پیٹ یا نہار منہ استعمال کرتے۔ ان کی شہد پینے کی عادت کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کبھی ایک دن کے لیے بھی نہ بیمار ہوئے اور نہ کسی سفر یا حضر میں اپنی کمزوری یا تھکن کا اظہار فرمایا۔

امراض بطن: شہد پیٹ میں موجود مختلف بیماریوں کے جراثیم کو ہلاک کرتا ہے، آنتوں کے زخموں کو مندمل اور تندرستی کو بحال کرتا ہے شہد اسہال کے علاج کے لیے بھی نہایت موزوں دوا ہے، چونکہ طب کے مطابق اسہال کا سبب آنتوں میں سوزش ہے جو کہ جراثیم یا ان کے زہروں یعنی Toxins یا وائرس سے ہو سکتی ہے، اس کے علاج کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے آنتوں کو صاف کیا جائے، پھر جراثیم مارے جائیں، شہد میں یہ دونوں کام کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے، عہد نبوی میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس حقیقت کو اور واضح کرتا ہے ''ایک شخص نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ اس کے بھائی کو اسہال ہو رہا ہے آپؐ نے فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ، وہ پھر آ کر کہنے لگا کہ شہد پینے سے اسہال میں اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے پھر فرمایا کہ شہد پلاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے اور تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹ کہتا ہے اس نے پھر شہد پلایا تو مریض تندرست ہو گیا۔''

(بخاری کتاب فی الطب باب الدواء بالعسل)

پہلی اور دوسری مرتبہ شہد کی مطلوبہ مقدار حاصل نہ ہو سکی تھی جو تیسری مرتبہ میں مکمل ہوئی اور مریض شفایاب ہو گیا۔

اسی طرح نہار منہ شہد پینے سے پرانی قبض ٹھیک ہو جاتی ہے، کھٹی ڈکار آنی بند ہو جاتی ہے اور اگر پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے تو وہ نکل جاتی ہے۔

شہد، امراض البول، امراض جگر وہ یرقان امراض تنفس اور جسمانی کمزوری دور کرنے میں بھی نہایت مفید ہے۔

امراض اسنان: دانتوں کے لیے شہد ایک بہترین ٹانک ہے، اسے سرکہ میں حل کر کے دانتوں پر ملنا ان کو مضبوط کرتا ہے، مسوڑھوں کے ورم دور کرنے کے علاوہ دانتوں کو چمکدار بھی بناتا ہے۔

رائل جیلی (Royal Jelly): شہد کی مکھی کے پیٹ سے مختلف قسم کی رطوبتیں خارج ہوتی ہیں ان کو علم طب میں Enzymes کہتے ہیں جرمن کیمیادانوں نے اس سے Royal Jelly کا عنصر علیحدہ کرلیا، کیونکہ شفا کا اصل منبع یہی ہے، موجودہ زمانے میں اسی جوہر سے بیماریوں کے علاج کے لیے رائل جیلی نام کے مشروب اور ٹیکے تیار کیے جاتے ہیں۔

ان کیمیادانوں کی تحقیق کا نقطۂ آغاز قرآن حکیم کے یہ کلمات ہیں:

''تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں کی بلندیوں پر اپنا گھر بنائے۔ پھر وہ ہر قسم کے پھولوں سے رزق حاصل کرے اور اپنے رب کے متعین کردہ راستے پر چلے، ان کے پیٹوں سے مختلف رنگ کی رطوبتیں نکلتی ہیں جن میں لوگوں کے لیے شفا رکھی گئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانیاں ہیں تاکہ لوگ ان پر غوروفکر کرکے فائدہ اٹھائیں۔''

(القرآن، سورۃ النحل، 69-68)

اس آیت کریمہ میں جن رطوبتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے انھیں کو Royal Jelly کا نام دیا گیا، قرآن حکیم ان میں انسانوں کے لیے شفا کا سراغ دینے کے بعد ہم سے یہ توقع کرتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں تحقیقات کریں، ان کے منہ اور پیٹ سے نکلنے والی رطوبتوں کا پتہ چلائیں اور ان کے فوائد کو معلوم کرکے اپنی بہتری کے لیے کام میں لائیں۔

امراض جگر اور یرقان: جگر اور پتہ کی خرابیاں اور وائرس کی وجہ سے سوزش یرقان کا باعث ہوتے ہیں۔ شراب نوشی کی وجہ سے جگر خراب ہوجاتا ہے۔ یہی خرابی استسقا اور Cirrhosis کی وجہ سے موت کا باعث بن جاتی ہے گندے اوزاروں سے ٹیکے لگوانے کے بعد اکثر لوگ یرقان کا شکار ہوجاتے ہیں۔ جدید علاج میں مریض کو لحمیات لیمونیائی ترشے اور گلوکوس کا محلول دیتے ہیں۔ یہ ایک عام مریض کے تندرست ہونے اور یرقان دور ہونے میں تقریباً تین ماہ لگتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد غزنوی لکھتے ہیں کہ ایسے تمام مریضوں کو ابلے ہوئے پانی یا بارش کے پانی میں شہد دیا گیا۔ شہد کی مقدار بیماری کی شدت کے مطابق بڑھائی گئی ایک اولمپک کھلاڑی یرقان کی وجہ سے ٹیم سے خارج ہورہا تھا اس نے ایک ہفتے میں دو کلو شہد پیا اور تندرست ہوگیا اور کھیلوں میں پوری توانائی کے ساتھ شریک ہوا۔

شہد پینے والوں کو دوسروں کی نسبت نشہ ویسے بھی کم چڑھتا ہے کیونکہ شہد جگر کے فعل کو بیدار رکھتا ہے اور پوری تندہی سے جسم میں داخل ہونے والی زہروں کو ختم کرتا ہے شہد پینے سے جسم پر ہونے والے سمیاتی اثرات زائل ہوجاتے ہیں۔ (طب نبویؐ اور جدید سائنس، ص182)

سانس کا مرض: گلے سے لے کر پھیپھڑوں تک کی تمام سوزش میں گرم پانی میں شہد اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اس باب میں ندکارنی رقمطراز ہیں:

''بڑھاپے میں تین اہم مسائل ہوتے ہیں۔ جسمانی کمزوری، بلغم اور جوڑوں کا درد۔ اتفاق سے شہد کے استعمال سے یہ تینوں مسائل آسانی سے حل ہوجاتے ہیں۔

کھانسی اور گلے کی سوزش میں اگرچہ شہد غرارے بھی مفید ہیں۔ مگر ایک کام کی چیز کو ضائع کرنے کے بجائے اسے گرم گرم اور گھونٹ گھونٹ پیا جائے تو نالیوں کے آخری سرے تک اثر انداز ہوتا ہے، انفلوئنزا آج بھی لاعلاج بیماریوں میں سے ہے عام طور پر اس میں شفا دس دن سے پہلے نہیں ہوتی اور تندرست ہونے کے باوجود مریض کو کمزوری اتنی ہوتی ہے کہ وہ چارپائی سے اٹھ نہیں سکتا۔ ایک تجربہ کے مطابق ایسے مریضوں کو علالت کے دوران جب 12 بڑے چمچے شہد دن میں تین سے چار مرتبہ بلایا گیا تو عرصہ علالت سمٹ کر تین سے چار دن رہ گیا اور تندرستی کے بعد کمزوری بالکل نہ ہوئی۔ ڈاکٹر خالد غزنوی لکھتے ہیں کہ ''اس تجربہ کا حوصلہ ہمیں برطانیہ کے ایک موقر طبی رسالہ Lancet سے ہوا جس میں ڈاکٹر جی ڈبلیو ٹامس اپنے مشاہدے میں لکھتے ہیں:

''نمونیا کے ایک مریض پر جراثیم کش ادویہ کا اثر نہیں ہورہا تھا، اسے ایک ہفتہ میں ایک کلو شہد پلایا گیا جس سے بخار بھی جلد ٹوٹ گیا اور مریض کو بعد میں کوئی پیچیدگی بھی نہ ہوئی۔ (طب نبویؐ اور جدید سائنس، ص185)

شہد، ہومیوپیتھک طریقۂ علاج: ہومیو طریقۂ علاج میں شہد کی مکھی کو گلیسرین میں ایک خاص طریقے سے حل کرکے ایک دوائی Apis Melifica نام کی تیاری کی جاتی ہے، دوائی کا نام مکھی کے اپنے سائنسی نام پر ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ تمام امراض جن میں علامات ایسی ہوں جیسے کہ مکھی نے ڈنک مارا ہے، میں یہ دوائی مفید ہوگی۔ مثال کے طور پر سرخ رنگ کی سوجن، سارے جسم پر سوجن اور اس میں پانی تیر جائے۔ پیٹ میں پانی پڑا ہو، گردوں میں سوزش حافظہ کی کمزوری، دوسروں سے حسد، تھکاوٹ و بیزاری، بچوں میں سر کا بڑھ جانا یا اس میں پانی پڑنا (Hydrocephalus)۔ آنکھوں میں تھکن اور درد، آنکھوں کا پھڑ پھڑانا، آنکھوں کے نیچے سوزش وغیرہ امراض میں شہد جزوی طور پر فائدہ مند ہوتا ہے۔

شہد: جراثیم کو مار دیتا ہے: جرمنی میں حال ہی میں ایک دوائی Nordisk Propolis کے نام سے تیار ہوئی ہے جو کیپسول، دانے دار شربت اور مرہم کی صورت میں برلن کی Sanhelios کمپنی نے تحقیقات کے بعد مارکیٹ میں پیش کیے ہیں، اس کے اثرات کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ڈنمارک کے پروفیسر لنڈ کے انکشافات اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں محققین نے یہ پتہ چلایا ہے کہ شہد میں ایک جراثیم کش عنصر Propolis کے نام سے موجود ہے، لیبارٹری تجربات کے مطابق یہ پیٹ اور سوزش پیدا کرنے والے جراثیم کو ہلاک کرنے کی قوت دوسری تمام ادویہ سے زیادہ رکھنے کے علاوہ جسم کی قوت مدافعت میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

مختلف لیبارٹریوں میں مشاہدات کے مطابق اسے ناک، کان، گلا، آلات انہضام، نظام تنفس اور اعصاب کی ہر قسم کی سوزش میں کسی بھی دوائی سے زیادہ مفید پایا گیا۔ یہ وہ منفرد دوائی ہے جو وائرس کو بھی ہلاک کرسکتی ہے انفلوئنزا اور زکام میں اس سے نہ صرف یہ کہ مریض تندرست ہوگئے بلکہ اس نے جھلیوں کی جلن کو فوراً دور کردیا۔ (طب نبوی اور جدید سائنس، ص189)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شہد ایک مکمل غذا اور قابل اعتماد دوا ہے۔ اس میں قدرت نے مختلف اجزا کو اس خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی بیماری میں اسے استعمال کرنا نقصان کا باعث نہیں ہوتا ہے، ذیابیطس کے مریضوں کو مٹھاس کی ممانعت ہوتی ہے، شہد میٹھا ہے، مگر اس کے باوجود شوگر کی بیماری میں مضر نہیں، چونکہ اس میں گلوکوس اور چینی نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تو ان کے ساتھ مکھیوں کے منہ سے نکلنے والے جوہر شامل ہوتے ہیں اس لیے وہ جسم میں جا کر کسی خرابی کا باعث نہیں بنتے۔

■

Mohd Sufyan Abdul Majeed Gohanvi, Jamia Islamia Sanabil, New Delhi - 110025

عبدالقدوس

ای اردو بکس
(E-Urdu Books)

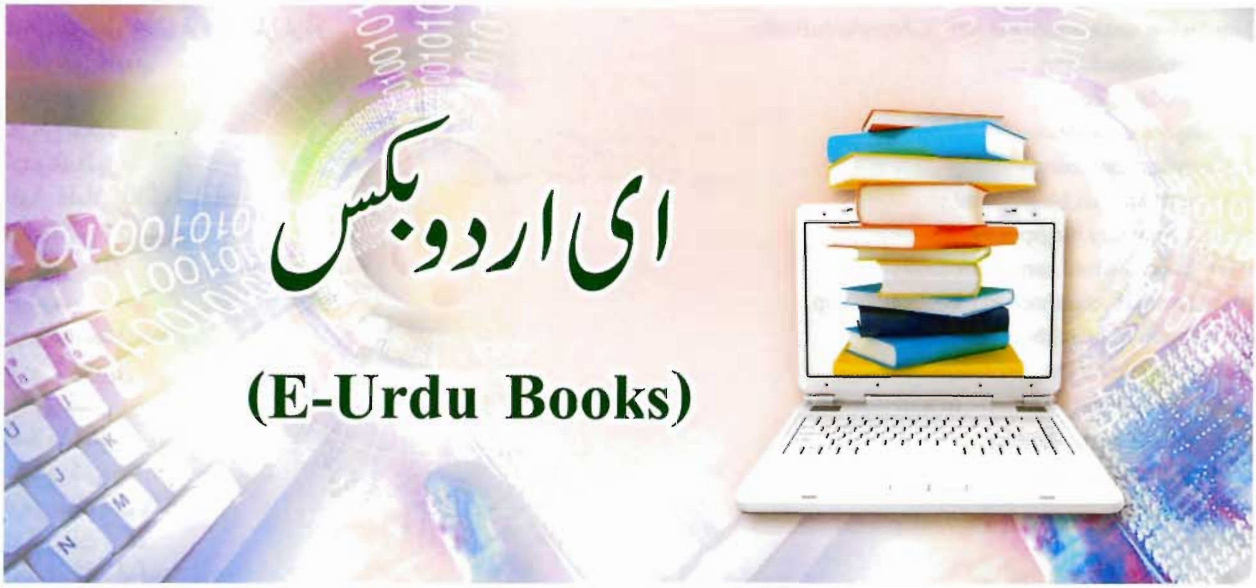

اکیسویں صدی کو ہم سائبر دور کے نام سے جانتے ہیں، جس نے نہ صرف دنیا کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا، بلکہ ان شعبوں میں نمایاں کارنامہ بھی انجام دیا۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ موجودہ دور کی سب سے زیادہ مفید اور حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اس کی مدد سے ہم دنیا کی بہت سی معلومات آن لائن حاصل کرنے لگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آن لائن تعلیم کا بھی رواج عام ہو گیا ہے۔ جسے ای ایجوکیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں ای ایجوکیشن، ای بکس، ای رسائل، جیسے الفاظ عام ہو گئے ہیں۔ آج میں اسی کی ایک کڑی ای بکس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں، اسی کے ساتھ اردو کی ای بکس کی لنک تک پہنچنے میں آپ کی رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دینا چاہتا ہوں۔

ای بکس انگریزی اصطلاح Electronic Books کا مخفف ہے۔ جس کا ترجمہ ایک ایسا برقی متن ہے جو عددی عوارض میں مروجہ اشاعت شدہ کتاب کا نعم البدل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ڈیجیٹل رائٹس مینجمنٹ نامی نظام کے ذریعے محفوظ کیا جاتا ہے۔ برقی کتب عموماً ذاتی کمپیوٹروں، اسمارٹ فون، یا موقوف ہارڈ ویئر، جنھیں ای بک ڈیوائسز کہتے ہیں پر پڑھی جاتی ہے۔(1)

طلبہ اور اساتذہ کو اپنے کورس سے متعلق مواد کی ضرورت ہوتی ہے، ریسرچ اسکالر اپنے تحقیقی مواد کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مگر کمپیوٹر کے اس حیرت انگیز جادوئی ڈبیہ نے ان کی تمام ضرورت اور پریشانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی ضرورت کو اس طرح پورا کر دیا جیسا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ زمانۂ قدیم میں اس کام کے لیے بہت سا وقت درکار ہوتا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ بہت سا اثاثہ بھی۔ مگر کمپیوٹر نے ان دونوں پریشانیوں سے علم کے پیاسوں کو بچا لیا ہے۔

سائبر دنیا میں اردو کی بہت سی سائٹیں موجود ہیں، جہاں ہم اپنی ضرورت کی کتابیں ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں، یا آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔ آج کے اس مضمون کا مقصد صرف یہی ہے کہ اردو داں افراد کو ان کتابوں کی لنکس تک پہنچانے میں رہنمائی کر سکوں۔

1. ادبی کتب

ادبی کتب سے متعلق سائٹیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

http://www.urduafsaney.com/
http://famousurdunovels.blogspot.in/
http://rekhta.org/ebooks
http://www.takhliqat.com/
http://www.iqbalcyberlibrary.net/
http://www.liveurdu.com/poetry/index.htm
http://www.urdumaza.com.pk/urdu-poetry/urdu-poets-list.php
http://www.urdufun.com/poetry/index.htm
http://www.javedakhtar.urdunetwork.com/urdu-2.html
http://jaunelia.itgo.com/
http://pirzadaqasim.4t.com/gindx.htm
http://urdulibrary.paigham.net/

2. تنقیدی کتب

تنقیدی کتب کا ایک بہت بڑا خزانہ انٹرنیٹ کی دنیا میں موجود ہے۔ ابھی تک لوگوں کو اردو کی کتابوں کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی تھی مگر اس نئی ٹکنالوجی نے تعلیم کے مرحلے کو بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ اب آپ گھر بیٹھے بہت سی کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سائبر دنیا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ابھی تک ہم قرب و جوار کی ہی کتابوں تک رسائی حاصل کر پاتے تھے مگر اس نے دنیا کو آپ کی مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ اب آپ اپنی انگلیوں کو حرکت دے کر ان کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو آپ کو مطلوب ہیں۔ ان کتابوں تک رسائی حاصل کرنے میں ہماری یہ لنک آپ کے ساتھ ہے، جہاں جا کر آپ کتابوں کو ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں یا آن لائن ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

3. نصابی کتب

نصابی کتب ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ آئے دن اخبار میں یہ خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ اردو میڈیم کی کتابیں ابھی تک شائع نہیں کی گئیں۔ اردو میڈیم کتابوں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ پہلے کتابیں دوسری زبانوں میں ترتیب دی جاتی ہیں پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرایا جاتا ہے۔ اس عمل میں اتنا وقت گزر چکا ہوتا ہے کہ ایک دو سال تک بچے بغیر کتابوں کے ہی امتحان دیتے ہیں۔ ان سائٹیوں سے طلبہ صرف اس حد تک فائدہ حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ نصاب دیکھ کر اپنے نصاب سے متعلق اسباق کا مطالعہ کر سکتے

قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو	http://www.urducouncil.nic.in/E_Library/urduBooks.
ڈاکٹرتقی عابدی	www.drtaqiabedi.com
دیدہ ور	www.deedahwar.net
عوض سعید	awazsayeed.com/ebooks.
اردو اسٹڈیز	www.urdustudies.com/
اقبال کلماتی بلاگ اسپاٹ	www.iqbalkalmati.blogspot.in/
اردو بکس لائبریری	urdubookslibrary.blogspot.in/
کسوٹی جدید	www.kasautijadeed.com/cms/elibrary/
ای مرکز	www.emarkaz.com/shop/store/books-urdu.php
اردو دوست ڈاٹ کام	www.urdudost.com/library/in
اردو لائبریری	kitaben.urdulibrary.org/
شعرو سخن	www.sherosokhan.com
اسلامك بکس	www.islamicbook.ws/urdu/
منہاج بکس	www.minhajbooks.com
اردو سیك ڈاٹ کام	urduseek.com
تذکیر ڈاٹ آرگ	Tazkeer.org
تصوف ڈاٹ آرگ	http://www.tasawwuf.org/
اردو بکس بلاگ اسپاٹ ڈاٹ کام	urdubook.blogspot.in
ورڈ پریس ڈاٹ کام	http://urdubookdownload.wordpress.com/
رحمانی نیٹ	http://www.rehmani.net/urdubooks.php
دنیا کی 130 شاہکار تصانیف (آڈیو میں)	http://www.server555.com/
الرسالہ ڈاٹ آرگ	http://www.alrisala.org/books/urdu-books/
سی پی ایس انٹر نیشنل	http://www.cpsglobal.org/books/mwk/urdu
اردو بلاگ	http://allurdubooks.blogspot.in/p/urdu-books.html
اردو آئی ٹی ڈاٹ نیٹ	http://www.urduit.net/
ابوالحسن علی ندوی ڈاٹ آرگ	http://www.abulhasanalinadwi.org/urdu.html
اردو بکس	http://www.apnaorg.com/books/u-booklist.shtml
اے آئی او اردو بکس	http://aiourdubooks.com/
بی فیر ڈاٹ آرگ	www.befare.org/category/publications/books/urdu-books/
پی ڈی ایف اسٹف ڈاٹ کام	http://pdfstuff.blogspot.in/
پنٹرسٹ ڈاٹ کام	http://www.pinterest.com/rhaq/free-pdf-books/
اردو پنچ بلاگ اسپاٹ	http://urdupunch.blogspot.in/
نالج فار یور لائف	http://knowledge4urlife.blogspot.in/
پاك ون ڈاٹ کام	http://www.pakwin.com/
اسکالرس ڈاٹ کام	http://www.scholaris.com/ebooks.htm
پی ڈی ایف فری ڈاٹ کام	http://www.pdfbooksfree.org/
آل اردو بکس بلاگ اسپاٹ ڈاٹ ان	http://allurdubooks.blogspot.in/
موسی میك ڈاٹ کام	http://mosimak.com/urdu-books
بھٹو ڈاٹ آرگ	http://www.bhutto.org/books-urdu.php
انقلاب ڈاٹ کام	http://inquilab.com/adab/adb-indx.htm
پی ڈی ایف اسٹف بلاگ اسپاٹ ڈاٹ کام	http://pdfstuff.blogspot.in/
پیغام اردو لائبریری	http://urdulibrary.paigham.net/
اباؤٹ اردو ڈاٹ بلاگ اسپاٹ ڈاٹ ان	http://abouturdu.blogspot.in/
ریختہ ڈاٹ آرگ	http://rekhta.org/ebooks
اسلامك بکس ہب ڈاٹ ورڈ پریس ڈاٹ کام	http://islamicbookshub.wordpress.com/category/urdu-books
ختم نبوت ڈاٹ آرگ	http://www.khatmenubuwwat.org/#
دیوبند ڈاٹ نیٹ	http://www.deoband.net/books.html
بکس ٹیوب ڈاٹ نیٹ	http://www.bookstube.net
ایس قیص ڈاٹ نیٹ	http://www.sqais.com/node/109
بکس بوسٹر ڈاٹ نیٹ	http://www.booksbuster.net/
اردو لائبریری ڈاٹ آرگ	http://www.urdulibrary.org/

ہیں۔اس سے متعلق سائٹیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

این سی ای آر ٹی: www.ncert.nic.in

این سی ای آر ٹی ہندوستان کا ایک اہم ادارہ ہے جس کے ذمے نصابی کتب کی تیاری ہے۔اس سائٹ پر جاکر ہم نصاب کی کتابوں کو اردو میڈیم میں ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں،اوراپنی سہولت کے اعتبار سے پڑھ سکتے ہیں۔

پی کے نوٹس ڈاٹ کا: http://www.pknotes.com/

یہ پاکستان کی سائٹ ہے، جس پر جاکر پرائمری سے ایم اے تک کی کسی بھی موضوع کی کتابیں اردو میڈیم میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس سائٹ سے وہ طلبہ و طالبات زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں،جن کی تعلیم کا میڈیم اردو ہے۔

4. **لغات**

آن لائن لغات کی ایک بہت بڑی تعداد انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ جہاں پر جا کر ہم ان نئے الفاظ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں جن کے معنی سے ہم واقف نہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ انٹرنیٹ پر جہاں قدیم واہم لغات موجود ہیں وہیں، بہت سی ڈکشنریاں سافٹ ویئر کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ایسی ڈکشنریوں میں جاکر ہمیں جس لفظ کے معنی تلاش کرنا ہوتا ہے،اسے ٹائپ کر کے اس کے معنی سرچ کر لیتے ہیں۔قدیم لغات کو زیادہ تر پی ڈی ایف فائل میں پیش کیا گیا ہے۔اسے ہم بآسانی ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔مندرجہ ذیل میں پیش کی گئی ڈکشنریاں بالکل فری ہیں آپ بغیر کسی قیمت کے ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔

http://www.urducouncil.nic.in/E_Library/Encycolopedia-Aur-Lughaat.html

قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو دہلی کی جانب سے شائع کردہ تمام لغات یہاں آن لائن موجود ہیں۔ان لغات میں کلیم الدین احمد کی 'جامع انگریزی اردو لغت' جلد اول تا ششم، 'جامع اردو انسائکلو پیڈیا' NC PUL کی تمام جلدیں اور فضل الرحمان کی 'اردو انسائکلو پیڈیا' کی تین جلدیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام کی تمام کو آپ ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں اور اپنی سہولت کے اعتبار سے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

http://englishtourdutranslation.com/english-dictionary/ اردو سے انگریزی،انگریزی سے اردو میں معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.urduword.com/ انگریزی سے اردو میں معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://hamariweb.com/dictionaries/ انگریزی، ہندی، اردو، عربی، اسپینش، جرمن، فرنچ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://apniurdu.com/Dict/index.html انگریزی سے اردو میں معنی سرچ یعنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://rekhta.org/Dictionary اردو، ہندی اور انگریزی کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.ijunoon.net/urdudic/ انگریزی سے اردو،اردو سے انگریزی میں معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.employees.org/~daftary/urdu.html انگریزی سے اردو،اردو سے انگریزی کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.learningurdu.com/urdudictionary.asp انگریزی کے حروف تہجی کے اعتبار سے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.lexilogos.com/english/urdu_dictionary.htm ایک ہی سائٹ پر بہت سی ڈکشنریاں موجود ہیں اپنی ضرورت کے مدنظر کسی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

http://urduseek.com/ انگریزی سے اردو،اڈوانس ڈکشنری ہے، جہاں ہم کسی لفظ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://dictionary.babylon.com/ کئی زبانوں کی ڈکشنریاں موجود ہیں۔ جہاں جا کر ہم ان الفاظ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.poshmaal.com/urdu/ اردو سے انگریزی میں یہ ڈکشنری ہے۔یہاں جاکر ہمیں رومن اردو میں لفظ ٹائپ کر کے سرچ کرنا ہوگا۔

http://dictionary.onepakistan.com.pk/ اردو سے انگریزی ،انگریزی سے اردو میں معنی سرچ کر سکتے ہیں۔

http://182.180.102.251:8081/oud/trouble_help.htm# اردو سے انگریزی یا انگریزی سے اردو میں معنی سرچ کر سکتے ہیں۔اس لنک پر اردو کی تختی بھی موجود ہے،ہم اس کی مدد سے اردو میں لکھ کر مطلوبہ معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.englishurdudictionary.pk/ انگریزی سے اردو ڈکشنری ہے،اس لنک پر ہم لفظ لکھ کر بھی معنی سرچ کر سکتے ہیں، یا حروف تہجی کے اعتبار سے دیکھ کر بھی معنی

تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

http://www.123freenet.com/dictionary/index.php اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو میں معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://englishtourdudictionary.pk/ انگریزی کے حروف تہجی کے اعتبار سے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.urdu123.com/ انگریزی سے اردو ڈکشنری، کسی لفظ کے معنی سرچ کر سکتے ہیں۔

http://www.freelang.net/dictionary/urdu.php اس سائٹ پر جا کر ہم ڈکشنری کا سافٹ ویر ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں۔

http://www.iqbalcyberlibrary.net/Urdu-Books/969-416-217-024/
علامہ اقبال سائبر لائبریری کی آن لائن ڈکشنری ہے۔ جہاں اردو سے اردو حروف تہجی کے اعتبار سے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.pakpoll.com/dictionary/ انگریزی سے اردو کے معنی سرچ کر سکتے ہیں۔

http://www.studypart.com/ انگریزی سے اردو، اردو سے انگریزی کے معنی بھی تلاش کر سکتے ہیں، اور حروف تہجی کے اعتبار سے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

http://www.dicts.info/dictlist1.php?l=urdu کسی بھی زبان کی ڈکشنری ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں۔

http://english-urdu-dictionary-lite.soft112.com/ ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں۔

http://www.dictionaryurdutoenglish.com/ اردو سے انگریزی معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.urdu.dictionarypk.com/ اردو سے انگریزی

http://dictionary.englishtourdutranslation.com/ انگریزی سے اردو

http//888books.blogspot.in/2012/09/feroz-ul-lughat-urdu-to-urdu-dictionary.html
فیروز الغات کی چار مکمل جلدیں ڈاون لوڈ کر سکتے ہیں۔

http://dsal.uchicago.edu/dictionaries/platts/ اس سائٹ سے بھی فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔

http://www.studypart.com/ اردو انگریزی ڈکشنری

http://www.urduword.com/ انگریزی سے اردو، اردو سے انگریزی، رومن اردو سے انگریزی، میں معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://urdu2hindi.wordpress.com/ اردو سے ہندی ڈکشنری اس لغت میں ہم موجود معنوں کو دیکھ سکتے ہیں۔

http://hamariweb.com/dictionaries/hindi-urdu-dictionary.aspx
اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو لفظ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.dicts.info/dictionary.php?l1=urdu&l2=hindi اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو معنی تلاش کر سکتے ہیں۔

http://www.urduencyclopedia.org/urdudictionary/ اردو سے انگریزی الفاظ کے معنی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس سائٹ کے ہوم پیج پر انسائیکلو پیڈیا، فرہنگ نفسیات، اور ناموں کا انسائیکلو پیڈیا بھی موجود ہے۔ آپ ان سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔

5. بچوں کی کتابیں

اب لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال در آیا ہے کہ موجودہ دور میں بچوں کا ادب نہیں لکھا جا رہا ہے۔ اور نہ ہی بچوں کے رسائل نکل رہے ہیں جس سے بچوں میں شوق مطالعہ پیدا ہو۔ میں ان لوگوں کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ بچوں سے متعلق بہت سا مواد انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ بہت سے آن لائن رسائل بھی موجود ہیں۔ مگر لوگوں کی وہاں تک رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ میں کچھ سائٹیں ذیل میں پیش کر رہا ہوں۔

http//www.urducouncil.nic.in/E_Library/Bachon-Ka-Adab-Childrens-Literature.html
http://www.phool.com.pk/
http://www.pakwatan.com/pages/urdu_children.php
http://www.urduclassic.com/childrens.htm
http://www.urdupoint.com/children/home/
http://www.itdunya.com/t100988/
http://www.ibtada.com/
http://pdfbooksfree.pk/category/urdu-kids-stories/
http://www.pdfbooksfree.org/
http//www.iqbalcyberlibrary.net/Urdu-Books/969-416-206-011/p0001.php
http://www.urdupoint.com/children/home/
http://www.urdudost.com/library/atfaal.php
http://urdubookdownload.wordpress.com/
http://www.786books.com/search_result.asp?Category=children
http://www.pinterest.com/rhaq/urdu-kids-stories/
http://urdustories.blogliterature.org/tag/books-for-kids/

امید ہے کہ اردو کا ایک بہت بڑا طبقہ اس مضمون سے فیض حاصل کر کے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کرے گا۔

حوالہ

(۱) برقی کتاب و یکی پیڈیا

■

Abdul Quddus, Jr. Lecturer Urdu Govt. Junior College,
Chanchalguda, Hyderabad - 500024 (AP)

تبصرہ وتعارف

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ششم)، انشائیے (دوم)
ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 380، قیمت: 118 روپے، سن اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: محمد مقیم خان، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر تبصرہ کتاب 'کلیات رشید احمد صدیقی' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے منصوبے کلاسیکی ادب کی بازیافت سے تعلق رکھتی ہے۔ 'کلیات رشید احمد صدیقی' نہ صرف مجموعوں اور متفرق تحریروں کا اجتماع ہے بلکہ ایک عہد، وضع اور تہذیب کی دستاویز بھی ہے۔

ہمارے سامنے موجود کلیات کی اہمیت اور افادیت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب اس کی ترتیب وتدوین کے ذمے داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہو۔ علی گڑھ کے حوالے سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور رشید احمد صدیقی میں ایک رشتہ بھی قائم ہوتا ہے۔ بلاشبہ ابوالکلام قاسمی صاحب کو آج یہ درجہ حاصل ہے کہ ان کی تحریریں نہ صرف علمی حوالوں سے پُر ہوتی ہیں بلکہ نئی نسل کی تربیت بھی کررہی ہیں۔

رشید صاحب طنز ومزاح کے نابغہ تو تھے ہی۔ ان کے انشائیوں اور طنزیات ومضحکات کے مختلف رنگ ہیں اور ان میں فن سے متعلق بیشتر امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ رشید صاحب کی اہم تصانیف میں مضامین رشید، خنداں، خطوط، 'گنج ہائے گراں مایہ'، ہم نفسان رفتہ، آشفتہ بیانی میری اور طنزیات ومضحکات (مجموعہ) کا شمار ہوتا ہے۔ رشید صاحب کے خطوط کے تقریباً چھ مجموعے شائع ہوچکے ہیں جو مختلف مشاہیر اور اقربا کے نام ہیں۔ مثلاً مسعود حسین صاحب کے نام، خلیق احمد نظامی صاحب کے نام، مسعود حسین صاحب کا مرتب کیا ہوا مجموعہ، لطیف الزماں خاں کا مرتب کیا ہوا مجموعہ، خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کو لکھے گئے خطوط کا مجموعہ اور آل احمد سرور کے نام لکھے خطوط جن کو سرور صاحب نے خود مرتب کیا ہے۔

اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ رشید احمد صدیقی کا مزاح تبسم زیر لب کی کیفیت رکھتا ہے اور فرحت وانبساط کا ماحول تحریر میں اول تا آخر جاری وساری رہتی ہے۔ رشید صاحب کے موضوعات متنوع ہیں۔ تنوع کا اندازہ لگانے کے لیے انشائیوں کی کلیات نہیں بلکہ زیر تبصرہ کلیات کے انشائیوں کا دوسرا حصہ ہی کافی ہے۔ اس حصہ کا آغاز 'شب ماہ میں چاند سے دو دو باتیں' نامی انشائیے سے ہوتا ہے اور اختتام انشائیہ 'مان نہ مان' پر ہوتا ہے۔ اب ان دو کے درمیان جو ہیں ان میں 'کائنات عالم پر ایک سرسری نظر'، 'مشاہیر یونان'، 'حیات بعد الممات'، 'آل انڈیا مینڈک کانفرنس'، 'خودکشی'، 'کاہلی'، 'افیونی'، 'فلسفۂ ازدواج'، 'اُر'، 'چندا ماموں'، 'شاعری میں خرافات'، 'خبطی'، 'مانگے کی کتابیں پڑھنا' وغیرہ ہیں۔ انشائیوں کے اس کلیات میں کل 37 انشائیے شامل ہیں۔

رشید صاحب کی طنز میں بذلہ سنجی اور ایک قسم کا فلسفیانہ اور علمی رنگ پایا جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا نے انھیں 'مفکر' کہہ کر بھی یاد کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی صاحب کی یہ بات اپیل کرتی ہے کہ:

''...رشید احمد صدیقی کو پڑھ کر ہمیں اس بات کا قائل ہوجانا پڑتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار ہونے کے علاوہ ایک دیدہ ور مفکر، سنجیدہ و بے باک تجزیہ نگار نیز اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ادارے (علی گڑھ) کے سچے بہی خواہ اور قوم وملت کے حقیقی غم خوار بھی ہیں... ان کو قومی، لسانی اور ملّی مسائل سے کتنی گہری وابستگی تھی اور انھوں نے عرصے تک ان کے مسائل پر کس بصیرت افروز انداز میں غور وفکر کیا تھا۔'' (ص: VIII)

مندرجہ بالا دعوے کس حد تک سچے ہیں اس بات کا اندازہ رشید احمد صدیقی کی کلیات کو پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے کے بعد ہر قاری قائل ہوگا۔

اس کلیات کی افادیت محض اتنی ہی نہیں کہ رشید احمد صدیقی کی تمام تحریریں یکجا ہوگئیں ہیں بلکہ ابوالکلام قاسمی صاحب نے اسے مزید مفید بنادیا ہے۔ رشید صاحب کی تحریروں کی ایک کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ مقامی رنگ غالب ہونے اور بعض ہنگامی اشاروں کی وجہ سے آفاقیت معدوم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات لوگوں کے حافظے سے محو ہوجاتے ہیں اور تحریریں اپنی جاذبیت کھو دیتی ہیں۔ رشید صاحب کی تحریروں کے ساتھ اب تک ایسا نہیں ہوا کہ تحریریں اپنی جاذبیت کھو دیں۔ لیکن وہ عنصر ان کی تحریروں میں ضرور ہے جسے کمزوری کا نام دیا گیا ہے۔ وزیر آغا صاحب نے رشید صاحب کی ایسی تحریروں میں 'اُر' کو بھی شامل کیا ہے جس سے قاری پوری طرح لطف نہیں اٹھا پاتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے نہ صرف تحریروں کے ماخذ کی نشان دہی کی ہے بلکہ حاشیے میں ایسی باتوں کی وضاحت بھی کردی ہے جن کی وجہ سے قاری پوری طرح لطف نہیں اٹھا پاتا۔ یعنی مقامی رنگ کے غلبہ کا حجاب قاری کے درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔

یہ اندراج ابوالکلام قاسمی صاحب کی محنت اور تلاش وجستجو کا مظہر ہے۔

کلاسیکی متون کی بازیافت کے منصوبے میں رشید احمد صدیقی کی تحریروں کو شامل کرنے کے لیے ادارہ اور اس ذمے داری کو قبول کرنے کے لیے ابوالکلام قاسمی صاحب شکریے کے مستحق ہیں۔ اور جوں جوں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے مبارک باد کا فریضہ بھی ہم پر عائد ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کی نگارشات ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے تو دیکھی ہی جاتی ہیں، امید کرتا ہوں کہ یہ کلیات بھی ادارہ اور مرتب کی کاوشوں کے ساتھ قبولیت حاصل کرے گا اور ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

بوستاں کی کہانیاں

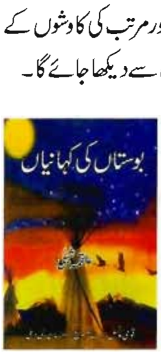

مرتب: علقمہ شبلی
صفحات: 87، قیمت: -/15 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال

شیخ سعدیؒ تقریباً آٹھ صدی قبل ایران کے مشہور شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بغداد چلے گئے۔ وہاں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے، جو اس زمانے میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ان کی علمی صلاحیتوں کے باوصف ان کے ساتھی ان پر رشک کرتے تھے۔ بہت جلد ان کا شمار معروف عالموں میں ہونے لگا۔ ان کی تصانیف میں گلستاں اور بوستاں بڑی شہرت کی

حامل رہی ہیں۔ ان میں اوّل الذکر نثر اور موخر الذکر منظوم ہے۔ گلستاں جہاں مسجع عبارت کا ایک شاہ کار ہے، وہیں بوستاں نظم کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی کلاسیکی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں شیخ سعدیؒ نے بڑے ناصحانہ انداز میں سیرت واخلاق، فضیلت وقناعت اور تربیت وآداب کے بیش بہا نمونے پیش کیے ہیں۔

پیش نظر کتاب بوستاں کی کہانیاں جن کو معروف قلم کار علقمہ شبلی نے ترتیب دیا ہے، ایک عمدہ کتاب ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اس کی اشاعت کے ساتھ بچوں کے ادب کو ایک نئی جہت دی ہے۔ علقمہ شبلی نے ترتیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ الفاظ ایسے استعمال کیے جائیں، جو بچوں کو جلد سمجھ میں آجائیں اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے وہ سبق حاصل کریں۔ اس کتاب میں جو اخلاقی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ایک لافانی شاہ کار ہے۔

ایک حکایت کا عنوان ہے 'امیر ختن اور ریشمی کپڑا'۔ اس حکایت میں بادشاہوں کے تحائف اور ان کے خوشامدیوں کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے بڑی دلچسپ گفتگو کی گئی ہے۔ ترکستان کا ایک علاقہ 'ختن' کہلاتا ہے۔ ایک مرتبہ وہاں کے بادشاہ نے ایک بزرگ کو ریشمی لباس بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسے قبول کرلیں اور اپنے استعمال میں لائیں۔ بزرگ نے بادشاہ کی خواہش کے مطابق اس لباس کو پہن لیا اور بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے اوپر اپنی گدڑی پہنی اور کہلا بھیجا:

''بادشاہ نے جو لباس بھیجا ہے، وہ بہت ہی اچھا اور قیمتی ہے، لیکن میرا اپنا لباس اس سے زیادہ اچھا ہے۔ اگر انسان آزادرہ کر زمین پر سوئے تو اس سے زیادہ اچھا ہے کہ وہ قالین کے لیے کسی کی خوشامد کرے''۔

اس سے بزرگوں کی بادشاہ کے انعامات سے نہ صرف بے نیازی ثابت ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انعامات اور تحائف لینے سے اگر دینے والے کو خوشی حاصل ہوتی ہو تو انھیں قبول کرلینا چاہیے۔

علقمہ شبلی نے چھوٹے چھوٹے جملوں کو اتنی خوب صورتی سے سجایا ہے کہ انھیں مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یقین ہے یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دوسری کتابوں کی طرح پذیرائی حاصل کرے گی اور بچوں کے ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک بڑے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ
مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا ویسا پایا

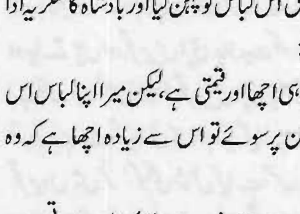

مرتبین: سید امتیاز الدین، محمد تقی
صفحات: 407 و 384، قیمت: 450 و 450 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنہ اشاعت: 2013
مبصر: پروفیسر محمد ظفرالدین
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اُردو کے ممتاز ادیب پدم شری مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فکر وفن پر حال ہی میں اُن کے دو شیدائیوں سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے بیک وقت دو ضخیم کتابیں ترتیب دی ہیں جن میں مشاہیر ادب کے ایک سو گیارہ مضامین، منظوم خراج تحسین اور انٹرویوز شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں گرچہ بالکل الگ الگ شائع کی گئی ہیں تاہم ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ انھیں جلد اول جلد دوم کی حیثیت سے بھی شائع کیا جاسکتا تھا۔ مضمون نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے میدانِ کارزار میں جو کوئی قلم کار اُن سے ملا، مجتبیٰ حسین پر لکھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ یہ فہرست بہت طویل اور متنوع ہے۔ گزشتہ نصف صدی قبل سے لے کر آج تک کے غالباً ہر ایک اہم ادیب نے مجتبیٰ حسین کے فن اور اُن کی شخصیت پر اپنی رائے، تاثرات، تنقیدی اور تجزیاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اُردو طنز ومزاح کے حوالے سے مجتبیٰ حسین کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ اُردو ادب کے تابندہ ودرخشاں ستارے اور معاصر طنز ومزاح کے گل سرسبد ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے بے شمار مضامین، کتابیں، رسائل کے خصوصی شمارے اور یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالے منظر عام پر آچکے ہیں۔ تحریروں کی شگفتگی کے ساتھ خدائے برتر نے اُنھیں حاضر دماغی اور برجستگی سے بھی نوازا ہے جن سے وہ اپنی تحریروں کے ساتھ محفلوں کو بھی گل وگلزار کیے رہتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں بزبان حالی کہا جاسکتا ہے کہ اُنھیں مطالعہ کائنات، تفحص الفاظ اور قوت متخیلہ تینوں ہی حاصل ہیں جن سے وہ بخوبی کام لیتے ہیں۔ اُن کا فن محض ہنسنے ہنسانے کا فن نہیں ہے بلکہ وہ اپنے قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں دعوت فکر تو ضرور دیتی ہیں مگر ان کے یہاں مبلغ یا خشک مقرر وناصح کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ ان کا قاری نرم وگداز روش پر چلتے ہوئے بڑے سکون سے اپنی منزل تک کا سفر طے کرلیتا ہے۔ وہ رستے میں گدگدی، کیف آگیں کیفیات اور مسرت آمیز لمحات سے دوچار ہوتا ہے۔

زیر نظر پہلی کتاب 'مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ' کو مرتبین نے 'حیدرآبادی تہذیب کی روشن علامت اور مجتبیٰ حسین کے محسن وسرپرست نواب شاہ عالم خاں کے نام' معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں 49 مضامین اور انٹرویوز شامل ہیں جن میں ان کے فن مزاح نگاری، خاکہ نگاری اور سفر ناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے قلم کاروں میں آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، قمر رئیس، مغنی تبسم، عتیق اللہ، انور سدید، شمیم حنفی اور مظہر امام جیسی بلند پایہ ادبی شخصیات شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور ان کے فن کے مختلف جہات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مذکورہ کتاب میں مجتبیٰ حسین کے تحریر کردہ خاکوں پر 12 مضامین شامل ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے بے شمار خاکے قلم بند کیے ہیں جو آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ اور ہوئے ہم دوست جس کے، کے عنوان سے چار کتابوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ بقول انور سدید ''مجتبیٰ حسین مزاح نگار ہیں لیکن شوکت تھانوی کی طرح اُنھوں نے خاکہ نگاری میں مزاح کو مقصد اول کی حیثیت نہیں دی، نہ خاکہ اُڑانے کی کوشش کی ہے بلکہ زیر قلم شخصیت کا ایک مثبت تاثر ان واقعات سے مرتب کیا ہے جو ملاقاتوں کے دوران خود مجتبیٰ حسین نے حاصل کیا ہے۔'' (ص۔ 195)

زیر نظر دوسری کتاب 'مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا ویسا پایا' کو مرتبین نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کے سربراہ جناب مجتبیٰ خان کے نام منسوب کیا ہے ''جنھوں نے سچی لگن، کڑی محنت اور جانفشانی کے ذریعے برصغیر میں نہ صرف اردو پبلشنگ کی نئی صورت گری کی بلکہ اسے ایک نیا اعتبار اور اونچا مقام بھی عطا کیا ہے۔'' اس کتاب میں 50 مضامین، ایک انٹرویو اور 11 منظوم خراج تحسین شامل ہیں۔ ہندوپاک کے اہم ترین لوگوں نے مجتبیٰ حسین اور اُن کے فن کے تعلق سے بہت کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ مضمون نگاروں میں وحید اختر، گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ (دو مضامین) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، وہاب عندلیب اور خالد قادری وغیرہ شامل ہیں۔ وحید اختر کا پہلا ہی مضمون ہے جس میں اُنھوں نے بڑی خوبصورتی سے حیدرآباد کے انتشار کے زمانے کی تصویر کشی کی ہے۔

اس کتاب میں مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور اُن سے متعلق ذاتی معلومات وافر مقدار

میں موجود ہیں۔ مرتبین سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے یہاں ایسے مضامین کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ مثلاً مجتبیٰ حسین کی شخصیت' خدوخال' افراد خاندان' بھائیوں کے بارے میں' پدم شری ملنے پر تاثراتی مضامین' اُن کی بیگم کا انٹرویو' بیٹی کا اپنے ابا کے بارے میں اور ایک مضمون خود مجتبیٰ حسین کا اپنے بارے میں موجود ہے۔ مزید کچھ مضامین کے عنوانات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ ناقدین ادب نے مجتبیٰ حسین کو کس مسند ادب پر بٹھایا ہے مثال کے طور پر دھان پان طنز و مزاح' طنز و مزاح کا خانہ خالی' مجتبیٰ حسین (مشتبہ آدمی)' اُردو ادب کا سپر مین' پختہ اعتقاد کا مرکزی ادیب' محبتوں کا اسٹاک ایکس چینج' سایہ دار آدمی' اُردو کا شریر ادیب' طنز و مزاح کا کوہ پیما' من موہن مجتبیٰ' آفتاب مزاح' برسات میں دھوپ' خاکوں کا مسیحا وغیرہ وغیرہ۔ یہ عنوانات ازخود وہ بیان کر رہے ہیں کہ مقالہ نگاروں نے بے شمار زاویہ نگاہ سے مجتبیٰ حسین اور اُن کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجتبیٰ حسین مبارکباد کے قابل ہیں کہ اُنھوں نے ایسی خداداد صلاحیت پائی کہ قلمکاروں نے اُن کے بارے میں خوب خوب لکھا اور اُن کے مداحوں نے اُن مضامین کو دو ضخیم کتابوں کی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ ایک ادبی سرمایہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان جڑواں کتابوں کی خوب خوب پذیرائی ہوگی۔

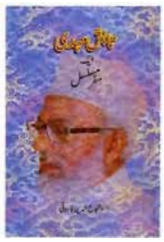

تابش مہدی ایک سفر مسلسل

مصنف: ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

صفحات: 327، قیمت: 325 روپے

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

مبصر: ساجد ذکی فہمی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

زیر تبصرہ کتاب 'تابش مہدی ایک سفر مسلسل' ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی کی ایک ایسی تخلیق ہے جو تحقیقی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے لائق تحسین ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں تابش مہدی کے سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی اب تک کی علمی وادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ چونکہ تابش مہدی کی علمی وادبی سرگرمیاں اب بھی بدستور جاری ہیں اس لیے مصنف کی اس کاوش کو سراہا تو جاسکتا ہے مگر مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ تابش مہدی کے حیات سے ہونے کی بنا پر ہی مصنف نے اس میں 'ایک سفر مسلسل' کے الفاظ جوڑ دیے تا کہ حسب دستور بعد کو اس میں اضافے کی گنجائش باقی رہے۔ یا پھر دوسری وجہ یہ رہی ہوگی کہ بچپن سے لے کر اب تک تابش مہدی نے اس قدر سفر کیے ہیں کہ سفر کو ان کی زندگی کا جزوِلاینفک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے سفر کو زندگی کا جزوِلازمی قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز   سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

یہ بات تابش مہدی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

''سفر میری زندگی کا جزوِلاینفک بن چکا ہے۔ میں اس وقت سے سفر کر رہا ہوں جب عمر کی بارہویں منزل میں تھا۔ اب تو ایک مدت سے سفر ہی سے آذوقۂ حیات وابستہ ہے۔''

بہر حال مصنف کی یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا باب تابش مہدی: سوانحی سفر، دوسرا تابش مہدی: قلمی سفر، تیسرا تابش مہدی علمی سفر بذریعہ ریڈیو، ٹی۔ وی وغیرہ، چوتھا تابش مہدی: بحیثیت غزل گو، پانچواں تابش مہدی: حمد گو، مداح رسول اور منقبت نگار، چھٹا تابش مہدی: بحیثیت ناقد و محقق، ساتواں تابش مہدی: اعزازات، انعامات اور نذرانۂ عقیدت، آٹھواں تابش مہدی: اہل علم وقلم اور ارباب دانش کی نظر میں، نواں تابش مہدی، نمونہ کلام کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ایک بات یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مصنف نے ہر باب کی ابتدا میں 'تابش مہدی' کا نام نہ جوڑا ہوتا فقط سوانحی سفر، قلمی سفر، علمی سفر وغیرہ لکھ دیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کیوں کہ پوری کتاب کا محور و مرکز تابش مہدی ہی ہیں۔

مصنف نے اپنے قائم کیے ہوئے ابواب کے ساتھ حتیٰ الوسع انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بعض چیزوں کو سمجھنے میں ان سے سہو ہوا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے باب میں جہاں انھوں نے تابش مہدی کے تلامذہ کا ذکر کیا ہے اس میں سلیمان صادق کو بھی تابش مہدی کا شاگرد بتایا ہے۔ جو کہ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے باطل قرار پاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلیمان صادق صاحب کے انتقال کے بعد ان کے داماد آفاق منظر صاحب نے ان کی ڈائری کو چھپوانے کی خواہش ظاہر کی اور اس غرض سے اس مسودے کو لے کر تابش مہدی کے پاس پہنچے جس میں انھوں نے چند ترمیمات و اضافے کیے اور ایک دیباچہ لکھ دیا۔ لہٰذا اس بنا پر سلیمان صادق کو ان کے باقاعدہ شاگردوں کی فہرست میں شامل کرنا درست نہیں۔

اس سے قطع نظر 327 صفحات پر مشتمل شجاع الدین فاروقی کی یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک تحقیقی مقالے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں شامل شدہ ابواب کے تحت انھوں نے بڑی تفصیلی بحث بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر باب پنجم میں جہاں انھوں نے نعت و منقبت کی تعریف، تاریخ اور ارتقا کا ذکر کیا ہے وہیں اردو نعت گوئی کی خامیوں کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ چونکہ بعض نعت گویوں نے حضورؐ کے جسم اطہر کا ذکر یا ہجر کی تڑپ اور وصال کی آرزو کو اس انداز سے اپنے اشعار میں پرونے کی کوشش کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے نعت نہیں عشقیہ غزلیں کہی جا رہی ہیں۔ اس پر مزید طرّہ یہ کہ شعرا نے نعت کے لیے بھگتی گیتوں اور بھجنوں کے طرز کو بھی اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس باب میں انھوں نے اردو کے کئی نعت گویوں کو طنز کا نشانہ بنایا جس میں محسن کاکوری جیسے بڑے نعت گو بھی شامل ہیں۔

کتاب کی طباعت اور جلد سازی کافی عمدہ ہے۔ ایک اہم بات یہ کہ دو ایک جگہوں کے علاوہ پروف کی غلطی کہیں دکھائی نہیں دیتی، ورنہ بعض کتابیں ایسی بھی نگاہ سے گزری ہیں جسے کھول کر مجبوراً بند کر دینا پڑا۔ سرورق پر تابش مہدی کی ایک تصویر بھی چھپی ہے، جس سے اس کتاب کے حسن میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن صفحات کے اعتبار سے کتاب کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی کی یہ کوشش لائق ستائش ہے اور امید ہے کہ ان کی یہ کتاب اردو حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

مخمور سعیدی: ہمہ جہت فنکار

مرتبین: پریم گوپال متل اور ارشد علی خاں

صفحات: 400، قیمت 250 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: شبنم راہی، R 13 نفیس روڈ بٹلہ ہاؤس اوکھلا، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'مخمور سعیدی: ہمہ جہت فنکار' چار سو صفحات اور کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں مرتبین پریم گوپال متل اور ارشد علی خاں نے مخمور سعیدی کے سوانحی کوائف، تجربۂ ادارت اور ادبی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شعری، نثری اور ترجمہ شدہ کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مخمور سعیدی کی شخصیت اور مختلف جہات پر تحریر کردہ کتابیں اور ان پر دیگر رسائل میں شائع خصوصی گوشے اور ان پر کیے گئے تحقیقی کاموں کو یکجا کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ملک و بیرون ملک ان کے اسفار اور انھیں ملنے والے اعزازات کی فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔

باب اول میں گوپال متل، رشید حسن خاں، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر اطہر فاروقی، پروفیسر سیدہ جعفر، نثار احمد فاروقی، لطف الرحمٰن، رفعت سروش، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، انور صدیقی،

پی پی سریواستو رند، راغب الدین، مصوّر سبزواری، ڈاکٹر محمد حسین، ابوفیض سحر، پروفیسر احتشام اختر اور شکیل احمد عاصم بریلوی جیسے اہل قلم حضرات کے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن کے ذریعے مخمور سعیدی کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا مضمون گوپال متل کا ہے۔ گوپال متل نے پوت کے پیر پالنے میں دیکھ کر مخمور سعیدی کے ابتدائی دور میں پیشن گوئی کرتے ہوئے ان کا جو تعارف پیش کیا تھا، اس کا اعتراف تمام اہل قلم حضرات نے بھی اپنے مضامین میں کیا ہے۔ اس باب کے تقریباً تمام ہی مضامین لائق مطالعہ ہیں اور مخمور سعیدی کے علمی، ادبی، فکری، فنی جہات کو روشن کرتے ہوئے ان کے کردار، عادات واخلاق اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پرت در پرت کھولنے میں کامیاب ہیں۔ خصوصاً مجتبیٰ حسین، پروفیسر لطف الرحمن، رفعت سروش، ابوالفیض سحر کے مضامین کتاب کو مقناطیسی کشش عطا کرتے ہیں اور یہ مضامین بلاشبہ قاری کی دلچسپی کا مرکز بنیں گے۔

باب دوم میں مخمور سعیدی کے مختلف مجموعہ کلام پر کیے گئے اہم تبصروں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں نیاز فتح پوری (گفتنی)، ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی (آواز کا جسم)، سلیمان اطہر جاوید (میرے عہد کی صدائیں)، بانی (سیہ بر سفید) جیسے اہل قلم حضرات کے تبصرے کتاب میں شامل ہیں۔

مخمور سعیدی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شاعر کو اگر نثر لکھنے کے مواقع فراہم کر دیے جائیں تو وہ بہترین نثر لکھ سکتا ہے۔ مخمور سعیدی نے کہیں لکھا بھی ہے کہ مجھے نثر لکھنے کی مہارت 'تحریک' میں کام کرنے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ ان کی نثری تخلیقات کی اہمیت کو باب سوم بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ اس باب میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، بسمل سعیدی، گوپال متل، ساحر لدھیانوی اور شین کاف نظام جیسی شخصیات پر مخمور سعیدی کے تحریر کردہ مضامین ان کی صلاحیتوں کو واشگاف کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

باب چہارم میں مخمور سعیدی کی کچھ منظوم تخلیقات (گفتنی، سیہ بر سفید، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا، دیوار و در کے درمیاں، آواز کا جسم، واحد متکلم) سے کچھ نظموں اور غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ مخمور سعیدی کے علم وفن، احساس وجذبات کی عکاسی کرتی ہوئی دل کو چھو لینے والی ان کی شاعری ہمارے سامنے ان کا بہترین تعارف پیش کرتی ہے۔

بالآخر یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'مخمور سعیدی: ہمہ جہت فنکار' مخمور سعیدی پر خاصا مواد فراہم کرتی ہوئی ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اس کے ذریعے پریم گوپال متل نے علمی وادبی وراثت کو سنبھالتے ہوئے اپنی ترتیب شدہ کتابوں کی فہرست میں خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ زیر نظر کتاب مرتبین کی جانب سے مخمور سعیدی کو ایک بہترین خراجِ عقیدت ہے۔

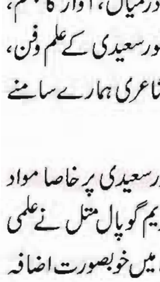

ترجیحات و توجیہات

مصنف: ڈاکٹر محبوب راہی

صفحات: 176، قیمت 175 روپے

ناشر: اسباق پبلی کیشنز، لوہ گاؤں روڈ، پونہ

مبصر: ڈاکٹر غافل انصاری، اسلام باغ، شیخ سرائے سیتاپور یوپی

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کے مالی تعاون سے شائع 'ترجیحات وتوجیہات' بظاہر ڈاکٹر محبوب راہی کے تنقیدی وتجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ مصنف کے ادبی سفر کی سرگزشت ہے۔ ماہنامہ 'اسباق' پونہ نے کبھی ایک گوشہ محبوب راہی کے عنوان سے شائع کیا تھا، مصنف نے اسے کتاب کے پیش لفظ میں استعمال کر لیا۔

راہی صاحب کا شعری ذوق روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی کے توسط سے پروان چڑھا، پیش نظر کتاب میں شامل عنوان 'اردو ٹائمز اور میں' میں موصوف نے قدرے تفصیل سے اپنی ادبی روداد پیش کی ہے۔ شامل اشاعت مضامین کے حسب حال کتاب کا نام تجویز کیا گیا ہے۔

کتاب اگرچہ نثری مضامین پر مشتمل ہے تاہم اس میں شعری آمیزش بھی خاصی مقدار میں ہے۔ جگہ جگہ راہی صاحب نے اپنے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ کتاب میں شامل اٹھارہ مضامین میں درجن بھر سے زائد کسی نہ کسی ادبی کتاب پر ان کے تقریظی تبصرے ہیں۔ میرتقی میر پر شامل مضمون 'میر کے اثرات عصر میر سے عصر حاضر تک' بقیہ مضامین پر بھاری ہے جس میں کئی ادبی تحریکوں، ترقی پسند تحریک، جدیدیت مابعد جدیدیت کے غزل پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ متاثرین میر کے کلام سے نمونے کے اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اردو کے مایہ ناز ادیب خواجہ احمد فاروقی کے ذاتی خطوط جو انھوں نے اپنے شاگرد رشید گوپی چند نارنگ کے نام وقتاً فوقتاً تحریر کیے، کتابی شکل میں خدابخش لائبریری پٹنہ سے زیور طبع سے آراستہ ہوئے، راہی صاحب نے ان پر اپنا تبصرہ شامل کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ استاد کا احترام شاگرد کی طرف سے اور شاگرد کے لیے شفقت استاد کی طرف سے نکھر کر سامنے آگئی ہے۔

دلی اردو اکادمی سے شائع میرتقی میر کے مونوگراف بھی مصنف کی توجہ کا مرکز رہی۔ ظفر گورکھپوری کو انھوں نے ادب اطفال کے دائرے میں پرکھا۔ انھیں کے الفاظ میں ''میں اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار واعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ بڑوں کے ادب میں جو مقام وقار واعتبار ظفر گورکھپوری کو حاصل ہے ادب اطفال میں موصوف کی قامت مقابلتاً کچھ نکلتی محسوس ہوتی ہے۔'' (ص 68) اس جملے میں مستعمل لفظ کچھ اور محسوس میں جو تاثر پنہاں ہے وہ قابل غور ہے۔ مصنفہ اور فن پارے کے حق میں تعریفی الفاظ وفقروں کی جھڑی لگا دیتے ہیں۔ سردست اقبال خلش کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ ''انھیں خوش الحانی، ترنم ریزی، خوش گلوئی، دلکش انداز میں پیش کش جیسی بے مثال نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہیں شعور کی بالیدگی، فکر کی نیرنگی، تخیل کی بلند پروازی، انداز بیان کی شستگی، انتخاب کی شائستگی، محاوروں کی برجستگی، دلکش تشبیہات، معنی خیز استعارات جیسے فنی التزامات کے بیش بہا خزانوں سے بھی مالا مال کیا ہے۔'' (ص 144)۔ غور سے دیکھا جائے تو راہی صاحب کی اس نثری عبارت آرائی میں شعری صفت نمایاں ہے۔ محاوروں اور اشعار ومصرعوں کو بھی انھوں نے نثری قالب میں بڑی خوبصورتی سے ٹانکا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کی خودنوشت، رقص شرر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کتاب کیا ہے رقص شرر کی رعایت، اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے'' معاً انھیں خیال آتا ہے وہ بھی اس میں کچھ تصرف کر سکتے ہیں لکھتے ہیں 'اک بحر فصاحت ہے اور ڈوب کے جانا ہے'' ایسے تصرفات اور بھی مضامین کی زینت بن گئے ہیں۔

موصوف ناقد ہو کر ناقدین پر برافروختہ ہیں۔ شاعری شاعر کی کتاب 'غزل پہلی محبت ہے' کے تبصرہ میں اپنی برافروختگی کا اظہار کیا ہے۔

یہاں پر راقم ادب سے کہنا چاہتا ہے کہ ناقد بننا ایسا کچھ آسان نہیں ہے جب تک وہ تخلیقی بانجھ پن کا شکار رہتا ہے، ناقد بھی نہیں بن سکتا۔ نقد ونظر میں بالیدگی تخلیقی عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے اور تنقیدی فن پارہ خود بھی کسی ناقد کا تخلیقی عمل ہی ہوتا ہے۔

پیش نظر کتاب معلوماتی کشش جہت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔ اسلوب نگارش دلچسپ اور دلنشیں ہے۔ فن تبصرہ نگاری میں ایک مفید اضافہ ہے۔

رفعت سروش، ہندوستانی ادب کے معمار

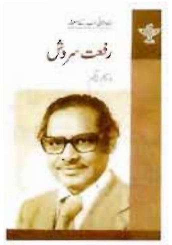

مصنفہ: ڈاکٹر وسیم بیگم
صفحات: 136، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر پرویز شہریار
این سی ای آر ٹی، شری اروندو مارگ، نئی دہلی 16

پیش نظر کتاب ہندوستانی ادب کے معمار ساہتیہ اکادمی کے اشاعتی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب دراصل رفعت سروش کے حیات و کارنامے پر ایک مختصر ریسرچ مونوگراف ہے۔ اس مونوگراف میں فاضل مصنفہ وسیم بیگم نے انتہائی محنت اور ایمانداری سے رفعت سروش جیسی فعال شخصیت کے کارناموں کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ ان کی اس جانفشاں تحقیق میں مشہور و معروف شاعرہ، رفعت سروش کی صاحبزادی، ڈاکٹر شبانہ نذیر کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ڈاکٹر شبانہ نے مصنفہ کی ہر ممکن مدد کی ہے اور ہر دم ان کا مخلصانہ تعاون شامل حال رہا ہے۔

رفعت سروش ایک انتہائی فعال اور ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ خاص طور سے ہندوستان کی آزادی اور اس کے بعد کے دور کے اردو ادب کی خدمات میں ان کا گراں قدر تعاون رہا ہے۔ انھوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ لہٰذا، انھیں ادب کی کسی ایک دو اصناف تک محدود نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ انھوں نے دسیوں اصناف میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ رفعت سروش بیک وقت شاعر، سوانح نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، صحافی اور ڈراما نگار بالخصوص ریڈیو سے وابستہ ڈراموں میں خاصا تعاون پیش کیا ہے۔ رفعت سروش اپنے اوپیرا کی وجہ سے یاد کیے جاتے رہیں گے۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان کی ادبی خدمات کا ذخیرہ اتنا وسیع اور وقیع ہے کہ انھیں یکجا کیا جائے تو ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔ لیکن خوش آئند بات یہ ہے، وسیم بیگم نے ان کی تمام ادبی خدمات کا اجمالاً ہی سہی ہر ایک پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ اور انھیں اپنے تحقیقی کے دائرے میں سمونے کی کوشش کی ہے، جس کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اب کوئی تحقیق کار یا ریسرچ اسکالر ان کی بحیثیت مجموعی تحقیق کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے بنیادی مواد کی فراہمی میں زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں پڑے گا۔

جہاں تک ریسرچ مونوگراف کے معیار کا تعلق ہے۔ ساہتیہ اکادمی اس بات کی ضامن ہے، جہاں ہندوستان کی تمام زبانوں کی ادبیات کو پیش نظر رکھ کے، اس کی صواب دید کے پر کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ لہٰذا، اس کے معیار پر سوال کرنا اپنے وقوف کو معرض خطر میں لانے کے مترادف ہوگا۔

وسیم بیگم نے ساہتیہ اکادمی کے اس مونوگراف میں درج ذیل ابواب قائم کیے ہیں:
(1) رفعت سروش کی سوانح اور شخصیت (2) رفعت سروش کی شاعری (3) ڈرامہ نگاری
(4) رفعت سروش بحیثیت نثر نگار (5) انتخاب (6) تصانیف کا جائزہ

رفعت سروش یوں تو کئی ادبی اصناف میں دسترس رکھتے تھے۔ تاہم ایک قادرالکلام شاعر ہونے کی وجہ سے ان کی ایک منفرد اور ممتاز پہچان تھی۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لیکن نظم کو کئی حیثیت سے ان کی شناخت قابل قدر ہے۔ ان کے کلام میں انسانی اقدار کی عظمت اور رشتوں کی پاسداری کے عناصر بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں سے چند سطریں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش خدمت ہیں، اس کے رنگ اور آہنگ ملاحظہ فرمائیں:

قتل گاہوں سے اٹھے جھوم کے شہزادے / قافلے نکلے ہیں تاریخ کے اہراموں سے
کوئی حیدر، کوئی ٹیپو، کوئی جھمی بائی / دشت آباد ہیں تہذیب کے دیوانوں سے
سرنگوں پھانسی کے پھندے ہیں تو مقتل خاموش / ہیں اور بسمل و اشفاق، بھگت سنگھ، آزاد
موت شرمندہ ہے ان سب کا لہو جاگ اٹھا / پھر چراغاں ہوا، سرسبز ہوئی فصل مراد...
قافلے وقت کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں / لغزشیں پاؤں میں اور پیاس لبوں پر ہے، مگر
کہیں دیوانے مصائب سے بھی گھبراتے ہیں / محفل شعر میں پھر ظفر یاد آئے
قلعۂ سرخ کی یہ 'اندر سبھا' زندہ باد / کیا خبر کب کوئی طوفان بجھا دے اس کو
شمع اردو کی یہ مدھم سی ضیا زندہ باد' (روشنی کا سفر، ص 173-172، نظم 'شہیدوں کا لہو جاگ اٹھا')

رفعت سروش کی پچاس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں افسانے، ناول، شعری اور نثری مضامین کے مجموعے، سفرنامے اور تراجم وغیرہ بھی شامل ہیں۔ رفعت سروش کے دو اوپیرا بے حد مشہور و مقبول ہوئے ان میں سے ایک 'شاہجہاں کا خواب' ہے اور دوسرا ہے، 'جہاں آرا' علاوہ ازیں، ان کی خودنوشت 'پتہ پتہ بوٹہ بوٹہ' کو بھی بڑی مقبولیت ملی۔ ان کی یہ خودنوشت تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

انھیں متعدد انعامات اور اعزازات سے بھی نوازہ گیا۔ ان میں سے دو قابل ذکر انعامات اس طرح ہیں۔ ان کی شاعری پر دہلی اردو اکادمی نے اپنے 'خصوصی انعام برائے شاعری' سے نوازہ اور ڈرامے کی خدمات کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ نے 'ہم سب غالب ایوارڈ برائے ڈرامہ' سے نوازہ تھا۔

اس ریسرچ مونوگراف سے امید کی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر وسیم بیگم کی یہ معروضیت سے بھرپور اور انتہائی دیانتدارانہ کاوش کا اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں پر تپاک خیر مقدم کیا جائے گا۔

نقد و نظر

مصنف: ڈاکٹر مقبول احمد مقبول
صفحات: 136، قیمت: 200 روپے
ناشر: کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور
مبصر: شجاع الدین خان، 113، نئی بستی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

محمد مقبول احمد کرناٹک کے ان محبانِ اردو میں سے ہیں جو علم و ادب کا کام انکساری سے انجام دیتے ہیں۔ اہلِ ظرف کی روش اپناتے ہوئے بلند بانگ دعوے سے گریز کرتے ہیں۔ تنقید اور تحقیق کے علاوہ آپ کو شاعری سے بھی شغف ہے، محمد مقبول احمد نہ صرف شعر فہم ہیں بلکہ شاعر بھی ہیں اور اسی مناسبت سے آپ کا قلمی نام مقبول احمد مقبول ہے۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق کا یہ سفر 1981 سے تا حال جاری ہے۔ شائع شدہ کتابوں کا سرمایہ مظفر مجاز: شخصیت اور فن (تنقید و تجزیہ)، آدمی لہولہو (مجموعۂ غزلیات) پر منحصر ہے، یہ دونوں کتابیں قبول عام پا چکی ہیں۔ تحقیق، تنقید اور تخلیق پر مبنی پانچ دیگر کتابیں زیر غور ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'نقد و نظر' تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 2012 میں منصۂ شہود پر آئی۔

'نقد و نظر' میں کل 15 تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان میں بیشتر مضامین مقبول احمد مقبول کے گہرے غور و فکر اور انہماک کا پتہ دیتے ہیں۔ موضوع کے انتخاب اور مضامین کے عنوانات سے ہی زبان کی پختگی اور صفائی و ستھرائی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قاضی عبیدالرحمان ہاشمی صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ: ''زبان اور بیان پر جتنی اور جیسی قدرت ہے وہ آج خال خال ہی دیکھنے میں نظر آتی ہے۔'' مقبول احمد مقبول کی تحریر میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ صرف مسائل کو سمجھتے ہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ سمجھاتے بھی ہیں۔

مقبول احمد مقبول کا ماننا ہے کہ اردو داں حضرات اخبار بینی کا ذوق نہیں رکھتے بلکہ ہوٹلوں اور بازاروں میں گپ بازی کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک سچ ہے لیکن

اردو اخبارات کے مطالعے تک۔ کیوں کہ اردو داں حضرات کی ایک کثیر تعداد انگریزی اور ہندی کے اخبارات کا مطالعہ کرتی ہے، بالخصوص سفر میں۔ وجہ جو بھی ہو بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ مضمون نگار نے محض اخبار بینی کے مطالعے کے فقدان کی بات نہیں کہی بلکہ دیگر کتب ورسائل کے مطالعے سے بھی عاری رہنے کی بات کہی ہے۔ اس بدذوقی اور بے حسی سے پیدا شدہ نتائج کی سنگینی کا احساس دلانے کے لیے جن مشاہدات کو قلم بند کیا ہے ان سے مضمون زیادہ وقیع اور معلوماتی ہو گیا ہے۔ یہ مضمون تحریک دیتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں ایک مضمون 'فہیم احمد صدیقی: غزل کی توانا آواز' شامل ہے۔ مضمون نگار نے جس طرح فہیم احمد صدیقی اور ان کے مجموعے 'وارفتہ' کا تعارف پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقبول احمد مقبول خاص و عام میں معروف تمام ادیبوں اور شاعروں پر گفتگو کرتے ہیں بلکہ نئی آوازوں پر بھی اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ فہیم صدیقی کے بعض اشعار ایسے نقل کیے ہیں کہ 'وارفتہ' سے وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً:

جلوہ گری کو مجھ میں تڑپتی رہی حیات — وہ سنگ ہوں جسے کوئی آزر نہیں ملا
ہمارا دل ہے یہ دہلی سے مختلف ہے بہت — یہ ایک بار جو اجڑا تو پھر بسا ہی نہیں
آپ کا کام ہے سو حشر اٹھاتے جانا — مٹ گیا کون کہاں آپ کی ٹھوکر جانے

عام طور پر حالی کا ذکر خیر کرتے ہوئے 'مقدمہ شعر وشاعری' اور 'مسدس حالی' پر ہی گفتگو کی جاتی ہے۔ کبھی کبھار غزل گوئی کے حوالے سے بھی حالی کو یاد کر لیا جاتا ہے۔ 'حالی کی فکر ونظر کا جائزہ: رباعیات کے حوالے سے' عام روش سے اجتناب کرتا ہے اور اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ مقبول احمد مقبول کوئی بات کہنے کی فکر رہتی ہے۔ مذکورہ مضمون اور اس کے علاوہ 'کلام اقبال میں عصری حسیت'، 'پریم چند کی مذہبی رواداری اور انسان دوستی'، بالخصوص 'کلام اقبال کے منفرد شارح: محمد بدیع الزماں' سے مذہب اور روحانیت سے مقبول احمد مقبول کی گہری دلچسپی اور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ 'اردو کے چار شخصی مرثیے: ایک تنقیدی جائزہ'، 'دکن کا ایک صوفی رباعی گو شاعر: عطا کلیانوی'، 'جلیل ساز: جس کے سخن کی دھوپ سے روشن تھے بام و در' بھی بڑے عمدہ اور اضافی معلومات فراہم کرنے والے مضامین ہیں۔ اب تک جن مضامین کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کے نام پیش کیے گئے ہیں ان کے سوا بقیہ مضامین بھی جاذب اور توجہ طلب ہیں۔ مقبول احمد مقبول بغیر کسی وابستگی کے ادب سے وابستہ ہیں، یہ کمال کی بات ہے۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول نے اپنی کتاب کے لیے عمدہ مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ جس کے لیے انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام اشخاص، افراد اور حلقوں میں یہ یکساں مقبول ہوگی۔

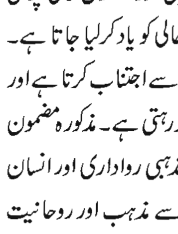

کھلی کھڑکی

مرتب: افضال الرحمٰن، مترجم: حامد حسن قادری
صفحات: 116، قیمت: 160 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: 272، جامعہ نگر، ٹیچرز ٹریننگ کالج روڈ، نئی دہلی
مبصر: شبنم افروز، روم نمبر 28، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'کھلی کھڑکی' انگریزی افسانوں کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں تین افسانے اس کے مصنف کے نام سے شائع کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی 'سائنس داں کی بیوی' ہے، جو مشہور انگریزی جاسوسی کہانی کار کونن ڈائل کا ایک غیر جاسوسی افسانہ ہے۔ دوسری کہانی 'گھنٹہ' کے عنوان سے ہے۔ اے ای ڈبلیو میسن اس کے مصنف ہیں۔ یہ افسانہ خود ان کی نظر میں ایک بہترین افسانہ ہے۔ تیسرا افسانہ، جو اس مجموعے کی فہرست کے حساب سے آٹھواں ہے، کے مصنف مشہور فرانسیسی افسانہ نگار موپاساں ہیں۔ اس افسانہ کا نام 'میڈ موازل فی فی' ہے۔ جو جنگ فرانس و جرمنی کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس مجموعے کی دوسری کہانیاں جن کے مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ ان میں 'انتہا'، 'کھلی کھڑکی'، 'موت کا راگ'، 'جوہر شناسی' اور 'طسقو رفلقوزی طریقہ' شامل ہے۔ افسانہ 'انتہا' میں میاں بیوی کے رشتوں کے درمیان کشیدگی کو بیان کیا گیا ہے، جو دوسری محبوباؤں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ 'کھلی کھڑکی' افسانہ وہم کی بیماری میں مبتلا ایک وکیل کی ذہنی کیفیتوں کو بیان کرتا ہے۔ تو وہیں 'موت کا راگ' توہم پرستی پر مبنی افسانہ ہے۔ 'جوہر شناسی' افسانے میں ایک قاتل کی حمایت کی جاتی ہے کیونکہ وہ اعلیٰ درجے کا باورچی ہے۔ یعنی گناہ اور جرم پر جوہر وصلاحیت کو حاوی دکھایا گیا ہے۔ 'طسقو رفلقوزی طریقہ' یہ افسانہ ایک عورت کی کہانی کو پیش کرتا ہے، جو ٹرین چھوٹ جانے پر ایک اجنبی فیملی کے ساتھ اس کے بچوں کی ٹیچر ہونے کا فریب دے کر رات گزارتی ہے اور صبح اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

حسن قادری ادیب، شاعر، نقاد، مصنف، مورخ، عالم، مترجم اور تاریخ گو تھے۔ قادری صاحب نے بہت سی عربی، فارسی اور انگریزی ادب کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ان کے اندر ترجمے کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک کامیاب مترجم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ وہ ترجمے کو اتنے بے ساختہ اور برمحل کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو ترجمہ کم اور طبع زاد مضمون زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ قادری صاحب کے ترجمہ کردہ بہت سے مضامین کئی بڑے اور معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔

'کھلی کھڑکی' کے تمام افسانوں کے تراجم آزادیِ ہند کے آس پاس کے ہیں۔ ان افسانوں کو ایک لمبے عرصے تک شائع نہیں کیا جا سکا یا کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ خیر جو بھی ہو اس مجموعے کے مرتب افضال الرحمٰن نے اسے شائع کر کے اہم اور قابل تعریف کام کیا ہے۔ اس طرح سے ان افسانوں کو کتابی شکل میں منتقل کر کے انھوں نے نہ صرف اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کیا بلکہ حامد حسن قادری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس مجموعے کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ حامد حسن قادری ترجمے کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اگر اس کتاب کے ایک افسانے کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو دوسرے تمام افسانوں پر ترجمے سے زیادہ تخلیقیت کا رنگ غالب ہے۔ جبکہ پہلا افسانہ 'سائنس داں کی بیوی' ان کی مشکل پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں عربی وفارسی لفظوں اور تراکیب کی بھرمار ہے جس سے یہ افسانہ عام قاری کی پہنچ سے دور ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے انگریزی اصطلاحوں کے جو ترجمے کیے ہیں وہ اپنی اصل (انگریزی) سے کہیں زیادہ مشکل معلوم ہوتے ہیں۔

کتاب متوسط کاغذ کے استعمال کے ساتھ املا اور پروف کی غلطیوں سے یکسر پاک ہے۔ کور پیج بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ڈیزائن کیا گیا ہے۔ سفید اور پیلے رنگ کے پھولوں کے درمیان کتاب کے عنوان کے لحاظ سے کھلی کھڑکی بھی لگائی گئی ہے، جو دیدہ زیب ہے۔ ادب کے قارئین کے لیے یہ ترجمے قابل مطالعہ ہیں۔

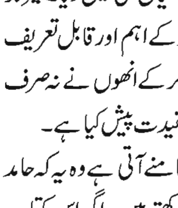

پروفیسر آل احمد سرور۔ فکر و فن

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی
صفحات: 295، قیمت: 300 روپے
ناشر: نصاب پبلشرز، حیدرآباد 59
مبصر: جمال اختر، 142 ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'پروفیسر آل احمد سرور: فکر و فن' اردو زبان وادب کے ابھرتے ہوئے اسکالر ڈاکٹر

محمد ناظم علی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں عثمانیہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ نظر ثانی کے بعد یہ مقالہ اب کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت اردو ادب میں متنوع صفات کی حامل رہی ہے، ان کے مطالعے کی وسعت، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلندی، ان کی تجزیاتی سوجھ بوجھ اور نتیجہ اخذ کرنے میں معروضیت، شگفتہ اور سلیس انداز تحریر ان کی وہ خصوصیات رہی ہیں جن کی بنا پر آج اردو دنیا میں ان کا بلند مقام ہے۔ یوں تو سرور صاحب کے فکر و فن پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن ان کی تحریری خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک طرح کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے اسی تشنگی کو دور کرنے کی ایک بہترین کوشش ڈاکٹر محمد ناظم علی کا یہ کام کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

نصاب پبلشر حیدرآباد سے شائع ہونے والی کتاب 'پروفیسر آل احمد سرور: فکر و فن' اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، جس میں مصنف نے دس ابواب میں سرور صاحب کی پوری زندگی کا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ پہلے باب میں 'آل احمد سرور زندگی اور شخصیت' کے تحت ان کے آبا و اجداد اور خاندان کا ذکر کرتے ہوئے تعلیمی سرگرمیاں اور دیگر مصروفیات کے علاوہ دوست و احباب اور مشاغل کو بھی تفصیلی طور پر تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ تیسرے باب میں ان کے تنقیدی افکار کو پیش کرتے ہوئے تنقید کی روایت میں آل احمد سرور کے تنقیدی نظریات کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ خصوصاً میر و غالب کے حوالے سے ان کے تنقیدی افکار پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھا باب 'آل احمد سرور اور اقبال' کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے اقبال کی شاعری کے متعلق سرور صاحب کے خیالات کو تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہمیں سرور صاحب کی اقبال فہمی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انھوں نے اقبال کی شاعری اور فکر سے متعلق بہت سے گوشوں کو اجاگر کیا جیسا کہ ان کی مشرقیت کو جدید مشرقیت کی اصطلاح سے متعارف کراتے ہوئے یہ واضح کیا کہ اس مشرقیت میں مغرب کی اچھی قدریں بھی شامل ہیں۔ پانچویں باب میں مصنف نے آل احمد سرور کی صحافتی خدمات کو بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کس طرح وہ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے ایک بہترین صحافی کے طور پر لوگوں کے سامنے ابھر کر آئے، انھوں نے صحافتی خدمات کے ذریعے اردو کے تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی ادب کو سمت و رفتار اور پلیٹ فارم عطا کیا۔ چھٹے باب میں 'آل احمد سرور بہ حیثیت سوانح نگار' کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے سوانح نگاری کے فن اور خودنوشت سوانح نگاری کے ذیل میں ان کی خود نوشت سوانح 'خواب باقی ہیں' کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں ان کے بیانیہ اسلوب کی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں آل احمد سرور کی اس حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے جو کہ ان کے تنقید کے میدان میں مشغول ہو جانے کے سبب ماند پڑ گئی، حالانکہ ابتدا میں انھوں نے عمدہ شاعری کا نمونہ پیش کیا تھا۔ اس باب میں اردو شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی شاعری کے آغاز اور محرکات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور ان کے شعری مجموعوں کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے شعری اسلوب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری تنقید کی طرح شرف قبولیت تو حاصل نہ کر سکی لیکن یہ اردو شعر و ادب میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔ آٹھویں باب میں 'آل احمد سرور بہ حیثیت دانشور' کے تحت دانشوری کی تعریف اور روایت بیان کرتے ہوئے آل احمد سرور کی دانشوری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نویں باب میں ان کے مجموعی اسلوب یعنی نثر اور شعری اسلوب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے اسلوب کو سادگی، شگفتگی، لطافت اور بیان کی رنگینی سے مالا مال کیا ہے۔ دسویں اور آخری باب میں مشاہیر کے آل احمد سرور کے متعلق تاثرات کو پیش کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مجموعی طور پر ڈاکٹر محمد ناظم علی کی تحقیقی کاوشوں کی بدولت پروفیسر آل احمد سرور کے حوالے سے ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے، جو اردو کے طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ اگر چہ اس کتاب میں بھی اردو کی دیگر کتابوں کی طرح پروف ریڈنگ کی غلطیاں آپ کو نظر آ جائیں گی، لیکن جہاں کتاب میں اتنی ساری خوبیاں موجود ہوں وہاں ایک دو خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

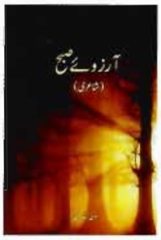

آرزوئے صبح

شاعر: ولی اللہ ولی
صفحات: 188، قیمت: 199 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: براؤن پبلی کیشن، نئی دہلی
مبصر: حنا آفریں

ولی اللہ ولی حقیقی جذبات کے شاعر ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب 'آرزوئے صبح' ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ حمد، مناجات، نعت اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نظم پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ولی اللہ ولی نے سب سے پہلے سوانحی اشاریہ پیش کیا ہے۔ ان کا اصل نام محمد ولی اللہ ہے اور قلمی نام ولی اللہ ولی ہے۔ ولی اللہ ولی کی پیدائش ویشالی، بہار میں 7 جنوری 1967 میں ہوئی۔ تعلیم ایم اے اور پری پی ایچ ڈی (فارسی) ہے۔

سوانحی اشاریہ کے بعد 18 صفحات پر مشتمل شاعر اور ادیب ڈاکٹر واحد نظیر کا تفصیلی مقدمہ ہے۔ جس میں انھوں نے ولی اللہ ولی کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ حمدیہ شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر واحد نظیر نے فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا بیان کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ولی اللہ ولی نے اپنی شاعری میں کس طرح اس فلسفے کو جگہ دی ہے۔ انھوں نے حمد و مناجات کے بعد نعت پر گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر واحد نظیر کے مطابق ولی اللہ ولی کی نعتوں میں دو طرح کے موضوعات زیادہ نمایاں ہیں۔ موصوف نے یہ بتایا ہے کہ شاعر نے عقیدہ اور عقیدت کے تحت اپنے داخلی جذبات و احساسات کو بارگاہِ رسالت میں پیش کیا ہے جبکہ دوسرا اہم موضوع سیرتِ نبویؐ سے متعلق ہے۔

مقدمہ کے بعد 'آرزوئے صبح: فکر و فن کے آئینے میں' عنوان کے تحت ڈاکٹر محمد معراج الحق برق نے ولی کی شاعری سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر احمد محفوظ نے ولی اللہ ولی کی شاعری کے اہم نکات واضح کیے ہیں۔ ان کے نزدیک 'آرزوئے صبح' کی غزلوں میں بیشتر روایتی قسم کے عشقیہ مضامین باندھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مولا بخش نے 'آرزوئے صبح میں جینے والا شاعر: ولی اللہ ولی' عنوان کے تحت ولی کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش کے نزدیک ولی کی شاعری میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں ان کے اشعار کی بلاغت کی داد دینی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی نے 'آرزوئے صبح' پر اپنے منظوم تاثرات پیش کیے ہیں۔

ان عنوانات کے بعد ولی اللہ ولی نے مذکورہ بالا ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ 'اظہارِ تشکر' کے عنوان سے کیا ہے۔ پھر حمد، مناجات اور نعت سے ولی اپنی شاعری کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ 'آرزوئے صبح' سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کتابِ زندگی کا اک انوکھا باب دیکھا ہے
کہ اپنی خواب خواب آنکھوں کو بھی بے خواب دیکھا ہے

سزا کتنی کڑی ہے اک ذرا سا مسکرانے کی
بالآخر کھل کے مرجھانا پڑا معصوم کلیوں کو

ذہن کے دریچوں سے جب کوئی گزرتا ہے ہر قدم ٹھہرتا ہے، ہر قدم سنورتا ہے
امن کی فاختہ بتائے گی فتنۂ عقل و آگہی کیا ہے؟
عیاری ابلیس کی دیکھو کام کرے اور نام نہ آئے
یوں سردی کے موسم میں وہ چاند جھیل کو تکتا ہے جیسے کوئی بیوہ اپنا چہرہ دیکھے درپن میں
وہ ستم کر کے بھی خوش نہیں رہ سکا زخم کھا کر بھی میں مسکراتا رہا
ایسا ہوگا، ویسا ہوگا، کیسا ہوگا چاند بھوک کے ماروں کو روٹی سا لگتا ہوگا چاند

ان اشعار کی قرأت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ولی اللہ ولی کی شاعری میں نہ صرف روایتی رنگ موجود ہے بلکہ تازگی اور جدت کے نمونے بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔

غزلوں کے بعد 'متفرقات' عنوان کے تحت اس مجموعے میں ایک فارسی نظم، ایک اردو نظم اور ایک سہرا بھی شامل ہے۔ فلیپ پر دائیں جانب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ولی کی شاعری سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ولی نہ صرف تصوف کے رموز ونکات سے واقف ہیں بلکہ کلاسیکی شعراء کی شاعری سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ولی کی شاعری میں صوفیانہ اشعار کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز کے اشعار بھی موجود ہیں جبکہ کتاب کی دوسری جانب فلیپ پر اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر نے ولی اللہ ولی کی شاعری سے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے کہ ولی کا تعلق چونکہ بنیادی طور پر فارسی ادب سے رہا ہے اس لیے ان کی شاعری میں کلاسیکی انداز نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ولی کی شاعری میں عصری حسیت کے کچھ پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اخیر میں کتاب کی پشت پر ولی کی شاعری سے متعلق براؤن پبلی کیشنز کے ڈائرکٹر کی رائے موجود ہے۔

الغرض ولی اللہ ولی کی شاعری کلاسیکی انداز کے باوجود عصری حسیت، سماجی شعور، نفسیاتی حقائق اور تہذیبی قدروں کی پاسداری کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں آج کی روتی بلکتی دنیا کے مداوا کا وافر سامان موجود ہے۔ امید کرتی ہوں کہ ولی اللہ ولی کی شاعری کا یہ مجموعہ 'آرزوئے صبح' مستحسن نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

ماہنامہ **سہیل** (گیا)

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر

صفحات: 234، قیمت: 50 روپے

ناشر: 2/3 A، اوریئنٹ رو، چھایا گھیرا، کولکاتا

مبصر: عادل حیات، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو کی ادبی بستیوں کے لیے ماہنامہ 'سہیل' محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ رسالہ 1939 میں گوم بدھ کے شہر گیا سے جاری ہوا اور پابندیِ وقت کے ساتھ متواتر ادب کی خدمت کرتا رہا۔ اگر چہ بعض نامساعد حالات کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے تعطیل کا شکار بھی ہوا۔ لیکن جلد ہی شائع ہونے لگا۔ ماہنامہ سہیل نے نہ صرف کئی تحریکات و رجحانات کے اہم شعرا و ادبا کی تخلیقات کو اہتمام کے ساتھ اپنے صفحات پر جگہ دی بلکہ نئے قلم کاروں کو متعارف کرایا۔ ماہنامہ سہیل کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اس نے بہت سے اکابرینِ ادب کے شایانِ شان خاص نمبر بھی شائع کیے۔ سہیل کا تازہ شمارہ پروفیسر لطف الرحمٰن نمبر کے طور پر شائع ہوا ہے جس میں متعدد شعرا و ادبا نے نظم ونثر میں نہ صرف پروفیسر لطف الرحمٰن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ ان کی مختلف الجہات شخصیت کے ادبی نیز سیاسی رموز کو واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ خدا نے انھیں گوناگوں خصوصیتوں سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت شاعر و ناقد، مترجم وصحافی کے علاوہ سیاسی رہنما بھی تھے۔ چنانچہ ادبی وسیاسی حلقوں میں ان کی شخصیت انجمن کی سی تھی۔ عملی زندگی کا آغاز شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور، بہار سے بحیثیت استاد کے شروع کی۔ وہ 1995 میں پہلی بار اسمبلی انتخاب میں کامیاب ہوئے اور محکمہ اقلیتی فلاح اور پی ڈبلیو ڈی کے وزیر بنائے گئے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر تھے۔ ان کی شخصیت چونکہ تغیر آشنا تھی، اس لیے وہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحان سے بھی متاثر ہوئے۔ ان کی تحریروں میں ان تحریکات و رجحانات کے اثرات آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے نثر وشعر پر مشتمل کم وبیش اٹھارہ کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا۔ وہ اپنی ادبی خدمات کے لیے کئی اعزازات سے سرفراز ہوئے۔ وہ 2001 میں اپنے منصب سے سبک دوش ہونے کے بعد فارغ البالی کی زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک 31 اگست 2013 میں دل کا دورہ پڑا اور اسی رات تقریباً ساڑھے دس بجے مالک حقیقی سے جا ملے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن نمبر اداریہ کے تحت جناب جمیل منظر کے تاثرات قارئین کی آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں۔ انھوں نے لطف الرحمٰن کو ایک Legend سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لطف الرحمٰن ان چند لوگوں میں سے تھے، جن کو مختلف الخیال حلقوں میں یکساں ادب واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر انھیں ایک Legend سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک بالغ نظر نقاد، قادرالکلام شاعر کے ساتھ ساتھ ایک باغ و بہار اور دل نواز شخصیت کے مالک بھی تھے۔ نام ونمود سے پرے، بے لوث محبت، بے غرضی اور بے نیازی ان کا خاصہ رہا ہے۔ بے تکلف گفتگو، مباحثہ، مذاکرہ، سیمینار یا جلسے جلوس کا منظر ہو، میں نے کبھی بھی لطف الرحمٰن صاحب کو معلومات کے ہاتھوں بند نہیں دیکھا۔''

بعدازاں مہمان اداریہ کے طور پر امام اعظم کی تحریر بھی شامل ہے۔ شاہد ساز نے سوانحی کوائف کے طور پر پروفیسر لطف الرحمٰن کی پوری زندگی کو ایک صفحے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ لفظوں میں پینٹ کر دیا ہے۔

مضامین کے باب میں پروفیسر لطف الرحمٰن کی شخصیت، ان کی تنقید، شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری اور ان کی مختلف کتابوں کے حوالے سے قمر رئیس، وہاب اشرفی، علیم اللہ حالی، علی احمد فاطمی، مشتاق احمد نوری، ابوذر ہاشمی، قمر جہاں اور نورالہدیٰ جیسے ناقدین کے علاوہ بعض دوسرے نقادوں کے پرمغز مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

تصورات و تاثرات کے باب میں علقمہ شبلی، منصور عمر اور دوسرے احباب نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی خدمت میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے بعد نگارشاتِ لطف الرحمٰن کا باب آتا ہے، جس میں تبرک کے طور پر مدیر سہیل نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی غزلیں، نظمیں، شہر یار پر ان کے ایک مضمون، ان کی دو یادگار تقاریر اور ان کے نام مشاہیر کے چند خطوط کو شامل کیا ہے۔ آخر میں خراجِ عقیدت کے طور پر پروفیسر لطف الرحمٰن کی یاد میں منعقد اہم تعزیتی جلسوں کی روداد بھی شامل کی گئی ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ ماہنامہ 'سہیل' کولکاتا کا پروفیسر لطف الرحمٰن نمبر اپنے گوناگوں مضامین اور اس کی پیش کش کے لحاظ سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر نہ صرف پروفیسر لطف الرحمٰن سے عقیدت واحترام رکھنے والوں کے لیے بلکہ ادب کے قارئین کے لیے بھی اہمیت وافادیت کا حامل ہے۔

عالمی اردو نامہ

سعودی عرب

سعودی عرب میں مولانا آزاد پر ڈراما اسٹیج

جدہ: سعودی عرب میں مقیم ہندوستانیوں نے مجاہد آزادی اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی زندگی پر ایک ڈرامہ پیش کیا جس کی بڑی پزیرائی ہوئی ہے۔ اس ڈرامے کو سعید عالم نے تحریر کیا اور مشہور فلم ایکٹر ٹام آلٹر نے اس میں مولانا آزاد کا کردار نبھایا۔ یہ ڈرامہ جدہ کے انڈین ہندوستانی اسکول میں یوم جمہوریہ کے موقعے پر منعقد کیا گیا۔ اس میں ہندوستانی سفارت کار کے علاوہ بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔ اس ڈرامے کا اہتمام شمالی ہندوستان کی شٹرنیٹی کونسل نے کیا۔ کونسل کے صدر فضیل احمد نے کہا مولانا آزاد کی سعودی عرب کے ساتھ گہری وابستگی رہی ہے کیونکہ ان کی ولادت وہیں پر ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مجاہدین آزادی نے ہندوستان کی آزادی میں جو رول ادا کیا ہے اس کو نئی نسل تک پہنچانا ہم سب کا فرض ہے۔ اس موقعے پر ہندوستانی سفارت خانے کے کونسل جنرل فیض احمد قدوائی بھی موجود تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ہندوستان کے گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ وہ نہ صرف سیکولرزم کے علامت تھے بلکہ انھوں نے بہ حیثیت وزیر تعلیم کے کئی انقلابی اقدام اٹھائے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 فروری 2014

'بزم رباب صحرا' ریاض کے زیر اہتمام یوم جمہوریہ ہند کے موقعے پر ادبی محفل کا انعقاد

ریاض: ادبی انجمن 'بزم رباب صحرا' ریاض نے بضمن یوم جمہوریہ ہند کے ایک پروقار ادبی محفل کا انعقاد عمل میں لایا۔ اس محفل کی صدارت معروف ہندوستانی شخصیت راشد علی شیخ نے کی۔ ڈاکٹر اشرف علی صدر 'آپس' نے بحیثیت مہمان خصوصی اور محمد سبحان صاحب نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ اس محفل میں ریاض کی کم و بیش تمام ادب نواز ہستیوں نے شرکت کی۔ ایک پرتکلف عشائیہ کے بعد محفل کا آغاز ہوا۔ نظامت کے فرائض بزم کے صدر و معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین نے انجام دیے۔ قاری خواجہ علیم الدین کی قرأت کلام پاک کے بعد خوش الحان شاعر صغیر احمد صغیر نے بارگاہ رسالت میں نعت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ خورشید الحسن نیر نے بھی اپنی ایک تازہ آزاد نعت پاک 'طلوع صبح' کے عنوان سے پیش کی اور خوب داد و تحسین پائی۔ جس کے بعد مہمانان و صدر کو عبدالجبار خان، خورشید الحسن نیر اور شکیل احمد نے گلدستہ پیش کیے۔ اس محفل میں ایوب تشنہ، صغیر احمد صغیر، محمد شوکت، اظہار الحق الہ آبادی، شاہد خیالوی، خورشید الحسن نیر، ابونبیل خواجہ مسیح الدین، شوکت جمال، حشمت صدیقی، طاہر بالا، حسام سید اور ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنا کلام پیش کیا۔ ناظم مشاعرہ ڈاکٹر حنیف ترین نے اپنی دلچسپ نظامت سے رات دیر گئے تک چلنے والی اس محفل کو گرمائے رکھا۔ صدر محفل راشد علی شیخ نے اپنے مختصر صدارتی کلمات میں کہا کہ شعرا نے ہر دور میں اچھے اور نامساعد حالات میں شاعری کی اور اپنی تخلیقات سے نہ صرف اردو ادب کے خزانے میں بیش قیمت اضافہ کیا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ سماج کو آئینہ بھی دکھایا۔ انھوں نے منتظمین مشاعرہ اور تمام شعرا حضرات کی ستائش کی جنھوں نے اس محفل میں اپنے اشعار کے ذریعہ سامعین کو بہترین پیام دیے اور انھیں ذہنی راحت و فرحت بخشی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 6 فروری 2014

بحرین

مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کا دوسرا عالمی مشاعرہ 'بیاد فراق گورکھپوری'

بحرین میں اردو شعر و ادب کے لیے سرگرم عمل مجلس فخر

بحرین برائے فروغ اردو کے زیر اہتمام دوسرے عالمی مشاعرہ کا انعقاد 31 جنوری 2014 کو نیشنل میوزیم کمپلیکس ہال میں ہوا۔ اس موقعے پر عزیز نبیل کی مرتب کردہ 800 صفحات پر مشتمل کتاب 'فراق گورکھپوری شخصیت، شاعری اور شناخت' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

بحرین کی مشہور و معروف سماجی، ادبی اور معاشی شخصیت شکیل احمد صبرحدی صاحب کی زیر سرپرستی منعقدہ اس خوبصورت شام کی صدارت کے لیے ہندوستان سے معروف نقاد، محقق، ماہر تعلیم، ڈرامہ نگار و شاعر محترم پروفیسر شمیم حنفی تشریف لائے تھے۔ مشاعرے میں پاکستان، ہندوستان، سعودی عرب، قطر اور بحرین کے شاعروں نے شرکت کی۔ قطر سے تشریف لائے مہمان شاعر اور مجلس فخر بحرین کے مشیر خاص عزیز نبیل نے مشاعرہ کی ابتدائی کارروائی کا آغاز کیا۔ مجلس فخر بحرین کے سرپرست اعلی نے کلمات استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نہ صرف ایک باکمال اور طرحدار شاعر تھے بلکہ اردو تہذیب و تمدن اور ہندو مسلم اتحاد کی روشن علامت تھے۔ چنانچہ دوسرا عالمی مشاعرہ فراق کے نام کرتے ہوئے دراصل ہم سماجی ہم آہنگی، اتحاد و یگانگت، حب الوطنی اور اردو کی عالمگیریت اور آفاقیت کا جشن منا رہے ہیں۔'' بعدازاں عزیز نبیل کی مرتب کردہ کتاب فراق گورکھپوری شخصیت شاعری اور شناخت کے ساتھ ہی مشاعرہ کی مناسبت سے شائع کردہ خوبصورت مجلّہ کا رسم اجرا بدست سفیر ہند موہن کمار صاحب، صدر مشاعرہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب، ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب، شکیل احمد صبرحدی، عزیز نبیل اور دیگر مہمانان کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ دوران نظامت منصور عثمانی نے کہا کہ اہل بحرین لائق صد مبارکباد ہیں کہ فراق پر اتنا ضخیم اور اہم کام تو ہندوپاک میں بھی نہیں ہوا۔ رسم اجرا کے بعد مہمان خصوصی سفیر ہند برائے بحرین محترم موہن کمار نے اس شام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور اس شام کے مہمان خصوصی ہونے کو اپنی خوش نصیبی کہا، ساتھ ہی اردو کے چند اشعار بھی سنائے۔ صدر مشاعرہ پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے اس شام کے انعقاد پر مجلس کا نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ انھیں مبارک باد دی اور کہا کہ فراق گورکھپوری پر ایک اہم کتاب شائع کر کے مجلس نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ فراق کی شاعری پر گفتگو فرماتے ہوئے شمیم حنفی صاحب نے کہ اردو کے شاعر کے طور پر فراق کو بے مثال اور منفرد لب و لہجہ اور اسلوب کا شاعر قرار دیا انھوں نے فراق کے چند اشعار بھی سنائے۔

پریس ریلیز، طاہر عظیم، بحرین، 31 جنوری 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

خواجہ الطاف حسین حالی پر سیمینار

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے غالب اکادمی، نئی دہلی میں خواجہ الطاف حسین حالی پر کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ پہلے اجلاس میں آفتاب عالم، نسیم عباسی، پروفیسر سلیل مسرا، مظہر محمود اور پروفیسر ابن کنول نے مقالے پڑھے۔

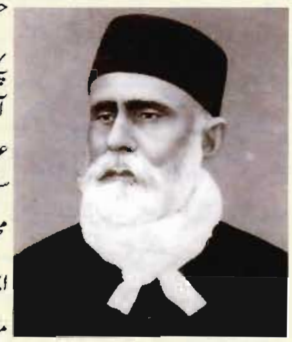

پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ حالی کے یہاں آنکھوں کو خیرہ کردینے والی بات ہے۔ گہرائی ہے۔ وہ مسئلے کی تہہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ غالب کی جو خصوصیات حالی نے بیان کردیں، اس میں اضافہ نہیں ہوسکا۔ انھوں نے شاعری کو بے وقت کی راگنی کہا اور اسی میں اچھی شاعری کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ گاندھی جی نے حالی کی مناجات بیوہ سن کر کہا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان مناجات کی زبان ہونی چاہیے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ دوسرے اجلاس میں شاداب تبسم نے غالب کی مکتوب نگاری، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے حالی اور تعلیم نسواں، پروفیسر قاضی جمال حسین نے حالی اور جدید نظم کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارتی تقریر میں پروفیسر افضال حسین نے کہا کہ حالی نے غیر شعوری طور پر مادے پر خیال کو فوقیت دی۔ اجلاس کی نظامت عبدالسمیع نے کی۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی اور پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قاضی افضال حسین اور ڈاکٹر شمس تبریزی نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر عبدالحق نے دیوان حالی کا نقش اول کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی کے دیوان کی بار بار اشاعت سے متن میں تبدیلیاں بھی غیر شعوری طور پر داخل ہوتی رہیں۔ اسے ازسر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے مقالے میں کہا کہ قطعی غیر ادبی اسباب کے سبب حالی نے اپنے کلاسیکی متون کی تقدیر کا تناظر بدل دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ حالی جس دور میں جی رہے تھے وہ ذہنی انتشار کا زمانہ تھا اس دور میں حالی نے نئی راہیں نکالیں۔ تیسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر سلمیٰ نے کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رکن علیم الدین اسعدی نے شکریہ ادا کیا۔ جناب متین امروہوی اور ڈاکٹر احمد علی برقی نے اس موقعے پر منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جنوری 2014

قومی اردو کونسل کا مالیگاؤں کتاب میلہ

مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں کونسل برائے فروغ اردو زبان کے 10 روزہ کتاب میلے میں کم وبیش 80 لاکھ روپے کی کتابوں کا فروخت ہوجانا ان دشمنان اردو کے منہ پر طمانچہ ہے جو یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اردو مر رہی ہے، اہل اردو اپنے بچوں کو انگریزی اردو دیگر میڈیم کے اسکولوں میں داخل کرکے اردو کو خود زندہ درگور کر رہے ہیں، چند سو یا چند ہزار کی تعداد میں چھپنے والے اردو رسائل وکتب بہت جلد سمٹ کر رہ جائیں گے اور پھر رفتہ رفتہ ان کا سلسلہ اشاعت معطل ہوجائے گا وغیرہ۔ اتنی خطیر رقم کی کتابوں کا فروخت ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اہل اردو کو اپنی زبان سے آج بھی محبت ہے اور وہ اردو کے کاز میں شریک ہوسکتے ہیں بشرطیکہ انھیں شریک کرنے کی زحمت اٹھائی جائے۔ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ اردو کی حالت اس مردِ بیمار کی سی ہے جسے توانائی بخش دوا اور غذا مل جائے تو وہ جی اٹھے گا۔ گزشتہ ساٹھ برس میں ہم نے جتنا وقت اور توانائی حکومتوں سے مطالبہ کرنے میں گنوائی ہے اُس کا بہترین مصرف یہ ہوسکتا تھا کہ اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد بڑھائی جائے، اردو میں نئے علوم وفنون کی کتابیں مرتب کی جائیں اور یہ ثابت کیا جائے کہ اردو ان عالمی زبانوں میں سے ایک ہے جو جدید تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2014

مولانا الطاف حسین حالی کی نثری خدمات

نئی دھلی: ہندوستان کی تاریخ میں ادبا، شعرا اور علما کا جو کردار رہا ہے، اس پر آج بھی تاریخ ہند ناز کر رہی ہے، ان میں مولانا الطاف حسین حالی سرفہرست نظر آرہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر نیمن ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے جعفرآباد میں منعقدہ مولانا الطاف حسین حالی کی نثری خدمات پر ایک روزہ سیمینار میں ممبر اسمبلی چودھری متین احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا الطاف حسین نے ملت کو جو نثری وشعری سرمایہ عطا کیا ہے اگر ہم اس پر عمل کرلیں اور ان کی فکر کو اپنی زندگی کا آئینہ دار بنائیں تو ملک میں اس وقت جس حالات سے دوچار ہیں، اس سے رستگاری مل جائے۔ انھوں نے طلبہ وطالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جو قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش کردیتی ہے، خدا اس قوم کو بھی فراموش کردیتا ہے۔ سیمینار کا آغاز محمد عثمان کی تلاوت اور محمد فرقان کی نعت پاک سے ہوا۔ صدارت مولانا ادریس

اور نظامت ڈاکٹر ندیم قادری نے کی۔ ڈاکٹر فہیم احمد بیگ نے کہا کہ مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک نثر نگار تھے بلکہ ایک صالح فکر کے مالک بھی تھے، جن کی فکری سرمایہ آج بھی قوم مسلم کو بیدار کر رہا ہے۔ سید ریاض الحسن نے سوسائٹی کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم اپنے بچوں کو اردو زبان کے تئیں بیدار نہیں کریں گے، تب تک ہم صالح معاشرہ کی تشکیل کا تصور نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر محمد انعام الحق، سامعہ خان، ڈاکٹر سبیلہ، اعظم خان، مفتی عظیم زیدی، ڈاکٹر ایم آر خان اور نسرین نے مولانا الطاف حسین کی نثری خدمات پر مقالے پیش کیے۔ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ایم کیو نیر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2014

اردو تحقیق پر سیمینار

گورکھپور: اردو کو کسی خاص مذہب سے جوڑنا اس کے ساتھ ظلم ہے۔ یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کو کسی خاص مذہب سے جوڑ کر ایک بڑے طبقہ کو اس سے کاٹ دیا گیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر سریندر دوبے ڈین فیکلٹی آف آرٹس گورکھپور یونیورسٹی نے اپنے افتتاحی خطبے میں کیا۔ وہ اردو تحقیق آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے موضوع پر گورکھپور یونیورسٹی میں منعقد ایک روزہ قومی سیمینار کے موقعے پر خطاب کر رہے تھے۔ بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر نسیم احمد نے اس موقعے پر کہا کہ ادبی تحقیق میں پائی جانے والی بے راہ روی افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق کا مقصد صرف موضوع کا انتخاب اور ڈگری حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ قاضی شہر مفتی ولی اللہ نے اپنے خطاب میں اردو کی بقا کو اس کی تہذیب سے جوڑتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان کی بقا اس وقت ممکن ہے جب اس کی تہذیب باقی ہو۔ اس موقعے پر معروف معالج ڈاکٹر عزیز احمد نے اردو زبان کے حوالے سے کہا کہ اردو پر جتنا اثر ملک کی تقسیم کا پڑا اتنا آزادی ہند کا نہیں۔ موجودہ وقت میں تحقیق کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ) نے اپنے خطبے میں کتاب کے پیش لفظ میں کتاب کا اجمالی تعارف پیش کرنے پر زور دیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں شمس الدین کی کتاب پروفیسر محمود الٰہی حیات و خدمات اور ڈاکٹر محمد اشرف کی کتاب ترقی پسند ادبی تحریک اور اردو فکشن کی رسم اجرا بھی پروفیسر سریندر دوبے، ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن، پروفیسر شاہد حسین اور پروفیسر نسیم احمد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ عزیزی ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون اور شعبہ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اس ایک روزہ قومی سیمینار کی مختلف نشستوں کی صدارت پروفیسر نسیم احمد، ڈاکٹر غیاث الدین، پروفیسر شاہد حسین، اور پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2014

امیر خسرو کے یوم پیدائش کو یوم اردو قرار دینے کی تجویز

نئی دھلی: حضرت امیر خسرو ہندوستان کی ان شخصیات میں سے ہیں جنھیں یاد رکھا گیا اور رکھا جائے گا۔ عہد وسطیٰ میں بڑے بڑے نام مٹ گئے مگر خسرو کل بھی زندہ تھے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کے نزدیک ہندوستان جنت ارضی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت امیر خسرو کے حوالے سے دہلی یونیورسٹی کے دیال سنگھ ایوننگ کالج شعبہ اردو اور این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار بعنوان 'حضرت امیر خسرو: حیات اور کارنامے' میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے دیال سنگھ ایوننگ کالج کے صدر شعبہ ڈاکٹر ساجد حسین نے کالج کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ خسرو اپنی ہندوی پر کافی ناز کیا کرتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے مگر انھوں نے ہندوی زبان میں شاعری کی۔ خسرو جیسا محبّ وطن شاعر کم ہے۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر سمن شرما نے کہا کہ امیر خسرو ہماری تہذیب کے رکھوالے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر منیجر پانڈے، پروفیسر شریف حسین قاسمی، نجمہ پروین احمد، وائس چانسلر شوبھارتی یونیورسٹی میرٹھ پروفیسر منظور احمد اور مولانا توقیر رضا خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے دوسرے دن دو سیشن منعقد ہوئے جس میں کئی مقالے پڑھے گئے۔ اس سیشن کے صدور دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول اور شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر چندر شیکھر نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ خسرو ہندوستانی تہذیب کا ایسا عکاس ہے کہ پوری ہندوستانیت ان کے اندر سما گئی ہے۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ خسرو ایک شخص ہیں مگر مختلف شخصیات کے حامل ہیں۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم اور اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے مشترکہ طور پر کی، جب کہ نظامت ڈاکٹر مشتاق احمد قادری نے کی۔ اس سیشن میں بھی کئی مقالے پڑھے گئے۔

شعیب رضا فاطمی نے حضرت امیر خسرو کی یوم پیدائش 3 مارچ کو یوم اردو تسلیم کیے جانے کا حکومت سے مطالبہ کیا۔ شعیب رضا کے ذریعہ پیش کی گئی اس تجویز کی سبھی اہم شخصیات وطلبہ وطالبات نے تائید بھی کی۔ اخیر میں دیال سنگھ ایوننگ کالج کے صدر شعبہ ڈاکٹر ساجد حسین نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2014

مختار انصاری کی تعلیمی خدمات

نئی دھلی: ڈاکٹر مختار احمد انصاری ایک بڑے سرجن ہی نہیں بلکہ عظیم رہنما اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ ہمیں ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری نے ترکی کے میڈیکل مشن اور تحریک خلافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے قومی رہنماؤں کو یاد کرنا ہماری ذمے داری ہے، جو قوم اپنے بزرگوں کو بھلا دیتی ہے اس قوم کے راستے سہل نہیں ہوتے۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکادمی میں ضیاء ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'مختار احمد انصاری کی قومی اور تعلیمی خدمات' کے موضوع پر منعقد سیمینار میں کانگریس کے لیڈر راشد علوی نے کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے صدارتی تقریر میں کہا کہ ہماری قوم 1857 سے قبل عیش و نشاط میں مشغول تھی۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد اس میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں اور پستی سے نکلنے کے راستے تلاش کرنے لگی۔ او بی سی کمیشن کے رکن شکیل الزماں انصاری نے کہا کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی خدمات کو اعلیٰ سطح پر یاد کرنے کی ضرورت ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے رکن شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے مسلمانوں کو متحرک کیا اور ان کی قربانیاں قوم کے لیے بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے مقالے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے ڈاکٹر انصاری کو ڈاکٹری اور رہنمائی کے میدان عمل میں اتارا اور انھوں نے نظام قدرت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اسماعیل علوی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ڈاکٹر

انصاری نیشنلسٹ تھے۔ ڈاکٹر صغیر اختر نے کہا کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صرف افراد کے ڈاکٹر نہیں بلکہ قوم کے بھی معالج تھے۔ مریض قوم کو ان پر اعتماد تھا، خلوص ان کا طرۂ امتیاز تھا اور عمل ان کا مسلک تھا۔ اس موقعے پر ضیا ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر عابد علی نے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد تفصیل سے بیان کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 فروری 2014

غلام ہمدانی مصحفی کی اردو ادب میں خدمات

امروہہ: شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاعری اور اردو ادب میں خدمات کے سلسلے میں ایک سیمینار کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شہر امروہہ کے ایچ پی انٹر کالج محلہ ملانہ امروہہ میں کیا گیا۔ جس کی

صدارت شہر امام ڈاکٹر محمد طارق (صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے انجام دی۔ جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر اکبر علی دہلوی موجود رہے۔ صدر جلسہ مولانا ڈاکٹر طارق حسن نے اپنے صدارتی کلمات میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری نئی نسل کو علم ہونا چاہیے کہ ہمارے اجداد کی ادب میں کیا خدمات رہی ہیں۔

بذریعہ ڈاک، پرنسپل، ایچ پی انٹر کالج، امروہہ، 20 اکتوبر 2013

طبی مخطوطات اردو پر دو روزہ سیمینار

رام پور: رام پور رضا لائبریری کے خیابان رضا میں لائبریری اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار بعنوان طبی مخطوطات اردو: اہمیت افادیت اور ضرورت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر انوار الحسن قادری نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ سید نوید قیصر شاہ نے نذرانہ نعت پیش کیا۔ اس موقعے پر سابق ڈائریکٹر جنرل سینٹر کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسین، وزارت صحت ڈاکٹر خالد صدیقی نے کہا کہ رام پور ایک تعلیمی شہر ہے یہاں بہت اچھا طبی سرمایہ ہے۔ رام پور رضا لائبریری ایشیا کی مشہور لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ سالار جنگ لائبریری، مولانا آزاد لائبریری خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی اچھا ذخیرہ ہے لیکن ان اردو مخطوطات پر تحقیقاتی کام زیادہ نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے کہا ایران میں طبی مخطوطات کا ایک ڈاٹا تیار کر کے فارسی، عربی اور اردو زبان کے سارے مخطوطات ایک جگہ کر لیے گئے ہیں۔ اسی طرح رام پور رضا لائبریری کے زیر نگرانی یونانی اور آیورویدک مخطوطات کا ایک ڈاٹا تیار کیے جانے کی ضرورت ہے۔ جس سے طبی تحقیقاتی کاموں کے میدان میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ اس موقعے پر ہمدرد طبیہ کالج نئی دہلی کے صدر شعبہ ڈاکٹر اشہر قدیر نے طب میں حکیم اجمل خاں کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب یہاں کے کتب خانہ میں طب سے متعلق عربی فارسی اور اردو زبان کے اہم مخطوطے موجود تھے۔ 1820 میں اردو کو جب دہلی میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تب ان تمام ادبی کتب کا عربی فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جانے لگا جسے آج انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ سیمینار میں 12 اہم تحقیقاتی مقالے پیش کیے گئے۔ اس موقعے پر حکیم عبدالناصر فاروقی، ڈاکٹر خورشید احمد، شفقت اعظمی، ڈاکٹر محمد عارف، ڈاکٹر فخر عالم، رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر انوار الحسن، حکیم بلال احمد وغیرہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ارشاد ندوی نے بحسن و خوبی انجام دی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شریف احمد قادری، ڈاکٹر کشور سلطانہ، مجتبیٰ عابدی، ڈاکٹر رگھویر شرن شرما اور ڈاکٹر مہندی حسن، جاوید نظامی، ہیرالال کرن، اور نجیب خاں موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 10 فروری 2014

پمپری چنچوڑ کی سرزمین پر قومی سیمینار

پونے: اردو کونسل پمپری چنچوڑ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے ایک سیمینار بعنوان 'تعلیم میں جدید ٹیکنالوجی کا دور... ای لرننگ کے ذریعے اردو سیکھیں' 19 جنوری 2014 کو نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول، پمپری، پونہ میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری، صدر شعبہ اردو، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرلا اور مہمان اعزازی کے طور پر ڈاکٹر سنجے دیشپانڈے، چیئرمین چینیہ سافٹ ویئر ٹیکنالوجی، مہاراشٹر، جناب محمد سمیع اللہ خاں باز، بانی اردو ملاپ سوسائٹی، کرناٹک اور جناب مشتاق

احمد راتھر، لکچرار اونیرا، جموں کشمیر نے شرکت کی۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر انور آفتاب شیخ، پونہ کالج، محترمہ نوشاد بیگم، سابق صدر معلّمہ، کلوا، ڈاکٹر تبسم سلطانہ، ایجوکیشن آفیسر، عثمان آباد، پروفیسر غیاث الدین، پونہ اور ملک کے مختلف صوبوں سے ممتاز اسکالر و ماہر تعلیم نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر ٹاٹا کنسلٹنگ سروس اور روزنامہ سیاست، حیدر آباد کے تعاون سے 'ای لرننگ کے ذریعے اردو سیکھیں' سی ڈی کا اجرا عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، ایم شیخ، نیشنل اینگلو اردو ہائی اسکول، کھرل وادی، پمپری، پونے 3 جنوری 2014

ناندیڑ میں قومی یکجہتی مشاعرہ

ناندیڑ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے انصاف ایجوکیشنل، ویلفیئر اینڈ کلچرل سوسائٹی ناندیڑ کے زیر اہتمام 4 جنوری شنکر راؤ چوہان سبھا گرہ اسٹیڈیم ناندیڑ میں کل ہند قومی یکجہتی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کا افتتاح مہاراشٹر کے مملکتی وزیر برائے اعلیٰ و طبی تعلیم ڈی پی ساونت کے ہاتھوں شمع روشن کر کے عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ناندیڑ حلقہ کے رکن پارلیمنٹ بھاسکر راؤ پاٹل، ناندیڑ شہر جنوب حلقہ کے رکن اسمبلی اوم پرکاش پوکرنا ناندیڑ میونسپل کارپوریشن کے میئر عبدالستار، ڈپٹی میئر آنند چوہان، میونسپل کارپوریشن کے ہاؤس لیڈر وریندر سنگھ گاڑی والے، سابقہ ڈپٹی میئر عبدالصمد، سابقہ چیئرمین دلیپ کند کرتے، سابقہ ڈپٹی میئر عبدالشمیم، بسمت بلدیہ کے سابقہ صدر عبدالحفیظ باغبان نے شرکت فرمائی۔ مشاعرے کی صدارت کانگریس کمیٹی اقلیتی شعبہ مہاراشٹر کے نائب صدر الحاج مسعود احمد خان نے فرمائی۔ انصاف ایجوکیشن، ویلفیئر اینڈ کلچرل سوسائٹی ناندیڑ کے سکریٹری منتجب الدین نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے مشاعرے کے انعقاد کے متعلق روشنی ڈالی۔ منتجب الدین نے صدر مشاعرہ سمیت تمام مہمانوں کی شال، مومنٹو پیش کر کے گلپوشی کے ذریعے ان کا استقبال کیا۔ مہمانان خصوصی کے ہاتھوں

شعراء کرام کی گلپوشی کر کے انھیں بھی شال اور مومنٹو پیش کیا گیا ساتھ ہی ناندیڑ میں اردو کی خدمت انجام دینے والے مقامی اردو اخبارات کے ایڈیٹران اور بیرونی اخبارات کے نمائندوں کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے ضلع انچارج وزیر ڈی پی ساونت کے ہاتھوں انھیں بھی تہنیت پیش کی گئی۔ شال، مومنٹو پیش کر کے اردو صحافیوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقعے پر ناندیڑ حلقہ کے ایم پی بھاسکر راؤ پاٹل نے کہا کہ مرکزی حکومت کے تحت آنے والے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے اردو کی ترقی کے لیے موثر اقدامات انجام دیے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ ملک بھر کی مختلف تنظیموں کو سیمینار، ورکشاپ، مشاعرہ، کانفرنس کے لیے مالی تعاون فراہم کرتا ہے اس کے علاوہ کونسل کی جانب سے اردو زبان کے مختلف کورسس بھی چلائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کونسل کی کارکردگی کی ستائش کی اور کہا کہ ناندیڑ میں بھی بڑی تعداد میں اردو داں طبقہ موجود ہے۔ ناندیڑ ضلع انچارج وزیر ڈی پی ساونت نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہیں جو پڑھنے اور بولنے میں کافی پیاری لگتی ہے۔ ڈی پی ساونت نے کہا کہ تقریباً 4 سال قبل مہاراشٹر میں اس وقت کے چیف منسٹر اشوک راؤ چوہان نے ناندیڑ میں اردو گھر تعمیر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ابتدا میں اردو گھر کے لیے 5 کروڑ روپے فنڈ منظور کیا گیا تھا۔ گزشتہ دنوں میونسپل کارپوریشن نے دیگلور ناکہ سے قریب گنج روڈ پر اراضی فراہم کی ہے جہاں پر عالیشان اردو گھر تعمیر ہوگا۔ اردو گھر کے لیے گزشتہ دنوں 8 کروڑ 82 لاکھ روپے کے ٹینڈر کو بھی چیف سکریٹری کی کمیٹی نے منظوری دے دی ہے اور جلد ہی اردو گھر کا تعمیری کام بھی شروع ہوگا۔ ڈی پی ساونت نے کہا کہ ناندیڑ میں بڑی تعداد میں اردو داں طبقہ موجود ہے۔ صدر جلسہ مسعود احمد خان نے تمام حاضرین اور شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جنوری 2014

مولانا محمد علی جوہر کی خدمات پر سیمینار

بارہ بنکی: مولانا محمد علی جوہر جنگ آزادی کے سچے مجاہد اور قومی مسئلوں سے گہری دلچسپی رکھنے والے اپنے زمانے کے ایک ایسے روشن دماغ اخبار نویس تھے جنھوں نے ملک کے عوام کے ذہن میں آزادی کی مشعل روشن کی۔ مذکورہ خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے اشتراک سے، رابطہ سیوا سنستھان کے زیر اہتمام جنگ آزادی کے عظیم مجاہد: مولانا محمد علی جوہر' موضوع پر سیمینار میں کیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنس کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر احسان افہد نے کہا کہ مولانا جوہر نے کلکتہ سے کامریڈ جیسا انگریزی اخبار اس وقت نکالا جب قوم کو انھوں نے مایوسی کے دل دل میں پھنسا پایا۔ اخبار نے قلیل مدت میں نہ صرف مقبولیت کی بلندیاں حاصل کیں بلکہ انگریزی حکمراں 'کامریڈ' کا بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ روزنامہ اردو لکھنؤ کے سب ایڈیٹر فیض الرحمٰن فیض نے پٹنہ (بہار) کے اورینٹل کالج میں صدر شعبہ اردو پروفیسر شکیل قاسمی کا تحریر کردہ مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے اخباروں کے ذریعہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور برقرار رکھنے کی پرزور حمایت کی۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر تسخیر حسن ندوی نے کی اور اظہار تشکر رابطہ سیوا سنستھان کے منیجر محمد سلیم نے کیا۔

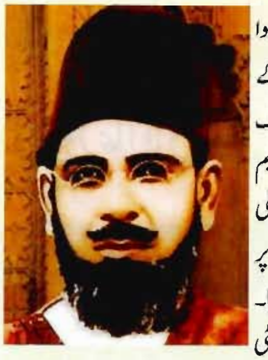

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 4 فروری 2014

بہادر شاہ ظفر کی قومی و ادبی خدمات

نئی دهلی: بہادر شاہ ظفر صرف بادشاہ نہ تھے، بلکہ پوری تہذیب و تاریخ کی ایک بے مثال علامت تھے۔ مغل خاندان کی تاریخ میں ایسی جامع شخصیت نظر نہیں آتی جو بیک وقت شاعر ہو اور صوفی بھی۔ حکمت و دانائی کا پیکر ہو اور جنگ دامن کے مختلف محاذ کا نگہباں بھی۔ ان کی حوصلہ مندی نے ہندوستانیوں کے اندر حریت کا ولولہ پیدا کر دیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ اور این سی پی یو ایل کے اشتراک سے 'بہادر شاہ ظفر کی قومی اور ادبی خدمات' کے موضوع پر غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین میں منعقد سیمینار میں کیا گیا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے استاد پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ہندستان کی تحریک آزاد کے سب سے پہلے سالار کارواں بہادر شاہ ظفر ہیں۔ اگر ہم آزاد ہیں تو یہ بہادر شاہ ظفر کی قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ محمد سلیم دہلوی فصیل بند شہر کے محبانِ اردو کی رہنمائی کر رہے ہیں اور قومی کونسل ایسے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ اس ایک روزہ سیمینار میں مختلف عنوانات پر 9 مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے جامع مگر مختصر مقالے میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی کی روداد نہایت خوش نما انداز میں پیش کی۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے اپنے مقالے میں بہادر شاہ ظفر کے کلام کی خصوصیات بیان کیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے محمد انس فیضی نے اپنے مقالہ میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس کی وجہ سے وہ عوام میں مقبول ہوئے۔ ڈاکٹر صغیر اختر نے بہادر شاہ ظفر کی شاعری میں استعاروں، تشبیہات اور کنایوں کے استعمال پر روشنی ڈالی۔ نسیم عباسی نے اپنے مقالے میں ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔ علاوہ ازیں ریاض قدوائی، سنبل ناز، طوبیٰ ناز، سدرا سلطانہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے صدر محمد سلیم دہلوی نے ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے اس سیمینار کے متعلق تفصیلات سے گفتگو کی۔ صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے نائب صدر، سمیع الدین، حقی اور خازن، محمد عامر نے گلدستہ پیش کر کے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر احمد علی برقی نے بہادر شاہ ظفر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ عابد علی خان اور محمد سعید خان نے مہمانِ خصوصی کے طور پر سیمینار میں شرکت کی۔ نظامت سید شمیم انور نقوی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 2 فروری 2014

گزارش

مضمون نگاروں سے گزارش ھے کہ اپنی نگارشات کے ساتھ ایک عدد پاسپورٹ سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔ مضمون کے ساتھ تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا بھی ضروری ھے کہ یہ مضمون غیرمطبوعہ ھے اور کسی بھی رسالے اخبار یا کتاب میں شایع نہیں ھوا ھے۔ مضمون تحریر کرتے ھوئے یہ ذھن میں رکھا جائے کہ نئے موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھے گئے مضامین کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

سرسید مشن کے احیا کے لیے سیمینار

نئی دهلی: دہلی میں کانسٹی ٹیوشن کلب میں اس سیمینار کا انعقاد مشن فاؤنڈیشن کے بینر تلے کیا، اس کانفرنس کا انعقاد مشن کو دوبارہ زندہ کرنے اور مضبوط بنانے کے لیے کیا گیا۔ سرسید روشن خیال، باہمی رواداری کے علمبردار تھے۔ سیمینار میں سینئر صحافی مسٹر کلدیپ نیر، پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر پروفیسر جسپال سنگھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم اور قومی پینتھرس پارٹی کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر بھیم سنگھ، حکومت ہند کی وزارت کمپنی امور کے سکریٹری مسٹر نوید مسعود اور مصنف و سابق مرکزی وزیر عارف محمد خان جیسی شہرت یافتہ شخصیات نے شرکت کی۔ سرسید مشن کے سکریٹری حسین وحید نے کہا کہ سرسید نے تعلیم اور سماجی اصلاحات کے اہم رول کو سمجھا اور قبول کیا۔ انھوں نے مختلف اسکولوں کو قائم کر کے ایک یونیورسٹی کے قیام کے لیے روڈ میپ تیار کیا، سینئر صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ سرسید نہ صرف ایک مصلح تھے بلکہ ایک ایسے دوررس نظر رکھنے والے شخص تھے، جنھوں نے ہندوستان کو تعلیم کی اہمیت سے بہرہ ور کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 9 فروری 2014

خواجہ احمد عباس کی خدمات پر ادبی نشست

الہ آباد: ادبی تنظیم فکر کار کی جانب سے مرزا غالب روڈ واقع ادارۂ نیا سفر کے دفتر میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو کے ترقی پسند ادیب و ناقد اور شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا مقالہ بعنوان 'خواجہ احمد عباس کے دو واقعے' پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں و فنکاروں میں خواجہ احمد عباس ایسے منفرد و مختلف تخلیق کار ہیں جن کو شہرت تو ملی لیکن ادب و تنقید میں وہ مقام اور حیثیت نہیں ملی یا نہیں دی گئی جس کے وہ حقدار تھے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، صحافی فلمساز، ہدایتکار، کالم نویس، مکالمہ نویس، سیاست داں، ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن اور 'اپٹا' کے عہدے دار تھے۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ بیشتر نقاد خواجہ احمد عباس کے تخلیق کردہ ادب کو مقصدی ادب کہہ کر دوسرے نمبر کا ادب ثابت کرتے ہیں۔ اس بات میں سچائی تو ہے لیکن خواجہ احمد عباس نے کہانی کے فن، قصہ پن اور کیفیت و تاثر کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی اور اکثر اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ 'ابابیل'، 'سردار جی'، 'معماز'، زعفران کے پھول'، 'دیا جلے ساری رات'، 'بارہ گھنٹے'، 'اتار چڑھاؤ' اور 'نیلی ساری' وغیرہ نہ صرف خواجہ احمد عباس کی بلکہ اردو کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ادب میں مقصدیت کا ہونا ایسا شجر

اردو میں انٹرنیٹ سرور

نئی دهلی: مرکزی وزیر برائے مواصلات کپل سبل نے حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ہندی بھون آئی ٹی او پر منعقد فاروق احمد میموریل ایوارڈ تقریب میں شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو جب تک روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا اس کی ترقی نہیں ہوسکتی، ہماری وزارت نے اس کے لیے 6 مہینے کے عربی، اردو اور کمپیوٹر ڈپلومہ کورسس شروع کیے ہیں اگر کوئی بچہ 12 ویں جماعت کے بعد یہ کورس کرتا ہے تو اسے یقیناً روزگار ملے گا۔ اس کے علاوہ ہم نے الیکٹرانک ہارڈ ویئر کورسز نکالے ہیں جس میں طلبہ کو اردو زبان میں الیکٹرانک ہارڈ ویئر سکھایا جائے گا، اس سے قبل ہم نے این سی پی یو ایل کی کوششوں سے انٹرنیٹ پر اردو لرننگ کورسس شروع کیے، اب ہم انٹرنیٹ سرور کو اردو زبان میں نکالنے جارہے ہیں،

انعامات یافتہ طلبہ کے ساتھ ڈاکٹر پرویز میاں، فرید احمد، شفیع دہلوی و دیگر

جس سے انٹرنیٹ کے ذریعے آپ دنیا بھر کی معلومات اردو زبان میں حاصل کرسکتے ہیں۔ ابھی آکاش ورژن 4 جس کی بیرون ممالک میں قیمت لاکھ روپے سے زیادہ ہے مارچ میں یہ آکاش آپ کو تین سے چار ہزار روپے میں مارکیٹ میں ملے گا۔ اس سے قبل حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کے جنرل سکریٹری اور ماہر تعلیم فرید احمد نے استقبالیہ خطبے میں کپل سبل کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی ترقی کے لیے جس قدر کام وزیر موصوف نے کیے ہیں اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کپل سبل اقلیتوں کی ترقی اور ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں کس قدر محنت کررہے ہیں۔ فرید احمد نے مزید کہا کہ یہ ایوارڈ تقریب میرے بڑے بھائی فاروق احمد کی یاد میں منعقد کی جاتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے حرمین ایجوکیشن سوسائٹی کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ تعلیم کے فروغ کے لیے بچوں کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے ایوارڈ یافتگان بچوں اور اساتذہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم ترقی کا زینہ ہے۔ اگر ایک لڑکی تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ ایک نسل کو تعلیم یافتہ بنا سکتی ہے۔ ڈی سی پی آلوک کمار، کونسلر سیما طاہرہ، معروف سماجی خدمت گار حاجی قیام الدین، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر پرویز میاں، لال بہادر شاستری کے پوتے آدرش شاستری نے بچوں کی حوصلہ افزائی کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 30 جنوری 2014

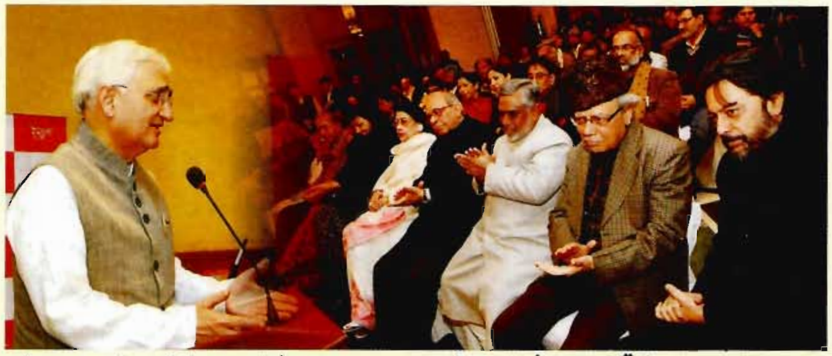

ممنوعہ ہے جو بڑے ادب کی تخلیق میں مانع ہو۔ پروفیسر فاطمی نے ادب کی مقصدیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہر شئے کا اپنا ایک مقصد ہوتا ہے۔ خدا نے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی۔ انسان کی تشکیل بھی بے مقصد نہیں پھر ادب کس طرح بے مقصد ہوسکتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2014

ادبی ویب سائٹ ریختہ کی پہلی سالگرہ

نئی دهلی: ہمارے بچپن میں جو رسم الخط سکھایا جاتا تھا اس میں ایک لطف تھا، میری زندگی میں صرف ایک تختی کی کمی رہ گئی تھی جسے ریختہ ڈاٹ کام نے پورا کردیا، اب تختی کی جگہ ریختہ سے وابستگی ہوجائے گی۔ ریختہ کے پہلے یوم تاسیس کے موقعے پر وزیر خارجہ سلمان خورشید نے مذکورہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ آج ہماری ماں سے رشتہ جوڑنے کے لیے سنجیو صراف نے ہمیں پھر سے یہاں یکجا کیا ہے۔ انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقد اس تقریب میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہم سب کو سنجیو صراف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپنے تمام وسائل اور توانائیاں خرچ کر کے وہ ممکن کر دکھایا جس کو کل تک ہم صرف طلسماتی بیان کے طور پر جانتے تھے یعنی کوزہ میں دریا کو بند کردیا، کل تک ایک قول محال سمجھا جاتا تھا لیکن ریختہ کے ذریعہ اردو زبان وادب کے ایک دریا نہیں بلکہ تقریباً تمام دریاؤں کو ایک کوزے میں جمع کردیا گیا ہے۔ اسی کا نام ریختہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک ہندوستانی کے طور پر ہمارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ یہ کام ہندوستان میں ہوا ہے اور اگر پچھلی صدی چھپے ہوئے حرف کی حرمتوں واشاعت کے حوالے سے منشی نول کشور کی صدی تھی تو سائبر انقلاب کے زمانہ میں یہ سنجیو صراف کی صدی کہلائے گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ زبان ہم سے نہیں بنتی، ہم زبان سے بنتے ہیں۔ ہم زبان کے گھر کی لونڈی ہیں، اگر ہم یہاں جھاڑو لگائیں تو یہ ہمارے لیے سعادت کی بات ہے۔ انھوں نے ریختہ کے بانی سنجیو صراف کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ضرورت ہے سنجیو صراف جیسے لوگوں کی جو دل لگا کر کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ کلدیپ نیر، پروفیسر شمیم حنفی نے بھی سنجیو صراف کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کو مبارکباد دی۔ شرکا میں انقلاب کے ایڈیٹر نارتھ شکیل حسن شمسی، معروف فلم ساز مظفر علی، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ شاہد مہدی، یو کے سنہا سمیت بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوئے۔ قابل ذکر ہے کہ ریختہ اردو شاعری اور ادب کی دنیا کی سب سے بڑی ویب سائٹ ہے جس کی بنیاد اردو شاعری کا شغف رکھنے والے معروف صنعت کار سنجیو صراف نے رکھی۔ ریختہ کو ایک سال کے عرصے میں اردو دنیا کی جانب سے زبردست پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور 154 ملکوں میں اس ویب سائٹ سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ اس ویب سائٹ پر کلاسیکی اور جدید شعرا کی غزلوں کا انتخاب اور ادب کی بہترین اور معیاری کتابوں کی فراہمی کو دنیا میں آسان بنانے پر زور دیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2014

ٹیگور توسیعی خطبہ

نئی دهلی: غزل کا شعر جو محض چند الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں کس قدر معنی کی کثرت اور بات کی گہرائی ہوتی ہے اور شاعر کس طرح اس میں دل کی

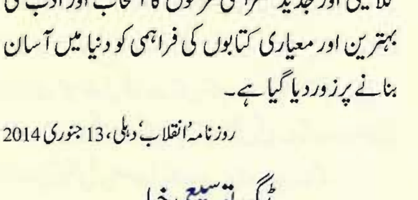

(دائیں سے): پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر فرانسس پریچیٹ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر وہاج الدین علوی

گہرائیوں تک اتر جانے والا اثر پیدا کرتا ہے، یہ لائق توجہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کی ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیر اہتمام ٹیگور توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک، امریکہ کی استاد پروفیسر فرانسس پریچیٹ نے کیا۔ انھوں نے غالب اور میر کے چند اشعار پیش بطور مثال کیے اور ان کا تجزیہ بھی کیا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز نقاد وادیب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ اردو شاعری کے ہر لفظ کے پیچھے ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں ایسے بہت سے فقرے ہیں جو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ شعر میں معنیٰ کے امکانات کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بنیادی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا۔ انھوں نے پروفیسر فرانسس کی علمی وادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو شعر وادب کے میدان میں انھوں نے جو کام کیے ہیں وہ بہت وقیع ہیں۔ جامعہ کے شعبہ اردو کے پروفیسرز وہاج الدین علوی، شہپر رسول، شہزاد انجم اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 8 فروری 2014

سب سے بڑے سائز کا الفی قرآن مجید

جے پور: عالی جناب معلّٰی القاب نواب الحاج محمد شیر خاں صاحب ساکن ساوئی ضلع چتوڑ (راجستھان) نے مولانا جمیل احمد صاحب ٹونکی کی معرفت ٹونک میں ایک ایسا قرآنِ مجید کتابت کروایا ہے جو خطِ نسخ میں سائز کے لحاظ سے دنیا میں بے نظیر ہے۔ اس قرآن مجید کی لمبائی ایک سو پچیس انچ اور چوڑائی نوے انچ ہے۔ رنگ خوشنویسی، تزئین کاری، دلکش نقش ونگاری میں بے مثال ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کے علاوہ خطِ نسخ میں اتنے بڑے سائز کا قرآنِ مجید ابھی تک کہیں پر موجود نہیں ہے۔ عالی جناب محمد شیر خاں صاحب کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے۔ کتابت اور نقش ونگار کے متعلق تفصیلات وخصوصیات حسب ذیل ہیں:

خطاط الفی قرآن کریم: حافظ وقاری خطاط غلام احمد بن محمد رفیق خاں ساکن تال کٹورہ، ٹونک، راجستھان (ہند) نگراں اعلیٰ وتصحیح کنندہ: حافظ، قاری، مولوی وخطاط جمیل احمد ٹونکی۔ مشیرانِ کتابت ونقش ونگار: صوفی الحاج خطاط خورشید عالم ٹونکی، حافظ قاری الحاج خطاط ظفر رضا خاں ٹونکی، حافظ قاری الحاج رہبر ناظم اشرفی۔ تزئین کاری ونقاشی: اختر جہاں، نجم السحر، غزالہ پروین، فائزہ پروین، حافظ وقاری الحاج عمر دراز ٹونکی۔ کاغذ کی درستگی، سطور کشی، ٹریسنگ، وصفائی حافظ اویس انور، فائق احمد، راغب احمد، کامران احمد عرف دانش۔ کاغذ: دستی (ہینڈ میڈ ہے، میڈ ان انڈیا) چارسو سال سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ کاغذ کی 18 شیٹیں جوڑ کر ایک ورق تیار کیا گیا ہے۔

سائز: لمبائی ایک سو پچیس انچ (دس فٹ پانچ انچ) اور چوڑائی نوے انچ (سات فٹ چھ انچ) خط: نسخ (تین ایم ایم کے قلم سے) مسطر: 41 سطری روشنائی: روٹرنگ (میڈ اِن جرمنی)، وزن: 250 کلوگرام اوراق: 32 (صفحات 64)، نقش و نگار: ہر صفحہ کے نقش و نگار دوسرے صفحہ سے ممتاز ہیں جلد: قرآن کریم کی جلد پر بھی نقاشی کی گئی ہے اور جلد کے چار گوشوں پر چاندی کے منقش کونے بنا کر نصب کیے گئے ہیں اور ایک چاندی کی تختی پر سونے کی پالش کر کے اس پر قرآن کریم اور اہتمام کتابت فرمانے والی شخصیت کا اسمِ گرامی نواب الحاج محمد شیر خاں صاحب کندہ کرایا گیا ہے اور جلد پر نصب کیا گیا ہے۔ حواشی پر نقش و نگار اور کتابت کا کام مولانا جمیل احمد صاحب کے مکان پر انجام دیا گیا ہے اور جلد سازی کا پورا کام سیٹھ اقبال صاحب کے ٹونک میرج ہال میں مولانا جمیل احمد کے سپرویژن میں انجام پذیر ہوا ہے۔ مدت کار: کتابت اور نقش و نگار اور جلد سازی دو سال میں مکمل ہوئی۔ نشست حروف: کتابت میں حروف کی نشست اس طرح رکھی گئی ہے کہ ہر لائن الف سے شروع ہوتی ہے۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 30 جنوری 2014

ایک شام علی سردار جعفری کے نام

نئی دهلی: لودھی روڈ پر واقع انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر کے گل مہر آڈیٹوریم میں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کی جانب سے اردو کے معروف شاعر اور دانشور علی سردار جعفری کے صد سالہ یوم پیدائش تقریبات کے سلسلے میں ایک پروگرام 'ایک شام علی سردار جعفری' کے نام سے منعقد ہوا۔ مذکورہ پروگرام دو اجلاس پر مشتمل تھا۔ پہلا اجلاس نثری اور دوسرا شعری۔ نثری اجلاس میں علی سردار جعفری کی شاعری اور نثر کے حوالے سے پروفیسر جانکی پرشاد شرما اور پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے مقالے پیش کیے جب کہ معروف براڈ کاسٹر شمیم عثمانی نے علی سردار جعفری کی مشہور نظم 'قوم دشمن' پیش کی۔ شعری اجلاس میں ترنم ریاض، فرحت احساس، پروفیسر عتیق اللہ تابش اور زبیر رضوی نے اپنی خوبصورت نظموں سے سامعین کو مسحور کیا۔ پروگرام کی نظامت ٹی وی اور ریڈیو کی معروف اینکر صبیحہ خان نے کی۔

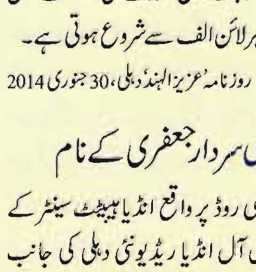

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 فروری 2014

پاکستانی مصور کا خیر مقدم

نئی دهلی: پاکستان کے روزنامہ 'جنگ' اور 'جیوٹی وی' کی جانب سے امن کی آشا عنوان سے ایک خصوصی وفد میں پاکستان سے سرزمین ہندوستان تشریف لائے۔ مشہور مصور شاہد رسام نے ہندوستان پہنچ کر یہاں کی ادبی و ثقافتی شخصیات سے ملاقات کے دوران ہند و پاک کے درمیان امن و اتحاد کی شمع روشن کرنے پر زور دیا۔ ہندوستان پہنچنے پر اخبار کے صحافیوں سے ایک خصوصی ملاقات میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ اپنے اس مشن پر ہندوستان آکر بہت خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان دونوں پڑوسی ملکوں میں امن و امان کے ساتھ ساتھ بھائی چارہ اور دلوں کے رشتے میں مزید اور زیادہ پائیداری پیدا ہونی چاہیے۔ قابل ذکر بات ہے شاہد رسام اردو تہذیب اور ثقافت کو فروغ دینے کے حوالے سے ادب کی گراں قدر شخصیات میں شامل ہیں اور عالمی پیمانے پر مصوری کے فن میں ممتاز شہرت کے حامل ہیں، جون ایلیا، صادقین امروہی و اقبال مہدی جیسی شخصیات کے وہ نہایت قریب رہے ہیں اور موصوف اردو شاعری کو مصوری کی شکل دینے کے فن سے بھی وابستہ ہیں۔ امروہہ سے تعلق رکھنے والی اردو ادب اور تہذیب کی ممتاز ترین شخصیت سید محمد علی حیدر نقوی نے امن کی آشا کے لیے اس خصوصی وفد اور اس کے روح رواں شاہد رسام و رفقہ راحت فتح علی خاں کا ہندوستان آمد پر خیر مقدم کیا ہے حالانکہ وہ اس وقت امریکہ سے براہِ راست خیر مقدمی کلمات میں شاہد رسام کا استقبال کیا اور مشہور نغمہ نگار گلزار کو بھی مبارکباد پیش کی ہے کہ اب ان کی شاعری کو بھی فن مصوری کا جامہ پہنا دیا جائے گا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 31 جنوری 2014

'تانیثیت کی تلاش' پر خصوصی لیکچر

نئی دهلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں معروف افسانہ ناول نگار ثروت خان نے خاتون قلم کاروں کے افسانوں میں 'تانیثیت کی تلاش' کے موضوع پر خصوصی لیکچر دیا۔ ڈاکٹر ایس خان نے ثروت خان کے افسانوی مجموعہ 'ذروں کی حرارت' اور ان کے مشہور ناول 'اندھیرا پگ' کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں ان کے مضامین کا مجموعہ 'شورشِ فکر' منظر عام پر آیا ہے جس کی اہل فکر و نظر نے پذیرائی کی ہے۔ ثروت خان نے اس بات کی وضاحت کی کہ خواتین نے جو کچھ لکھا وہ سب تانیثیت کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ جو کچھ خواتین کی زندگی اور ان کے مسائل نیز ان کے حقوق کے بارے میں لکھا جائے وہ تانیثی ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ مغرب میں فیمنزم کے نام پر شدت پسندی ابھر کر سامنے آئی جس سے خواتین کو مساوی حقوق دینے کے بجائے عورت اور مرد کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی۔ انھوں نے شدت پسندی کو تانیثیت کے لیے بڑا خطرہ قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 فروری 2014

دہلی میں ایران کا ثقافتی میلہ

نئی دهلی: ایران کے اسلامی انقلاب کی 35 ویں سالگرہ کے موقعے پر نئی دہلی میں واقع اندرا گاندھی سینٹر فار آرٹ میں عربی و فارسی خطاطی نمونے نمائش کے لیے پیش کیے گئے۔ قومی راجدھانی میں 2 روزہ ثقافتی میلہ میں ایران کلچر ہاؤس کی جانب سے منعقدہ اس نمائش میں ایران کے ماہر خطاط حسن مولائی تہرانی، تزئین کاری کے ماہر اردے شیر مختاری وافر اور علی رضا گولڈون کے ذریعہ تیار کردہ خوبصورت نمونے پیش کیے گئے۔ ادب اور آرٹ سے دلچسپی لینے والے لوگوں نے نہ صرف خطاطی کے ان خوبصورت نمونوں کو پسند کیا، بلکہ اسلامی خطاطی سیکھنے کے لیے ایران کلچر ہاؤس کے ذمے داروں کے سامنے اپنی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ ایران کلچر ہاؤس کے لائبریرین علی ظہیر نقوی نے بتایا کہ ''یہاں 3 خانوں میں نمائش کے لیے خطاطی اور نقاشی کے نمونے رکھے گئے ہیں۔ اسلامی خطاطی کے نمونوں قرآنی آیات، فارسی کے مشہور اقوال اور حکیمانہ اقوال تحریر تھے۔ یہ اتنی خوبصورتی کے ساتھ بنائے گئے ہیں اور اس میں رنگوں کا اس طرح خیال رکھا گیا ہے کہ آرٹ کے متوالے خود ہی اپنے آپ کھنچے چلے آتے ہیں۔ اسی طرح یہاں پرانی کہانیوں کے کرداروں کی نقاشی پیش کی گئی ہے، جسے علی رضا گولڈون نے تیار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 فروری 2014

دهلی :

ثروت خاں کی کتاب پر مذاکرہ

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہریاراں کے موقعے پر معروف افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان کی کتاب 'شورِ فکر' پر مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں اسکالروں نے اس کتاب پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اس کتاب میں جتنے بھی مضامین ہیں اُن میں نئے معنی

تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، خصوصاً خواتین کے مسائل پر جتنی سنجیدگی سے گفتگو کی گئی ہے، اس سے مصنف کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے بھی صدارتی خطبے میں کہا کہ ثروت کی اچھی تنقید کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک بہترین تخلیق کار ہیں۔ ان کا ناول اندھیرا پگ اُن کی تخلیقی کاوشوں کا ایک شاہکار نمونہ ہے اور موجودہ کتاب 'شورشِ فکر' ان کی عمدہ تنقید کی خوبصورت مثال ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ اس کتاب میں غالب کی فارسی شاعری پر جو گفتگو کی گئی ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب پر بھی گہری نظر ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ ثروت خان نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی اہم تخلیقی گوشے پیدا کیے ہیں جس سے اس کتاب کی انفرادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے کہا کہ ''شورشِ فکر' ثروت خان کی تنقیدی فکر کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ معروف ادیب پیغام آفاقی نے کہا کہ ثروت اپنی باتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے راجستھان کے کلچر کو جس خوبی کے ساتھ پیش کیا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ ثروت خان بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں جو کہ اُن کی بنیادی پہچان ہے مگر اُن کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین میں بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ اس کتاب میں شامل دو مضامین جو غالب اور انیس پر لکھے گئے ہیں، ان مضامین میں ثروت خان نے انیس کی شاعری میں انسانی رشتوں کی عظمتوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر ثروت خان نے خود اپنی تخلیق کے بارے میں کہا کہ خواتین کا قلم مردوں کے قلم کی برابری کرنے کے لیے نہیں اٹھتا کیونکہ گودوں کے پالوں سے بھلا کیا مقابلہ بلکہ عورت کا فکری نظام تو انسان کا انسان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک اور استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ آخر میں شاہد ماہلی نے اظہارِ تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 فروری 2014

کرشن چندر: فکر و فن

نئی دهلی: کرشن چندر اردو کے ممتاز اور انوکھے فکشن نگار تھے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہم اردو والوں نے اتنے بڑے فنکار کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ کرشن چندر صدی ہے اور ہم انھیں یاد تک نہیں کر پا رہے ہیں۔ ان خیالات

ساہتیہ اکادمی سمپوزیم میں چندر بھان خیال، اور دیگر مقررین

کا اظہار ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور ممتاز شاعر چندر بھان خیال نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں منعقد ایک روزہ 'کرشن چندر: فکر و فن' سمپوزیم میں کیا۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ بھی کہا کہ کرشن چندر نے اپنی تحریروں میں سماجی سروکار پر سب سے زیادہ اصرار کیا۔ انھوں نے کرشن چندر پر تنقید و تحقیق کی مزید ضرورت پر زور دیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر ایس اے شکور نے کہا کہ کرشن چندر اردو فکشن کی آبرو تھے۔ حیدرآباد سے زندگی بھر ان کا گہرا لگاؤ رہا۔ وہ بڑے تخلیق کار کے ساتھ بہترین انسان بھی تھے۔ پروفیسر شکور نے اس موقع پر اردو اکادمی حیدرآباد کی جانب سے کرشن چندر پر ایک بڑے سمینار کے انعقاد کا اعلان بھی کیا۔ پروفیسر بیگ احساس نے اپنے کلیدی خطبے میں کرشن چندر کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ کرشن چندر جیسے فنکار بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک لجنڈ کی ہے۔ انھوں نے اردو افسانے کو ایک اعلیٰ معیار عطا کیا۔ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ کرشن چندر نے کمزور طبقات کی آواز کو سب سے زیادہ اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ انھوں نے تکنیک کے نئے نئے تجربے کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت معروف فکشن نگار جیلانی بانو نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کرشن چندر اردو افسانے کے ایک عہد کا نام تھا۔ ان کی کتابیں اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اجلاس میں سید مصطفیٰ کمال اور ڈاکٹر فیروز عالم نے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر پدم بھوشن مجتبیٰ حسین، ضیاء الدین احمد شکیب، قدیر زماں اور اسلم فرشوری نے مذاکرے میں حصہ لیا جبکہ ڈاکٹر حبیب نثار، تسنیم جوہر، عبدالرب منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر ظفر گلزار اور مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات کے علاوہ حیدرآباد کی متعدد سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، مشتاق صدف، پروگرام آفیسر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 22 جنوری 2014

دیپا سلیم عرفان کی پہلی تحریری کاوش 'اورما'

نئی دهلی: اردو ادب میں تخلیقی صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے اور لگاتار نئی صلاحیتیں سامنے آ رہی ہیں ان ہی میں دبئی کی مصنفہ دیپا سلیم عرفان ہیں جن کی پہلی تحریری کاوش 'اورما' نے ادبی شخصیات کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اردو پریس کلب انٹرنیشنل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ 'اورما' کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور کتاب ہر جگہ دستیاب ہے۔ انقلاب ایران کے دوران ایک خاتون کی دربدری اور عشق و محبت کی زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے اورما کی کہانی بیان کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواتین اور لڑکیوں کو بھی ان کی پسند ظاہر کرنے کا حق دیجیے۔ دیپا سلیم عرفان نے کہا کہ اورما انگریزی میں لکھی گئی لیکن اردو میں ترجمہ کرنے سے انھیں بے پناہ خوشی اور مسرت ہو رہی ہے۔ یہ کتاب عالمی سطح پر مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ ان کے شوہر دبئی کے معروف صنعت کار عرفان اظہار ہیں جو اردو کے بڑے پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ اردو پریس کلب انٹرنیشنل کے جنرل سیکریٹری طارق فیضی نے کہا کہ دیپا سلیم عرفان نے اپنی پہلی کتاب سے ہی کم عرصے میں جتنی عالمی شہرت حاصل کر لی ہے یہ ان کی انفرادیت ہے، ایسی بہت کم خواتین ہیں جنھوں نے بطور مصنفہ اپنی پہلی ہی کتاب سے اتنی شہرت حاصل کی ہو۔

روزنامہ 'اخبار مشرق'، دہلی، 2 فروری 2014

اردو کی نئی بستیوں میں اردو ڈراموں کو فروغ

نئی دهلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کی جانب سے ایک پروگرام بعنوان 'اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے جاوید دانش سے ایک ملاقات' عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے مہمان موصوف کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ دیارِ غیر میں اردو کا چراغ روشن کرنے والوں کی فہرست میں ایک اہم نام جاوید دانش کا ہے جو کنیڈا میں، ہندوستانی تھیٹر کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ تاحال موصوف کے تین ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، جس پر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتہ کے علاوہ نیویارک، نیوجرسی اور کنیڈا کی ادبی تنظیموں نے بھی انھیں اعزازات سے نوازا ہے۔ نیز ان کے متعدد ڈرامے ہندی، بنگالی، گجراتی اور انگریزی میں ترجمہ اور اسٹیج ہو چکے ہیں۔ جاوید دانش محض ایک ڈرامہ نویس نہیں بلکہ ایک عمدہ شاعر، ادیب اور اسٹیج اداکار بھی ہیں۔ جاوید دانش نے اس محفل میں اپنا ڈرامہ 'مکتی' اور نظم 'درشن' پیش کیا۔ صدر محفل پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی یونیورسٹی) نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے

لال قلعہ میں جشن جمہوریت کے مشاعرہ کے دوران اسٹیج پر موجود راکھی بڑلا، شعیب اقبال، آل محمد اقبال، شکیل انجم، فرحان انجم ودیگر

حاضرین کو صدارتی کلمات سے نوازا۔ اس پروگرام میں جاوید دانش کے ڈراموں کے مجموعے 'چالیس بابا اور ایک چور' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد آصف نے جاوید دانش کی شاعری پر روشنی ڈالی اور مہمان جاوید دانش اور حاضرین بالخصوص طلبا و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 جنوری 2014

لال قلعہ میں مشاعرہ جشن جمہوریت

نئی دهلی: اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک طرز زندگی ہے۔ تحریک آزادی میں اردو کے رول کو قطعی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار دہلی کے وزیراعلیٰ اروند کجریوال نے لال قلعہ کے فصیل کے نیچے منعقدہ مشاعرہ جشن جمہوریت میں بھیجے اپنے پیغام میں کیا۔ ان کے پیغام کو دہلی کی وزیر برائے سماجی بہبود راکھی بڑلا نے پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی سرکار اردو کی ترویج وترقی پر اپنی پوری توجہ دے گی اور دہلی سرکار کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کا انتظام کیا جائے گا۔ انھوں نے واضح کیا کہ اردو اساتذہ کی یہ تقرریاں ڈی ایس ایس ایس بی کے ذریعہ عمل میں لائی جائیں گی۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کی کہ اردو اکادمی کے بجٹ کو دہلی سرکار کے دیگر کاموں میں خرچ نہیں کیا جائے گا۔ انھوں نے اکادمی کی ستائش بھی کی۔ وزیر برائے خواتین و اطفال راکھی بڑلا نے کہا کہ اردو اور ہندی زبانیں ہمارے لیے ماں اور موسی کی طرح ہیں۔ ان دونوں کے وجود کا تحفظ اور ان کا فروغ ہماری ذمہ داری ہے۔ صدارتی تقریر میں مٹیا محل کے ایم ایل اے شعیب اقبال نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اکادمی اچھا کام کررہی ہے لیکن کہنے کو تو ہم یہاں مشاعرہ جشن جمہوریت میں آتے ہیں لیکن حقیقت میں ہم ہر سال اردو کی برسی منا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف مشاعروں اور بیت بازی سے اردو زندہ نہیں رہ سکتی ہے جب تک کہ اس کی بنیادوں کو مضبوط نہ کیا جائے۔ شعیب اقبال نے کہا کہ 1995 کے بعد سے دہلی میں اردو کے ایک بھی ٹیچر کا تقرر نہیں کیا گیا اور انھیں ہندی کے ٹیچر پڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے سوال کیا کہ اردو کے ٹیچر ایڈہاک پر ہی کیوں بھرتی ہوں گے دوسری زبانوں کی طرح ان کا بھی مستقل تقرر کیوں نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے ساتھ تعصب کے رویہ کو ترک کرنا ہوگا جو پچھلی سرکاریں کرتی آئی ہیں۔ اس سے قبل شعیب اقبال، راکھی بڑلا، آپ کے سینئر لیڈر عرفان اللہ خان، شکیل انجم، فرحانہ انجم اور سٹی زون کے چیئرمین آل محمد اقبال نے ملک کے تاریخی جشن جمہوریت مشاعرے کی روشن شمع کی۔ تقریب کا آغاز قومی ترانہ سے ہوا۔ اس کے بعد سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اور علی سردار جعفری کا اردو ترانہ پڑھا گیا۔ بعد ازاں مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی نظامت منصور عثمانی نے کی۔ اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے تمام مہمانان اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جنوری 2014

آندھرا پردیش:

اردو یونیورسٹی میں ترجمہ پر توسیعی لیکچر

حیدرآباد: زبان دراصل انسانی مشاہدات اور تصورات کے اظہار کا نام ہے۔ انسان جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے مختلف چیزوں کے لیے جو تصور قائم کرتا ہے اسے الفاظ کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ لفظ اور معنی کے درمیان گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ماہر لسانیات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اے آر فتیحی نے اپنے توسیعی لکچر کے دوران کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ مطالعات ترجمہ میں 'ترجمہ اور لسانیات' کے موضوع پر ایک توسیعی لکچر پیش کررہے تھے۔ سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ترجمہ اور علم لسانیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ ترجمہ بنیادی طور پر اصل زبان کے متن میں موجود الفاظ کے لیے ہدفی زبان کے 'لسانی متبادل' کی تلاش کا کام ہے۔ لیکن ان متبادلات کی تلاش میں کئی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ موصوف کے توسیعی لکچر کے بعد شرکا مجلس نے ترجمہ اور لسانیات کے موضوع پر سوالات اور تبادلہ خیالات کیا۔ پروفیسر محمد ظفرالدین، صدر شعبہ ترجمہ وڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے صدارت کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے شعبہ ترجمہ میں منعقد ہونے والی اس علمی وفکری مجلس پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ پروفیسر فتیحی کے علمی و فکری لکچر نے ذہن کے مختلف دریچوں کو کھولا ہے۔ اجلاس میں شعبہ ترجمہ کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ غیر تدریسی عملہ اور طلبہ نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 18 جنوری 2014

حیدرآباد میں سہ روزہ کتابی میلہ

حیدرآباد: ٹیکنالوجی کے بڑھتے اثرات نے کتاب کی جگہ ٹیلی ویژن' کمپیوٹر اور سیل فون نے لے لی ہے۔ لوگوں میں کتاب کی اہمیت یاد دلانے اور نئی نسل کو کتابوں سے متعارف کرانے کے لیے حیدرآباد میں حالیہ عرصہ میں ایک کامیاب کتاب میلے کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ شہر حیدرآباد کا ایک معروف ادارہ انجمن ترقی و بقائے اردو کے زیراہتمام بہ تعاون نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نئی دہلی کی جانب سے ایک سہ روزہ اردو کتابی میلہ 25 جنوری تا 27 جنوری 2014 کا کامیاب انعقاد عمل میں لایا گیا۔ جس کا مقصد ایک پلیٹ فارم پر اردو کی کتابیں شائع کرنے والے مختلف اداروں کو جمع کرنا تھا تا کہ اردو سے دوری کے اس دور میں لوگ بہت سی کتابوں کو ایک جگہ دیکھ سکیں اور اپنی پسند کی کتابیں خرید سکیں۔ اس کتابی میلے کا افتتاح بیرسٹر اسد الدین اویسی ممبر آف پارلیمنٹ حیدرآباد کے ہاتھوں انجام پایا۔ افتتاحی پروگرام کے موقع پر بطور مہمان خصوصی پروفیسر ایس اے شکور نے شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کا دور حاضر میں سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اردو کے اساتذہ و دیگر حضرات اردو کی کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے اس کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اس افتتاحی تقریب میں مہمانِ اعزازی ڈاکٹر عبدالرحیم خان، محمد مصطفیٰ علی سروری، مولانا شاہ محمد شفیع الدین نظامی، محترمہ منور خاتون، الیاس طاہر، محمد آصف علی، حیدر ظفر نے شرکت کی۔ کتابی میلہ کے دوسرے دن مصنف سے ملاقات کے عنوان سے شہر حیدرآباد کے مشہور مصنفین کو مدعو کیا گیا تھا اس پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر محمد مصطفیٰ علی سروری تھے۔ سہ روزہ اردو کتابی میلے کے آخری دن 27 جنوری 2014 کو ایک سمینار بعنوان 'بچوں میں کتب بینی کو کیسے فروغ دیں' منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی صدارت پروفیسر مجید بیدار عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے انجام دی۔

بطور مہمان خصوصی پدم شری جیلانی بانو نے شرکت کی۔

پریس ریلیز محمد عبدالعزیز، ریسرچ اسکالر، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، 2 فروری 2014

اتر پردیش:

مسلم یونیورسٹی میں سرسید پر سیمینار

علی گڑھ: سرسید اویئرنیس فورم کے کارنامے علی گڑھ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ملک کے دیگر علاقوں میں بھی یہ فورم سرسید کے پیغامات کو عام کر رہی ہے۔ ان خیالات

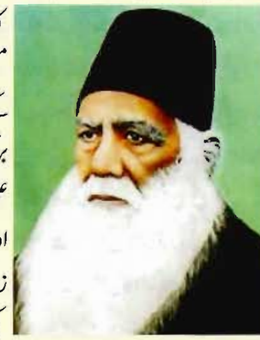

کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر برگیڈیئر سید احمد علی نے سرسید اویئرنیس فورم کے زیراہتمام علی گڑھ کی ریاستی صنعتی و زرعی نمائش میں 'سرسید کی حیات، خدمات اور مشن' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کے پیغامات کو عام کرنے کے لیے سرسید اویئرنیس فورم کی ٹیم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سرسید احمد خان کے لیے سچی خراج عقیدت یہی ہوگی کہ ان کے مشن پر چل کر اس یونیورسٹی کو ملک کی نمبر ون یونیورسٹی بنانے میں تعاون کریں۔ ڈاکٹر شکیل صمدانی نے مہمانِ خصوصی پرو وائس چانسلر برگیڈیئر سید احمد علی کا استقبال کرتے ہوئے فورم کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سرسید ایوارڈ 2014 ہندوستان کے مشہور ماہر قلب پروفیسر عروج ربانی (میڈیسن)، مانو اپکار سنستھا کے صدر وشنو کمار بنٹی (قومی یکجہتی)، حاجی اسلم انصاری (سماجی خدمات)، محمد احمد شیون (صحافت) فرخ بیگ (موسیقی) کو دیا گیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 فروری 2014

شاہنامہ فردوسی پر تین روزہ انٹرنیشنل سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے زیراہتمام شاہنامہ فردوسی پر تین روزہ انٹرنیشنل سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ عہد مغلیہ میں فارسی زبان ایک مدت تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے اور فارسی زبان نے ہندوستان کی تعمیرات، موسیقی، پینٹنگ اور اردو زبان پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رامائن اور مہابھارت کے تراجم بھی ہندوستان میں فارسی زبان میں کرائے گئے تا کہ ہندوستان کی تہذیب اور ثقافت کو فروغ دیا جا سکے۔ یوکے کی کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس میلولے نے کہا کہ شاہنامہ فردوسی کے بہت سے مخطوطات ہندوستان کے ذخائر میں موجود ہیں اور شاہنامہ فردوسی فارسی زبان کا شاہکار ہے۔ پرووائس چانسلر برگیڈیئر (ریٹائرڈ)، ایس احمد علی نے کہا کہ فارسی کی تاریخ کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ عہدِ مغلیہ میں بابر نے شاہنامہ فردوسی سے کافی مدد لی اور اسے فوج کی ترغیب کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اس ایک گھنٹہ کی فلم کا بھی حوالہ دیا جو ایران نے شاہنامہ فردوسی پر تیار کی ہے اور اس فلم کو تاریخ کا ایک اہم باب قرار دیا۔ اس موقعے پر ایران میں فردوسی مطالعات مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر جعفر، ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی فولادی، تاجکستان سفارت خانہ کے ڈائرکٹر عثمان علی، افغانستان سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری پروفیسر عبدالخالق رشید اور برطانیہ کی ڈاکٹر فیروزہ میلون نے بھی افتتاحی جلسہ کو خطاب کیا۔

روزنامہ 'سیاست تقدیر' دہلی، 19 جنوری 2014

اردو اساتذہ کا تربیتی کیمپ

علی گڑھ: اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں پہلی مرتبہ اردو اساتذہ کو ابتدائی اردو تعلیم کی جانکاری دینے کے سلسلے میں اردو ٹریز کے لیے پانچ روزہ تربیتی کیمپ کا انعقاد صوبائی تعلیمی ادارہ الہ آباد اتر پردیش میں کیا گیا۔ جس میں صوبے کے ہر ضلع سے تین تین اردو اساتذہ کو ٹریننگ دی گئی۔ الہ آباد سے ٹریننگ حاصل کر کے آئے اردو اساتذہ محترمہ رافعہ نکہت، حاجی مرزا، احرار بیگ، اور حاجی عبدالسمیع خاں نے نمائندہ کو بتایا کہ راجکیہ شکشا سنستھان الہ آباد اتر پردیش (صوبائی تعلیمی ادارہ الہ آباد) کے ہر دلعزیز پرنسپل جناب فیض الرحمٰن کی بے انتہا محنت و جدوجہد کے بعد اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اردو اساتذہ کو اردو ٹریز بنائے جانے کا جو تاریخی قدم اٹھایا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ محترمہ رافعہ نکہت نے بتایا کہ ہم لوگوں کو پانچ روزہ ٹریننگ میں اردو زبان کی ابتدائی تعلیم کی جڑوں کو کس طرح مضبوط کریں یہ سکھایا گیا۔ ادارہ کے قابل اساتذہ کرام نے اردو اساتذہ کو ٹریننگ دی لرننگ دینے والوں میں اساتذہ کرام کے علاوہ ادارہ کے اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائرکٹر جناب ستیش تیواری محترمہ ڈاکٹر عصمت نیلو انصاری اور محترمہ پریم لتا سنگھ نے بھی ٹریننگ میں اپنا بے حد تعاون دیا۔ اخیر میں اس ادارہ کی جانب سے تمام اساتذہ کو سرٹیفکیٹ تقسیم کیے۔ تمام اردو اساتذہ نے ادارہ کی صلاح کار ڈاکٹر عصمت نیلو انصاری کے ملے تعاون کا بھی شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 فروری 2014

13 ویں اردو جرنلسٹ کانفرنس

علی گڑھ: انڈین اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن علی گڑھ کے زیراہتمام علی گڑھ نمائش کے کرشنا انجلی ہال میں 13 ویں اردو جرنلسٹ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی سابق صوبائی وزیر خواجہ حلیم نے کہا کہ ہماری مذہبی کتاب عربی میں ہے اور قدیم لٹریچر فارسی میں اور اب زیادہ تر ہمارے مذہب اور تاریخ پر لکھی گئی کتابیں اردو زبان میں ہیں اور ہم نہ تو اردو لکھنا پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اس کو عام کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب کسی قوم کی تہذیب کو برباد کرنا ہو تو اس کی مادری زبان کو ختم کر دیا جائے یہ ہی حال اردو زبان کے ساتھ ہو رہا ہے، لیکن اس کے لیے حکومتوں کے ساتھ ساتھ ہم خود بھی ذمے دار ہیں۔ سماج وادی پارٹی کے ضلع صدر و سینئر لیڈر ڈاکٹر رکشپال سنگھ نے کہا کہ آج صرف اردو کا ہی نہیں بلکہ اور دیگر زبانوں کا برا حال ہے الگ الگ صوبوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کے تحفظ کی حکومتوں کی ذمے داری ہے۔ سینئر صحافی ایس افضال عابدی نے کہا کہ تالا اور تعلیم کی سرزمین علی گڑھ میں اردو زبان کی ترقی کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے جا رہے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ پردیپ سکسینہ نے کہا کہ 1947 کی لڑائی میں اس زبان کے اہم کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا آج یہ زبان ختم ہوتی جا رہی ہے آج جو بھی کوششیں کی جا رہی ہیں وہ ناکافی ہیں، اس موقعے پر ممبر اسمبلی ٹھاکر راکیش سنگھ نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ خیال رہے کہ گزشتہ 13 سال سے اس کانفرنس کے ذریعہ اردو کی خدمت کرنے والے ایسوسی ایشن کے صدر مبین خاں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سے قبل ایسوسی ایشن کی جانب سے معروف شاعر اویس جمال شمسی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'شتاب خاں ایوارڈ 2014' سے بھی نوازا گیا۔ جلسے کی نظامت معروف شاعر ڈاکٹر مجیب شہزر اور اویس جمال شمسی نے مشترکہ طور پر کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2014

علی گڑھ نمائش میں اردو جلسہ

علی گڑھ: علی گڑھ نمائش میں شمس مسلم ایجوکیشنل اینڈ

ویلفیئر سوسائٹی واتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے زیراہتمام جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کو خطاب کرتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ترجمان وایم ایل سی وویک بنسل نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے ہمارے اکابرین نے جو قربانیاں دی ہیں اس کو آج ہم نے فراموش کردیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد اسی لیے ڈالی تھی کہ اردو زبان کی ترقی ہو۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت اردو زبان اور اقلیتوں کی ترقی کے لیے فکرمند ہے اور متعدد اسکیمیں چلائی جارہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حال ہی میں ایک پارٹی کے اعلیٰ لیڈران کی میٹنگ میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ اردو زبان کو جب تک روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا تب تک اس زبان کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومتیں اپنا کام کرتی ہیں لیکن ان سے کام لینا بھی ہماری ذمے داری بنتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2014

اردو کے فروغ پر جلسہ

علی گڑھ: حکومت ہند کی مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعہ اردو زبان کے فروغ کے لیے تشکیل کردہ پروفیسر اخترالواسع کمیٹی کی سفارشات ایک ایسی دستاویز ہے جسے اگر حکومت ہند ایمانداری سے نافذ کرے تو نہ صرف اردو زبان کا فروغ ہوگا بلکہ ملک کی مشترکہ تہذیب بھی تقویت پائے گی۔ ان خیالات کا اظہار ایم پی ایم سی کے صدر پروفیسر رضاء اللہ خاں نے کیا۔ وہ مزمل منزل کامپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر ملت بیداری مہم کمیٹی (ایم بی ایم سی) علی گڑھ کے زیراہتمام 'اردو زبان کا فروغ اور تعاون' موضوع پر منعقدہ ایک فکری و تجزیاتی میٹنگ میں خطبۂ صدارت پیش کررہے تھے۔ پروفیسر خان نے کہا کہ پروفیسر اخترالواسع کمیٹی نے اپنی سفارشات میں اردو میڈیم طلبا کے لیے سرکاری کالجوں میں ریزرویشن کو لازمی قرار دیا ہے جو ایک اہم اقدام ہے کیونکہ اردو میڈیم کے بیشتر طلبا مدارس سے آتے ہیں اور اس اقدام کے بعد وہ ملک کے قومی دھارے میں شامل ہوسکیں گے۔ جسیم محمد نے کہا کہ کمیٹی نے اردو میں ترسیلی وسائل کے تعلق سے کورسیز شروع کیے جانے پر زور دیا ہے اور اگر حکومت ہند اس جانب توجہ مبذول کرتی ہے تو اردو زبان کے طلبا کو روزگار کے بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اے ایم یو ایکزیکیوٹو کونسل کے رکن ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ آج ملک میں فاصلاتی تعلیم کی اپنی منفرد اہمیت ہے اور کمیٹی نے اردو زبان میں تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے فاصلاتی تعلیمی نظام کی سفارش کی ہے۔ فرحت علی خاں نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا ادارہ ہے جو اردو زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کررہا ہے لیکن افسوس کہ اس کا بجٹ کافی کم ہے۔ کمیٹی نے اس کے بجٹ میں اضافہ کرکے 100 کروڑ کیے جانے کی سفارش کی ہے۔ میٹنگ میں بڑی تعداد میں دانشور، اساتذہ اور سماجی خدمت گار موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 8 فروری 2014

الہ آباد یونیورسٹی میں مرثیہ نگاری پر گفتگو

الہ آباد: الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں سال آخر اور سال رواں میں اردو ریفریشر کورس کا سلسلہ جاری ہے جو تعلیم و تدریس کے میدان میں خاصہ مقبولیت حاصل کررہا ہے۔ پروفیسر سید مجاور حسین نے اردو میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ گوئی پر نئی معلومات فراہم کی۔ انھوں نے کہا کہ مرثیہ سے ہمیں واقعات کربلا کی تاریخ کا پتہ ضرور چلتا ہے لیکن واقعات کربلا سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے یہ بات بھی غور طلب ہے۔ دورحاضر میں مرثیہ نگاری میں کمالات حاصل کرنے والوں میں مسعود اور جوش جیسے متعدد شعرائے کرام کے نام لیتے ہوئے کہا کہ ان شعرا نے مرثیہ کو ایک نئی جہت اور نئی سمت دی ہے۔ پروفیسر سید عقیل رضوی نے مرثیہ کی تاریخ اور منظرنامہ پر بات کی۔ معروف نقاد پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا تحقیق کا نتیجہ ضروری نہیں کہ مثبت ہی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ تحقیق کا حاصل کسی نہ کسی نئی تحقیق کی رہنمائی ضرور کرتا ہو۔ اس موقعے پر پروفیسر یعقوب یاور نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 جنوری 2014

سہ لسانی فارمولہ پر جلسہ

لکھنؤ: اردو رائٹرس فورم کے زیراہتمام ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے کنوینر سید وقار رضوی تھے۔ جب کہ صدارت مشہور شاعر منوررانا (صدر اترپردیش، اردو اکادمی) نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر شارب ردولوی نے شرکت کی۔ صدر ذی وقار منوررانا نے 'سہ لسانی فارمولہ' میں اردو کی شمولیت کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ صدر اکادمی کی حیثیت سے اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے کہا میں ہراس تحریک کے ساتھ ہوں جو اردو کے حق میں ہو۔ اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے۔ ہماری نسلیں اردو سے واقف ہوں۔ اس کے لیے سہ لسانی فارمولہ پر عمل کی ضرورت ہے۔ میری کوشش ہے 50 برس سے زیادہ عمر کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا کم ازکم 2لاکھ روپے کا انشورنس ہو۔ ہم اردو اکادمی کو قلب شہر میں واپس لانا چاہتے ہیں کیونکہ اردو کو حویلی کی نہیں ماحول کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ حکومت سے سہ لسانی فارمولہ پر عمل درآمد کے مطالعہ کے ساتھ ہیں پرائیویٹ اسکولوں میں اردو کا نظم کرنا ہے۔ وقار رضوی نے کہا ایسا نظم ہو کہ ہمارے بچے اردو پڑھیں۔ مدارس کے علاوہ کہیں بچے اردو نہیں پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو پڑھنے کا ہر اسکول میں اختیار ہو اس کے لیے ہم عنقریب وزیراعلیٰ کو منور رانا کی قیادت میں ایک میمورنڈم پیش کریں گے۔ اس موقعے پر منوررانا کو اردو رائٹرس فورم کا صدر بنایا گیا جس کی سبھی نے بالاتفاق تائید کی۔ نظامت رضوان احمد فاروقی نے کی۔ وقار رضوی کے کلمات شکرانہ پر محفل کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 9 فروری 2014

فارسی عربی پر سیمینار

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی میں منعقدہ سہ روزہ سیمینار کا افتتاح مالویہ ہال میں ہوا۔ سیمینار کا افتتاح پروفیسر اے کے سین گپتا کے ساتھ ایرانی کلچرل کاؤنسلر جناب علی فولادی، راجہ آف محمود آباد، جناب امیر محمد خان، پروفیسر محمد انور خیری افغانستان نے شمع روشن کرکے کیا۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر ارشد جعفری اور راجندر ورما نے تعارفی و تشکراتی کلمات کے ساتھ شریک ہونے والے دانشوروں اور مفکرین کا استقبال کیا۔ ''اودھ میں فارسی زبان وادب سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے سکریٹری آف پرشین ریسرچ اسکالر ایسوسی ایشن پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ ''اودھ میں ابتدا سے فارسی اور عربی کے ارتقا کی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن اس میدان میں مزید جدوجہد کی ضرورت ہے۔ ایرانی کلچرل کاؤنسلر جناب علی فولادی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''ایرانی تہذیب وثقافت کا ہمیشہ سے ہندوستان سے گہرا تعلق رہا ہے، ایران کے سینکڑوں شعرا مغلیہ سلطنت کے عہد میں ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنی زبان دانی اور شیریں سخنی سے ہندوستانی تہذیب کے قلوب کو مسخر کیا۔ پروفیسر محمد انور خیری نے اپنے خطاب میں ہندوستان اور افغانستان کے درمیان دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں افغانی نژاد شعرا کا بھی اہم کردار رہا ہے۔

سیمینار کے مہمانِ خصوصی جناب رضا مصطفوی سبزواری نے کہا کہ ''اودھ کے امرا و سلاطین کو بھی فارسی اور عربی زبان سے گہرا شغف رہا ہے، ساتھ ہی انھوں نے اودھ میں فنون لطیفہ کی بھی آبیاری کی۔ انھوں نے اودھ میں اس زبان سے تعلق رکھنے والے ادبا اور شعرا کی بھی کفالت کی۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا فارسی زبان و ادب کا سرمایہ اودھ میں موجود ہے۔ کسی شہر اور ریاست میں نہیں ہے۔ پروفیسر اے کے سین گپتا نے کہا کہ یہ بڑی بات ہے کہ اورینٹل ڈپارٹمنٹ ڈیڑھ سو سالہ جشن منا رہا ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہمارے طلبا کی پلیسمنٹ میں کہاں تک کامیاب ہیں اور تحقیق کے میدان میں کتنا کنٹری بیوشن ہے۔'' پروفیسر عین الحسن عابدی نے سیمینار کی نظامت بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 فروری 2014

جاوید دانش کو استقبالیہ

لکھنؤ: اردو ایک مہاجر زبان ہے، جب تک ہجرت ہوگی اردو سفر کرتی رہے گی، جب تک مہاجر رہے گا اردو رہے گی اور یہ بالکل نہیں لگتا ہے کہ سفر ختم ہوگا۔ لندن کے بعد اردو کا دوسرا سب سے بڑا مرکز کناڈا ہے، جہاں پنجابی، مسیحی اور دوسری زبانوں میں اردو چوتھے نمبر پر ہے۔ ان خیالات کا اظہار کناڈا میں سکونت پزیر اردو شعر و ادب کی سرگرم شخصیت جاوید دانش نے جمعہ کو یہاں ایک استقبالیہ تقریب میں اپنے خطاب کے دوران کیا۔ مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن کے بانی جنرل سکریٹری محمد وصی صدیقی کے زیر اہتمام اور پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی صدارت میں ہونے والی اس تقریب میں مزید کہا کہ کسی بھی شکل میں ہو اردو زندہ رہے گی۔ کارل مارکس کو انقلاب لانے کے لیے 25 ملین کتابیں چھاپنا پڑی تھیں ایسا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ تقریب میں فاؤنڈیشن کے صدر چودھری شرف الدین، کارگزار صدر حسین امین، سینئر شاعر و صحافی رئیس انصاری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2014

منور رانا اور نواز دیوبندی اردو اکادمی کے سربراہ مقرر

لکھنؤ: یوپی اردو اکادمی کی تشکیل کے لیے ہائی کورٹ سے گزشتہ 30 جنوری کو ایک مہینے کا وقت ملنے کے بعد ریاستی حکومت نے اردو اکادمی میں صدر اور چیئرمین کی نامزدگی کردی ہے۔ مشہور شاعر منور رانا کو صدر اور ماہر تعلیم اور شاعر نواز دیوبندی کو چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔

سرکاری ذرائع نے بتایا کہ ان دو ناموں پر وزیر اعلیٰ کی منظوری ہوگئی ہے جب کہ ممبران کی نامزدگی کی کارروائی جاری ہے۔ یاد رہے کہ مفاد عامہ کی ایک عرضی پر ہائی کورٹ کی طرف سے حکومت کو توہین عدالت کا نوٹس جاری ہونے کے بعد سرکاری وکیل نے گزشتہ 30 جنوری کو ہائی کورٹ کو بتایا تھا کہ ناموں کا انتخاب ہوگیا ہے اور ایک مہینے کے اندر اردو اکادمی کی تشکیل ہوجائے گی۔ سماجوادی پارٹی نے مارچ 2012 میں حکومت قائم ہونے کے بعد جب ڈیڑھ سال کی مدت میں یوپی اردو اکادمی کی تشکیل نہیں کی تو ہائی کورٹ کے وکیل فاروق احمد نے ستمبر 2013 میں اس بارے میں مفاد عامہ کی عرضی داخل کی تھی۔ انھوں نے محکمۂ لسانیات کے پرنسپل سکریٹری کو اردو اکادمی کے ضابطوں کے خلاف اس کا نائب صدر مقرر کیے جانے پر اعتراض کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 فروری 2014

ہمارا معاشرہ اور صحافت کی ذمے داریاں

دیوبند: نئے سال کی آمد پر گزشتہ شب مسلم فنڈ ٹرسٹ کی جانب سے 'ہمارا معاشرہ اور صحافت کی ذمہ داریاں' کے عنوان سے شیخ الہند ہال میں ایک تقریب کا انعقاد عمل میں آیا اس موقع پر مسلم فنڈ ٹرسٹ کے منیجر اور آل انڈیا اقتصادی کونسل کے چیئرمین مولانا حسیب صدیقی نے کہا کہ ایشیا کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی بنا پر یہاں کی خبروں تجزیوں تبصروں اور مضامین کو عالمگیر سطح پر نہ صرف پڑھا جاتا ہے بلکہ لوگ اسے اپنی مذہبی سیاسی اور سماجی زندگی میں محسوس بھی کرتے ہیں۔ دیوبند میں نہ صرف مسلم بلکہ ہندی اخبارات سے تعلق رکھنے والے غیر مسلم صحافی بھی عالمی سطح پر دیوبند کے پیغام کو پہنچانے میں تعاون دیتے ہیں۔ تقریب کے مہمان خصوصی مولانا ندیم الواجدی نے کہا کہ جمہوریت کی بقا کے لیے ایماندار اور بے لاگ صحافت کی ضرورت ہے اور دیوبند کے صحافیوں نے ان تقاضوں کی ہمیشہ پاسداری کی ہے۔ نامور ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ پورے ملک میں اردو صحافت مخالف حالات کے باوجود نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی کر رہی ہے۔ سینئر صحافی اطہر عثمانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافی کی جانب سب کی نظریں مرکوز رہتی ہیں اس کے ذریعے تحریر کی گئی کوئی بھی خبر معاشرے میں انتشار کا سبب بھی بن سکتی ہیں اس لیے اسے چاہیے کہ وہ قوم اور ملک کے حق میں مثبت رپورٹنگ کرے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 جنوری 2014

بہار:

پٹنہ میں کاروانِ اردو بہار کا 'یومِ اردو'

پٹنہ: اردو تحریک کے میر کارواں الحاج غلام سرور اور ان کی اردو تحریک کے سچے ساتھیوں کی یاد میں کاروان اردو بہار کی طرف سے شری کرشن میموریل ہال، پٹنہ میں 'یوم اردو' کے موضوع پر ایک عظیم عوامی تقریب منعقد کی گئی جس کا افتتاح رام ولاس پاسوان نے کیا اور صدارت پروفیسر عبدالباری صدیقی، سابق لیڈر حزب مخالف، بہار قانون ساز اسمبلی نے کی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی رام ولاس پاسوان، سابق مرکزی وزیر و مہمانِ اعزازی رام کرپال یادو رکن پارلیمنٹ، سابق مرکزی وزیر علی اشرف فاطمی، سابق مرکزی وزیر رگھوناتھ جھا، سابق مرکزی وزیر الیاس حسین تھے۔ اس تاریخی تقریب 'یوم اردو' کے کنوینر پروفیسر غلام غوث (سابق لیڈر حزب اختلاف بہار قانون ساز کونسل) نے اجلاس میں موجود تمام لوگوں کو یہ عزم لینے کو کہا کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان اردو کی تعلیم لازمی طور پر دلائیں گے اور اس کی درس و تدریس کے لیے اپنی سہولت کے مطابق ایک اردو روزنامہ ایک اردو میگزین ضرور خریدیں گے۔ اس موقع پر ریاست کے کونے کونے سے آئے ہوئے اردو دوستوں اور غلام سرور کے شیدائیوں نے انھیں سچی خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور ریاستی حکومت سے اردو کے فروغ سے متعلق مطالبات بھی کیے جن میں ملک کی سبھی ریاستوں میں عملی طور پر ہندی کو راشٹریہ بھاشا کے طور پر اعزاز دیا جائے۔ ملک کی 15 ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ غلام سرور کی یادگار کے طور پر ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت سی بی ایس ای نصاب میں اردو کو لازمی زبان کے طور پر شامل کیا جائے اور سبھی مرکزی اسکولوں میں (جہاں کم سے کم 10 اردو زبان کے طالب علم ہوں) ایک اردو ٹیچر کی تقرری لازمی بنا کر اردو کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 جنوری 2014

جشن اردو کے موقعے پر خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ بہار

ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں زبان کا تعارف

گیا: 7 فروری (جمعہ) کو 3 بجے سہ پہر کتاب میلہ گاندھی میدان گیا میں بزم قلم کار گیا کے زیر اہتمام 'ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں زبانوں کا تعاون' کے عنوان سے سے ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر انیرودھ سنگھ نے کی جب کہ سیمینار میں بطورِ مہمان خصوصی پروفیسر محبوب علی قریشی، شریمتی گیتا کماری، شری سوربھ رائے، شری کندن کمار اور اعجاز کریم خاں نے شرکت کی۔ بزم کے سکریٹری نے بزم کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد سیمینار کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے انکم ٹیکس کمشنر شری سوربھ رائے نے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہندوستان کی تہذیب میں زبانوں کا کردار اہم رہا ہے۔ ٹیچرس ٹریننگ اسکول کی سبکدوش پرنسپل شری متی گیتا کماری نے مختلف علاقہ وقبیلہ کے توسط الگ الگ زبان اور اس کے اقدار پر روشنی ڈالی اور معنی اور الفاظ کے بارے میں بھی بتایا۔ پروفیسر محبوب اعلیٰ قریشی (سابق پرنسپل اورینٹل کالج پٹنہ سٹی) نے کہا کہ اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے 4 سے 5 گھنٹوں کی ضرورت ہے تبھی بحث پوری ہوسکتی ہے۔ کتاب میلہ کے آرگنائزر شری کندن کمار (صحافی) نے بھاشا اور سنسکرتی پر بحث کی اور اس موضوع کو متنوع بتایا۔ شتابدی پبلک اسکول کے پرنسپل جناب اعجاز کریم خان نے بزم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شکیل علائی کی ستائش کی۔ اس کے بعد موضوع کے تعلق سے انھوں نے زبانوں کے فروغ میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے موہن جوداڑو موسوپوٹامیا وغیرہ جیسی کھوج پر تفصیل سے گفتگو کی۔ جلسے کی صدارت کررہے پروفیسر انیرودھ سنگھ نے اس موضوع پر سیمینار کرانے کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے آغاز سے قبل 2 فروری کو گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول رمنہ میں بحث ومباحثہ کے مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلبا وطالبات کو انعام واکرام اور توسیعی سند سے بھی نوازا گیا۔

پریس ریلیز شکیل علائی (جنرل سکریٹری) بزم قلمکار، بہار 10 فروری 2014

حکومت بہار اردو کی ترقی کے لیے پابند عہد

پٹنہ: وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کہا ہے کہ ریاستی حکومت نے اردو کی ترقی کے لیے نئی پالیسی بنائی ہے اور اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی بحالی کی جائے گی۔ وزیر اعلیٰ دوروزہ جشن اردو کے موقع پر خطاب کررہے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو ہماری تہذیب کا حصہ ہے، ہم اپنی زبان کی بدولت زیادہ ترقی کرسکتے ہیں۔ اردو اور ہندی کو مل کر متبادل بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عوام کی زبان میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے اردو کتابوں کی نمائش کا بھی افتتاح کیا۔ وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کہا کہ ریاستی حکومت بہار میں تمام اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے تمام ضروری سہولیات فراہم کرنے کی پابند عہد ہے اور وہ ریاست کی اس دوسری سرکاری زبان کو فروغ دینے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرے گی۔ جشن اردو پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر کمار نے کہا کہ اردو ایک ثروت مند زبان ہے اور صدیوں سے ملک کی تہذیب وثقافت کو مالا مال کررہی ہے۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی کے طور پر پدم شری ڈاکٹر کلیم احمد عاجز، رضی احمد، علیم اللہ حالی، پروفیسر اسلم آزاد وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 جنوری 2014

دربھنگہ میں اردو اساتذہ کی تربیت

دربھنگہ: دنیا میں پیشۂ درس وتدریس واحد ایسا پیشہ ہے جس میں آغاز تا انجام سیکھنے اور سکھانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اردو کے نامور ادیب وناقد پروفیسر صفدر امام قادری نے مقامی ملت کالج، دربھنگہ میں سی آئی آئی ایل، میسور کے زیر اہتمام اردو اساتذہ کے لیے منعقد پانچ روزہ تربیتی پروگرام کے اختتامیہ اجلاس میں کہا کہ آج نصاب کی ترتیب کا عمل بالکل سائنٹفک ہے اس لیے درس کا طریقہ کار بھی سائنٹفک ہونا ضروری ہے اور اس پروگرام کا مقصدِ اولین یہ ہے کہ اردو اساتذہ کو جدید ترین طریقۂ درس سے واقف کرایا جائے۔ رابطہ کار سی آئی آئی ایل، میسور، ڈاکٹر محمد رضوان، عاقل زیادہ نے اس طرح کے تربیتی پروگرام کی اہمیت وافادیت کو سراہا اور اساتذہ کی کاوشوں کی تحسین کی۔ ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل ملت کالج نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اس تربیتی پروگرام سے صرف ان اساتذہ کو ہی فائدہ نہیں پہنچا ہے بلکہ ہم لوگوں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔ بالخصوص سی آئی آئی ایل کے رابطہ کار ڈاکٹر زبیر شاداب خان و ڈاکٹر محمد رضوان نے جس طرح خلوص نیتی کے ساتھ اردو اساتذہ کو جدید ترین طریقۂ درس وتدریس سے وقف کرایا ہے بلاشبہ وہ ہم لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہے۔ اختتامیہ اجلاس میں تمام شرکائے اساتذہ کو اسناد تقسیم کیے گئے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' 9 فروری 2014

تمل ناڈو:

سردار جعفری شخصیت اور کارنامے

چنئی: (راست) شعبۂ عربی فارسی و اردو مدراس یونی ورسٹی میں 31 دسمبر 2013 کو 'سردار جعفری شخصیت اور کارنامے' پر قومی اردو سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے روح رواں ڈاکٹر سید سجاد حسین نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سیمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر حکیم سید ستار، ربانی ویدیا سالہ نے اس سمینار کا افتتاح کیا اور اردو زبان کی اہمیت وضرورت سے متعلق شرکا سے خطاب کیا۔ جناب ایچ ای عبدالعزیز میجنگ ڈائرکٹر A.I.Enterprises اور محترمہ فاطمہ مظفر، لیڈر، انڈین یونین مسلم لیگ بطور مہمانان اعزازی شرکت فرمائی۔ محترمہ فاطمہ مظفر نے دوران خطاب اردو زبان کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ صرف مشاعرے اور سیمینار ہی اردو کی روح نہیں ہیں بلکہ اس کے زبان وادب میں وہ وسعت وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے ہمیں دین ومذہب کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے انجام دیے۔ پروفیسر آر تھانڈاون، وائس چانسلر، مدراس یونی ورسٹی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی ان کے ہاتھوں ریاست وبیرون ریاست کی پچیس اہم شخصیات کو ان کی اعلیٰ تعلیمی، شعری، ساجی وملی خدمات کے اعتراف میں 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' پیش کیے گئے۔ قبل ازیں ڈاکٹر جاویدہ حبیب کی تصنیف 'تاریخ اولیائے تمل ناڈو' ڈاکٹر محمد جمال کا شعری مجموعہ 'جمالیات' ڈاکٹر امان اللہ ایم بی کی تصنیف 'تمل ناڈو کے ممتاز عربی مدارس اور ان کی ادبی کہکشاں' اور جناب منیر رشیدی کا شعری مجموعہ 'شبستان'

کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ سیمینار کے بعد ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب علیم صبا نویدی نے کی اور نظامت کے فرائض جناب مختار بدری نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں محترمہ قدسیہ گاندھی IAS، سابق ایڈیشنل چیف سکریٹری، حکومت تمل ناڈو موجود تھیں اور ان کے ہاتھوں مندوبین سیمینار کو سرٹیفکیٹ پیش کیے گئے۔

پریس ریلیز، فیصل سعید، چنئی، تمل ناڈو، 2 جنوری 2014

کیرلہ:

کیرل میں اساتذہ کی اردو کانفرنس

مالاپورم: ریاست کیرالہ کی قدیم معروف و مشہور متحرک اردو تنظیم کیرالہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے تحت مالاپورم میں کیرالہ کے معروف اردو شاعر ایس ایم سرور کی یاد میں ایک روزہ عظیم الشان اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کا انعقاد مالاپورم گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں ہوا۔ کانفرنس کا افتتاح ریاستی اقلیتی وزیر منجلا کٹی علی نے کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ کیرالہ حکومت اقلیتی فنڈ کے تحت اردو زبان کے فروغ کے لیے بے حد کوشاں ہیں۔ کانفرنس کی صدارت مقامی ایم ایل اے پی عبیداللہ نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر حسین رنٹا تانے اردو ہماری زبان ہے کے عنوان سے جامع خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ قدآور شخصیات سوامی وویکانند اور راجہ رام موہن رائے نے اردو زبان کو پسند کیا۔ یہی وجہ کہ وہ اپنی تحریر میں بسا اوقات اردو زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ خیر مقدمی کلمات کے یو ٹی اے ضلع سکریٹری ایم حسین نے کیا۔ اس موقعے پر سال رواں ضلعی سطح پر اسکول فیسٹول میں کامیاب ہونے والے بچوں کو گراں قدر انعامات سے نوازا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 جنوری 2014

کرناٹک:

بیدر اتسو کے موقعے پر کل ہند مشاعرے کا اہتمام

بیدر: بیدر اتسو 2014 کے موقعے پر ضلع انتظامیہ بیدر کی جانب سے کل ہند مشاعرہ کا اہتمام احاطہ مدرسہ محمود گاوان بیدر میں عالمی شہرت یافتہ بزرگ شاعر گلزار دہلوی کی زیر صدارت منعقد کیا گیا تھا جس کی نظامت کا فریضہ اقبال اشہر (دہلی) نے انجام دیا۔ مشاعرہ کا افتتاح این دھرم سنگھ سابق وزیر اعلیٰ کرناٹک اور رکن پارلیمان کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ بیدر اتسو کا یہ مشاعرہ قدآور شعرا کی شرکت کے باعث ایک تاریخ مرتب کرنے جا رہا ہے۔ اردو زبان کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اس زبان کی شاعری نے ایک جہاں کو مسخر کیا ہے۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 6 فروری 2014

مہاراشٹر:

عصر حاضر میں اردو کے مسائل اور اس کا حل

پونہ: انجمن خیرالاسلام پونا کالج آف آرٹس سائنس اینڈ کامرس کیمپ پونے شعبۂ اردو، فارسی اور عربی کے زیر اہتمام 2 جنوری 2014 بروز جمعرات پونہ کالج پونے میں 'عصر حاضر میں اردو کے مسائل اور اس کا حل' کے موضوع پر خصوصی لیکچر منعقد ہوا جس میں عالمی شہرت یافتہ ادیب و مفکر عالی جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ لیکن مسلمان نہیں۔ اردو نئے خون کی ضرورت ہے۔ لہٰذا گاؤں اور دیہاتوں میں بھی اردو کے مدرسے و مراکز قائم کیے جائیں تا کہ اردو زبان کا فروغ

ممکن ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کو جدید بنیادی تعلیم کی طرف متوجہ کرانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر جی ایم ناظر الدین پرنسپل پونہ کالج نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''موجودہ دور میں اردو زبان کی جو حالت زار ہے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ آج اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے خود اردو والوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے تا کہ اردو زبان صحیح ڈھنگ سے اپنا حق حاصل کر سکے۔'' ڈاکٹر عبدالباری صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی پونہ کالج نے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف کرانے کے بعد عصر حاضر میں اردو زبان کے مسائل پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب کا نام بھی ہے۔ اس کی بقا اور ترقی ہمارا فرض عین ہے۔ دوران تقریب 'فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری' پر منعقدہ سیمینار پر فیض نمبر کی رسم رونمائی ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہاتھوں عمل میں لائی گئی۔ اس موقعے پر شہر کی سرکردہ شخصیتوں میں جناب منور پیر بھائی، صدر نشین حاجی غلام محمد ایجوکیشن ٹرسٹ اعظم کیمپس، محترمہ ممتاز منور پیر بھائی، ڈاکٹر شکیل احمد وائس پرنسپل آف آرٹس فیکلٹی بھی موجود تھے۔ حافظ غلام احمد نے جلسے کی نظامت بحسن خوبی انجام دی اور ان ہی کے شکریہ پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر عبدالباری، صدر شعبۂ اردو فارسی وعربی پونہ کالج، پونے، 13 جنوری 2014

ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تحقیقی سرگرمیاں

ممبئی: ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ریسرچ ایسوسی ایشن کے ذریعہ منعقدہ پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے ادیب و نقاد پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ شعبۂ اردو کے ذریعہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحت جو تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں وہ زبان و ادب میں افہام و تفہیم کے نئے باب وا کرنے کی حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دور حاضر میں تحقیق کے معیار کو برقرار رکھنے اور اس میں نئے امکانی جہات کو تلاش کرنے کے لیے صدر شعبہ، تمام اساتذہ اور وہ سبھی طلبہ مبارک باد کے مستحق ہیں جو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحت مختلف عنوانات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ پروگرام میں پی ایچ ڈی کے طالب علم ریحان انصاری نے اردو رسم الخط اور خط نستعلیق کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے صدر پروفیسر صاحب علی تھے۔ پروگرام میں شعبے کی سربراہ ڈاکٹر معزہ قاضی، شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز، ڈاکٹر جمال رضوی اور قمر صدیقی کے علاوہ ایم فل، پی ایچ ڈی اور ایم اے کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 فروری 2014

اعزاز و اکرام:

دہلی اردو اکادمی ایوارڈ کی تقسیم

نئی دھلی: اردو اکادمی کے زیر اہتمام مختلف یونیورسٹیز، بورڈز، اردو سرٹیفکیٹ و ڈپلوما کورس، اردو کتاب، اردو کمپیوٹر کورس اور ڈراما ورکشاپ میں نمایاں کارکردگی پیش کرنے والے طلبا و طالبات کے لیے جلسہ تقسیم انعامات کا انعقاد کیا گیا۔ اردو اکادمی، دہلی کے 'قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم' میں منعقد کیے گئے اس جلسے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سی آئی ایس ایف کے آئی جی سوراج بیر سنگھ نے شرکت کی۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے گزشتہ 28 برسوں سے منعقد کیے جا رہے

دہلی اردو اکادمی ایوارڈ کی پروگرام میں اردو سرٹیفکیٹ و ڈپلوما کورس کے طلبا و طالبات گروپ پوز دیتے ہوئے

جلسہ تقسیم انعامات کی تفصیلات بتائیں۔ انیس اعظمی نے مہمان خصوصی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ سوراج بیر سنگھ پنجابی زبان کے بہت اچھے شاعر اور ادیب بھی ہیں اور ان کے تقریباً 6 شعری مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو تہذیب و تمدن کی زبان ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مذہب انسانوں کا ہوتا ہے۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ہماری نئی نسل کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہو کیوں کہ آپ اور آپ کی اردو کو جو مقام حاصل ہوا ہے وہ آپ کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض ریشماں فاروقی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 فروری 2014

انڈین کلچرل سوسائٹی کا ایوارڈ

امروهه: جدید لب و لہجے کے شاعر اور اصلاحی فکر رکھنے والے ممتاز دانشور ڈاکٹر جمشید کمال امروہوی کو شہر کے شہنائی ہال میں منعقد کل ہند مشاعرے کے دوران 'جوش ملیح آبادی' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ موصوف گزشتہ 20 برسوں سے اردو شاعری میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دیار مصحفی میں انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے منعقد ایک کل ہند مشاعرہ کے دوران ڈاکٹر جمشید کمال امروہوی کے ساتھ جاوید اقبال کو فیض احمد فیض ایوارڈ، شمیم نقوی کو میر انیس ایوارڈ مسرور جوہر کو میر تقی میر ایوارڈ، مرزا ساجد امروہوی کو احمد رضا خاں بریلوی ایوارڈ و معروف شاعر اظہر عنایتی کو مصحفی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر منعقد معاشرہ میں ملک کے ممتاز شعرائے کرام نے کلام بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر جمشید کمال کو ملے اس اعزاز کے سلسلے میں عمائدین شہر نے مبارک باد پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2014

معروف شاعر چندر بھان خیال کو اقبال سمان

نئی دهلی: اردو کے معروف ادیب جناب چندر بھان خیال کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت مدھیہ پردیش نے 26 جنوری کو یوم جمہوریہ کے پروقار موقع پر گورنر مدھیہ پردیش عزت مآب رام نریش یادو کے ہاتھوں نوازا گیا۔ اس پروقار تقریب میں وزیر ثقافت حکومت مدھیہ پردیش شری راجندر پٹوا نے بھی شرکت کی۔ یاد رہے کہ مذکورہ ایوارڈ وزارت ثقافت حکومت مدھیہ پردیش کی طرف سے دیا جاتا ہے جس میں دو لاکھ

معروف شاعر چندر بھان خیال گورنر مدھیہ پردیش سے 'اقبال سمان' حاصل کرتے ہوئے

روپے نقد توصیف نامہ، شال اور شری پھل یادگار طور دیا جاتا ہے۔ چندر بھان خیال ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبر ہیں۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین بھی رہ چکے ہیں۔

محمد موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 14 فروری 2014

نواز دیوبندی کو میر تقی میر ایوارڈ

دیوبند: عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب ڈاکٹر نواز دیوبندی سرپرست نواز گرلس پبلک اسکول دیوبند کو امریکہ اور کناڈا میں مقیم بنیادی طور پر ہندوستان شہری کی تنظیم 'امریکن فیڈریشن آف مسلم آف انڈیا اور یجن کے زیر اہتمام گزشتہ روز ریاست آسام کی راجدھانی گوہاٹی میں منعقدہ تنظیم کی 22 ویں بین الاقوامی پروقار تقریب میں میگھالیہ کے گورنر دیوانند کنور اور تنظیم کے صدر ڈاکٹر ایوب خاں کے دست مبارک سے 15 ہزار کے چیک کے ساتھ میر تقی میر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس تقریب میں مولانا بدرالدین اجمل (ایم پی) سابق وائس چانسلر علی گڑھ پی کے عبدالعزیز کے علاوہ فیڈریشن کے کناڈا امریکہ لندن، سنگاپور اور دبئی سے تشریف لائے ذمہ داران نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس اعزاز کی خوشی میں ادبی تنظیم انٹرنیشنل قلم فاؤنڈیشن نے ڈاکٹر نواز دیوبندی کے اعزاز میں نواز گرلس اسکول میں انعقاد کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی دہلی پبلک اسکول دہلی کے پرنسپل اقرار حسن نے کہا کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری صرف لفظوں کا جوڑ توڑ نہیں بلکہ روح کی غذا کا سامان ہے۔ پروفیسر محمد سلیمان نے کہا کہ نواز دیوبندی کے مزاج کی سادگی اور پاکیزگی ان کی شاعری میں دور سے پہچانی جاتی ہے۔ اس موقع پر اجے سنگھل بٹو نے نواز دیوبندی کی شاعری کو کھرے سونے سے تعبیر کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 جنوری 2014

انجم جمالی ایوارڈ تقریب

میرٹھ: ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ترقی پسند شاعر افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر انجم جمالی کی یاد میں جمالی ایوارڈ ادب اور صحافت کے شعبوں میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والوں کو دیے گئے ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ پروگرام کے تحت مہمان خصوصی وزیر شاہد منظور شاعری کے حلقے میں اشوک ساحل، الیکٹرونک میڈیا ای ٹی وی اردو کے تنظیم روضہ، پرنٹ میڈیا کے حلقے میں عزیز برنی، تعلیم کے حلقہ میں ڈاکٹر سیما جین، کو ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروگرام کی صدارت نگین جند چین نے کی۔ پروگرام کا آغاز سو بھارتی یونیورسٹی وی سی پروفیسر منظور احمد نے شمع روشن کرکے کیا۔ مہمان خصوصی وزیر شاہد منظور، وہلی کے ودھا یک شعیب اقبال نے ڈاکٹر جمالی کو ایک عظیم شاعر اور صحافی بتایا۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جنوری 2014

صحافی و شعرا کو سوامی وویکانند اعزاز

دیوبند: ادبی و صحافتی تنظیم راشٹریہ سنکر کے زیر اہتمام دہلی میں منعقد تقریب میں شاعر ماسٹر شمیم کرت پوری، صحافی اوم ویر سنگھ اور کوی و شاعر مہتاب آزاد کو ان کی ادبی و صحافتی خدمات کے پیش نظر 'سوامی ویکانند اعزاز 2014' دیے جانے پر ادبی تنظیم 'ساہتیہ سنگم' کے کارکنان نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس بابت منعقد تہنیتی میٹنگ میں کالم نگار کمل دیوبندی نے مذکورہ ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کی اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اعزاز سے نئی نسل کے شعرا اور صحافیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ شاعر دلشاد خوشتر نے کہا کہ ادب اور صحافتی میدان میں جو لوگ اپنی خدمات انجام دے رہیں وہ قابل تعظیم ہیں۔ میٹنگ کی صدارت دلشاد خوشتر نے کی، جب کہ نظامت کمل دیوبندی نے کی۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 16 جنوری 2014

ڈاکٹر عزیز عرفان

اورنگ آباد: 'بلڈرانہ راجے چھترپتی آرٹس کالج بلڈانہ' میں بزم اردو ادب کی جانب سے بتاریخ 22 دسمبر 2013 بمقام نگر پریشد اسکول نمبر2، پروگرام منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر گنیش گائیکواڑ نے کی۔ بطور

مہمان خصوصی جناب وجے راج شندے نے شرکت کی۔ اس پروگرام کا افتتاح عبدالرشید قاسمی نے کیا۔ اس موقعے پر جناب الحاج ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کو ڈاکٹر سعداللہ ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ موصوف کو سند مومنٹو اور شال دے کر عزت افزائی کی گئی۔ یہ ایوارڈ بدست ایم ایل اے بلڈانہ جناب شندے صاحب دیا گیا۔ اختتام پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گوندگائیکی اور صدر شعبہ اردو پروفیسر ڈاکٹر شاہدہ مناف نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت محمد ہارون نے کی۔

بذریعہ ڈاک، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد، جنوری 2014

ابونعمان اور سعید احمد خاں کو اعزاز

نئی دہلی: عالمی یوم اردو تحریک کے بانی حکیم سید احمد خاں اور ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم جدید' کے مدیر انتظامی ابونعمان کی اردو کے لیے بے لوث خدمات کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا گیا۔ ایس آئی ٹی ہیڈ آفس، ابوالفضل انکلیو، میں منعقدہ جلسے کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ اس کے روح رواں صحافی سید منصور آغا، نائب صدر آل انڈیا ایجوکیشنل مومنٹ تھے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو اپنے الفاظ، محاوروں، اصطلاحوں اور ادبی سرمائے کے اعتبار سے بہت مالامال زبان ہے۔ یہی وجہ ہے اس شیریں زبان کے دیوانے غیروں میں بھی کم نہیں۔ تاہم بعض سیاسی وجوہ سے اس کے ساتھ تعصب برتا گیا مگر اب اس کا اثر کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ سید منصور آغا نے دونوں شخصیات کا بھرپور تعارف کرایا اور کہا کہ اس پروگرام کے انعقاد کا ایک مقصد یہ پیغام دینا ہے کہ اخلاص کے ساتھ جو کوشش کی جاتی ہے وہ رنگ ضرور لاتی ہے۔ حکیم سید احمد خان کو حال ہی میں دو ایوارڈ ملے ہیں جن کو ملا کر ان ایوارڈوں کی تعداد سات ہوگئی۔ سات کے عدد کی ہمارے لیے خاص اہمیت ہے، اس لیے یہ خیال آیا کہ حکیم صاحب کے اعزاز میں ایک نشست کی جائے اور اس میں ابونعمان کے اس حوصلے کی بھی داد دی جائے جس سے وہ اردو ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم جدید' کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ صحافی سہیل انجم نے ان دونوں کی شخصیت اور خدمات پر پرلطف و معلومات افزا خاکے پیش کیے۔ سید احمد خاں اور ابونعمان نے اپنی جوابی تقریروں میں اعتراف کیا کہ اس راہ میں ان کو کئی قدرداں ملے اور لوگوں کا ساتھ ملا۔ انھوں نے سید منصور آغا اور ان کے رفقا خصوصاً ماہنامہ 'صلاح کار' کے مدیر حامد علی اختر کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جنوری 2014

رسم اجرا:

قرآن مجید کی ملٹی لنگوئل ڈکشنری

نئی دہلی: معروف صحافی ضمیر احمد مضمر کی تصنیف کردہ ڈکشنری 'ملٹی لنگوئل ڈکشنری آف دی ہولی قرآن' کے اجرا کی تقریب جے ڈی یو کے رکن پارلیمنٹ علی انور انصاری کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر علی انور انصاری نے کہا کہ ضمیر احمد نے اس ڈکشنری کی تیاری میں 17 سال کا طویل عرصہ گزارا، اس کے پہلے ایڈیشن کا اجرا 20 اپریل 2011 کو بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کیا جب کہ دوسرے ایڈیشن کا اجرا جس میں بنگلہ زبان کا بھی اضافہ کیا گیا، کولکاتہ میں پروفیسر منال شاہ قادری کے ہاتھوں ہوا اور آج یہ تیسرے ایڈیشن کا اجرا ہے۔ ضمیر احمد نے اس موقعے پر وضاحت کی کہ اس ڈکشنری کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے جن پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ڈکشنری کی دنیا کے 26 ممالک میں پذیرائی ہوئی۔ اس ڈکشنری کو ترتیب دینے کا مقصد یہی رہا کہ لوگ قرآن کی جانب رجوع کریں اور قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پریشانیوں کا حل بتاتی ہے۔ اس ڈکشنری کو ملک کے بڑے بڑے ماہرین دینیات اور علما نے سراہا ہے اور کہا کہ یہ ڈکشنری دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی ڈکشنری ہے۔ اس موقعے پر معروف صحافی شنکرشن ٹھاکر کے علاوہ کئی معزز شخصیات موجود تھیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2014

سفر ہی تو ہے

الہ آباد: ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سول لائن واقع این سی زیڈ سی سی کے کشادہ ہال میں بزرگ شاعر اجمل سلطانپوری کا شعری مجموعہ 'سفر ہی تو ہے' کے اجرا کا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت پدم شری پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کی جب کہ خصوصی واعزازی مہمان کی حیثیت سے ایس ایم اے کاظمی سابق ایڈووکیٹ جنرل اتر پردیش، گوروکرشن بنسل (آئی اے ایس) سینئر ایڈووکیٹ ایم اے قدیر، پروفیسر علی احمد فاطمی، سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، ایجوکیشن ڈائرکٹر فیض الرحمٰن اور سینئر صحافی کمل نین پانڈے موجود رہے۔ اس موقعے پر اجمل سلطان پوری سے ان کی زبانی ان کے بیشتر کلام سنے گئے اور خوب سے خوب تر پذیرائی کی گئی۔ اس موقعے پر اجمل سلطانپور کو جہانگیر میموریل لٹریری اعزاز 2014 سے نوازا گیا۔ یادگاری نشان اور 25 ہزار روپے نقد دیے گئے۔ اس سے قبل محترمہ ڈاکٹر صالحہ رشید نے پروگرام کا آغاز بحسن خوبی افتتاحیہ اور مہمانوں کے استقبالیہ کلمات سے کیا۔ بعد ازاں پروفیسر شمس الرحمٰن کے ہاتھوں کتاب کا رسم اجرا عمل میں لایا گیا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ سرزمین سلطان پور کے خاکستر میں نعت گوئی کا ایک ایسا شاعر موجود ہے جس پر رشک کیا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایس ایم اے کاظمی نے کہا کہ اجمل سلطان پوری کی شاعری یہ واضح کرتی ہے کہ وہ نظیر اور کبیر کے روایت کے شاعر ہیں۔ انھوں نے نعت مقدس سے غزل تک کا سفر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ اجمل سلطانپوری نے نعت کے حوالے سے جو اشعار کہے ہیں وہ خالص تصوف اور معارفت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ فیض الرحمٰن نے کہا کہ اجمل سلطان پوری پرانی روایتوں کے شاعر ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2014

مولانا آزاد پر مشیر الحسن کی کتاب

نئی دہلی: نیوگی بک کی جانب سے مشہور مصنف اور معروف تاریخ داں پروفیسر مشیر الحسن کی کتاب 'اسلام پلیورلزم نیشنل ہڈیلیکیی آف مولانا آزاد' کی رسم اجرا پروگرام نئی دلی میں منعقد ہوا۔ مولانا آزاد کے 125 ویں یوم پیدائش پر منعقد اس پروگرام میں کونسل فور سوشل ڈیولپمنٹ کے صدر مچکند دوبے، ہندستان کے معروف مورخ پروفیسر عرفان حبیب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے خصوصی طور پر شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقررین کا کہنا تھا کہ اس کتاب کے مصنف پروفیسر مشیر الحسن کے غیر روایتی اسلوب اور تحریر نے نہ صرف قاری کی تاریخ سے دلچسپی میں اضافہ کیا ہے بلکہ بہت سی ایسی معلومات کا خزانہ لٹایا ہے جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ پدم شری پروفیسر مشیر الحسن ایک عالمی شہرت یافتہ مورخ ہیں ان کے دیگر قابل ذکر کارناموں میں 'کانگریسی مسلمانوں کی زندگیوں کی دریافت' شامل ہیں۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جنوری 2014

جھل مل کرتے تارے

انجمن ترقیِ اردو ہند مالیگاؤں کے زیرِ اہتمام نیز مہاراشٹر اردو اکادمی ممبئی اور اردو لائبریری ٹرسٹ مالیگاؤں کے اشتراک سے ادبِ اطفال سیمینار و جشنِ خیر اندیش کے موقع پر مختلف تقریبات کا انعقاد کیا گیا اس موقع پر ادبِ اطفال کی پانچ کتابوں کا اجرا بھی ہوا جس میں خاندیش کے معروف قلم کار جناب رحیم رضا کی تصنیف 'جھل مل کرتے تارے' (نظمیں برائے اطفال) کا اجرا معروف شخصیت ڈاکٹر سعید احمد فارانی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جھل مل کرتے تارے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے اس سے قبل بھی رحیم رضا کی کہانیوں کا مجموعہ 'معصوم محبت' اور نظموں کا مجموعہ 'پھول پھول خوشبو' کونسل کے تعاون سے شائع ہو چکے ہیں۔ محبانِ اردو اور خصوصاً اہلیانِ خاندیش کے لیے یہ بات باعث مسرّت ہوگی کہ مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے رحیم رضا کی کہانیوں کے مجموعہ 'سواری بادل کی' کو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ پریس ریلیز، رحیم رضا، مہاراشٹر، 9 جنوری 2014

لکڑ بھگے شہر میں

علی گڑھ: اردو اکادمی کے کانفرنس ہال میں اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیر اہتمام منعقد تقریب میں معروف ادیب وکرم سنگھ کے شعری مجموعہ 'لکڑ بھگے: شہر میں' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی جس کو پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر راشد شاز اور ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے کیا۔ ڈاکٹر فاطمہ زہرہ نے ڈاکٹر وکرم سنگھ کی شاعری پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نظموں میں آہستہ آہستہ جو فضا خلق ہوتی ہے وہ سماجی بدحالی، سیاسی ابتری اور منافقت کی ترجمانی کرتی ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ ڈاکٹر وکرم سنگھ کی شاعری دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ وہ جن استعاروں کا استعمال کرتے ہیں اسے نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ نظامت کے فرائض اکرم وارث نے انجام دیے۔ صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ اس موقعے پر معروف شاعر ڈاکٹر سراج اجملی اور احمد مجتبیٰ صدیقی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2014

گلبرگہ میں شعر و ادب

گلبرگہ: گلبرگہ ہمیشہ ہی علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ بہمنی دور میں ہی اس کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ گلبرگہ کبھی علما و ادبا سے خالی نہیں رہا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید شاہ گیسو دراز خسرو حسینی قبلہ نے 19 جنوری کی شام انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے خواجہ بندہ نواز ایوان اردو میں انجمن کی شائع کردہ کتاب گلبرگہ میں شعر و ادب کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر ریاسی کابینہ میں شمولیت پر وزیر بلدی نظم و نسق اقلیتی بہبود اوقاف نگراں الحاج قمر الاسلام نے اظہار تشکر کرتے ہوئے اردو زبان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے اردو داں طبقہ کی جدوجہد میں شمولیت کا اعلان کیا۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ محکمہ اقلیتی بہبود کا بجٹ جو 400 کروڑ روپے تھا انھوں نے اسے بڑھا کر ایک ہزار کروڑ روپے کردیا ہے۔ انھوں نے کہا وہ اردو کے گنگا جمنی سیکولر کردار کے تحفظ کے خواہاں ہیں، دوسری زبانیں بولنے والوں کو اردو سے واقف کروانے اور اردو تعلیم اور ادب کے مسائل کے لیے متحدہ جدوجہد وقت کا تقاضہ ہے۔ جناب حامد اکمل نے شعر و ادب کی ترتیب کے حوالے سے کہا کہ یہ کتاب ایک جامع تذکرہ اور مکمل تاریخ کی تدوین کی پیاس کو بڑھانے اور نئی نسل کے محققین کے لیے مزید تلاش و تحقیق کی تحریک کا سبب بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر حشمت علی فاتحہ خوانی نے نہایت مختلف اصناف پر لکھے گئے مقالوں کا جائزہ پیش کیا۔ الحاج اقبال احمد سرڈگی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ انھوں نے اپنے جامع خطاب میں کہا کہ گلبرگہ میں شعر و ادب کو بڑی جانفشانی سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب موجودہ زمانے کی سب سے بہترین دستاویز ہے اسے ہم گلبرگہ کی ادبی انسائیکلوپیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ جناب خواجہ پاشاہ انعامدار نے تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ صدر انجمن جناب ولی احمد نے خیر مقدم کیا جب کہ جناب امجد جاوید نے مہمانوں کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انیس صدیقی نے نظامت کی۔

پریس ریلیز، حامد اکمل، ایڈیٹر KBN ٹائمز اردو، گلبرگہ، 21 جنوری 2014

وفیات

شباب للت

ڈاکٹر شباب للت اردو کے مایہ ناز قلمکار گزشتہ 7 فروری 2014 کو طویل علالت کے بعد ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

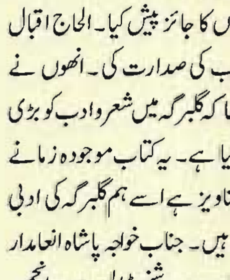

موصوف شعر و شاعری کے علاوہ نقد و تحقیق میں بھی اچھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ وہ ماہرِ عروض بھی تھے۔ اردو کے 12 ہندی کے 5 اور ہماچلی شاعری کے دو مجموعے شائع ہو کر اہلِ ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا اصل نام بھگوان داس للت ہے اور والدِ مرحوم کا اسمِ گرامی ہے رام کرشن للت۔ ضلع مظفر گڑھ (پاکستان) میں ان کی ولادت 3 اگست 1933 کو ہوئی تھی۔ اردو میں گولڈ مڈلسٹ تھے۔ جب وہ 14 سال کے ہوئے تو تقسیمِ ملک کا روح فرسا سانحہ پیش آیا تھا۔ والدین کے ساتھ ہندوستان آکر شملہ میں آباد ہوگئے جو ان کا وطنِ ثانی بن چکا تھا۔ (مرسلہ: سید نور الٰہی ناطق، مدیرِ معاون ادبی محاذ، کٹک)

خالد بن سہیل

نئی دھلی: ملک کے مشہور آرٹسٹ اور شاعر و ادیب خالد بن سہیل 17 جنوری 2014 کی صبح گجرات کے سورت شہر میں انتقال کر گئے۔ تقریباً ایک دہائی سے خالد بن سہیل

کو ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ 18 جنوری کو بعد نماز مغرب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ خالد بن سہیل کا آبائی وطن فتح پور (اتر پردیش) تھا۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ ڈاکٹر حمیرہ محمود آفریدی ہیں، جو کہ اے ایم یو کے ویمنس کالج میں اردو کی استاذ ہیں۔ خالد بن سہیل نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فائن آرٹ سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہیں چند برس عارضی لیکچر کے طور پر تدریسی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ خالد بن سہیل نے ممبئی میں اسسٹنٹ آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ مشہور شاعروں پر مشتمل علی سردار جعفری کے سیریل 'کہکشاں' اور فخر الدین علی احمد سے متعلق دستاویزی فلم کے علاوہ فلم 'پنجر' میں بھی خالد بن سہیل نے آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ دلی میں خالد بن سہیل نے آرٹ سے متعلق کئی نمائشیں لگائیں جن میں خسرو نامہ اور گوتم بدھ سے متعلق اسکیچز کی بہت پذیرائی ہوئی۔ دلی میں لگنے والے جوراسک پارک میں آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر بھی خالد بن سہیل کی خدمات بہت نمایاں رہی ہیں۔ خالد بن سہیل کی نظموں کا مجموعہ 2005 میں 'مونولاگ' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ رسالہ 'جامعہ' میں صادقین، آزر زوبی اور بعض دوسرے آرٹسٹوں کے فن اور سوانح سے متعلق ان کے کئی مضامین شائع ہوئے تھے۔ این سی ای آر ٹی اور این بی ٹی کی اردو کتابیں اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز کے رسالوں اور دلی کتاب گھر کی بعض کتابوں کے ٹائٹل خالد بن سہیل کی فنکاری کے گواہ ہیں۔ دلی سے شائع ہونے والے رسالہ 'نئی کتاب' کا اولین ٹائٹل

بھی خالد بن سہیل کا بنایا ہوا ہے۔ خالد بن سہیل کی وفات پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام اساتذہ بالخصوص پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر کوثر مظہری وغیرہ اور اردو خط و کتابت کورس کے ڈاکٹر عبدالرشید نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 جنوری 2014

محمود سنبھلی

سنبھل: معروف شاعر محمود سنبھلی کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا، وہ 70 برس کے تھے۔ اطلاع کے مطابق محلہ دیپا سرائے کے رہنے والے محمود سنبھلی کمزور و متوسط درجہ کے افراد کی بے لوث مدد کیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے جہاں دنیائے ادب میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ پسماندگان میں انھوں نے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ شہر میں ان کے انتقال کی خبر کے بعد آخری دیدار کے لیے ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات پہنچنے لگیں۔ اس موقعے پر رضوان مسرور سنبھلی نے کہا کہ محمود سنبھلی ہر دلعزیز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ اس موقعے پر عرفان صبا، انتخاب عالم، نوشاد اشرف، کوثر سنبھلی، سعد نعمانی وغیرہ نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور مرحوم کی شاعری اور فن پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2014

انور کمال حسینی

نئی دہلی: سید امان الرحمٰن (انور کمال حسینی) کا گزشتہ (12 جنوری) کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 76 برس تھی۔ پسماندگان میں بیٹی سعدیہ رحمٰن کے علاوہ دو بیٹے اور اہلیہ ہیں۔ ایس اے رحمٰن نے تمام عمر اردو زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت میں بسر کی۔ وہ 1971 میں نیشنل بک ٹرسٹ کے ادارتی شعبے سے وابستہ ہوگئے اور 1995 میں اسی ادارے سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے لندن اور قاہرہ میں منعقدہ کتابوں کی نمائش میں ہندوستان کی نمائندگی کی اور این بی ٹی کی طرف سے منعقدہ قومی اور بین الاقوامی کتاب میلوں اور سمیناروں کے لیے کام کیا۔ ایس اے رحمٰن نے انور کمال حسینی کے نام سے بچوں کے لیے اہم کتابیں تخلیق کیں۔ انھوں نے ٹارزن سیریز کی ایک درجن کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے افریقی جنگلات کے ہیرو ٹارزن کو اردو قارئین سے متعارف کرایا۔ 'الف لیلیٰ' اور 'طلسم ہوش ربا' کے انتخابات شائع کرائے اور نظموں، غزلوں، منفرد اشعار کے انتخابات بھی پیش کیے۔ سماجی ناول 'جلیس' تصنیف کیا۔ ان کی تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر اردو ادب اور صحافت کی جانی مانی شخصیات موجود تھیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 جنوری 2014

امتیاز الدین خاں

پرتاپ گڑھ: اردو شعر و ادب کی معروف شخصیت، ادیب، شاعر و ایڈوکیٹ امتیاز الدین خاں کا مختصر علالت کے بعد 13 جنوری 2014 کو انتقال ہوگیا وہ 1930 میں پرتاپ گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی اردو شعر و ادب کی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم محنت، سچی لگن، انکساری اور نرم گفتاری کے باعث لوگوں میں مقبول تھے۔ ان کو شہر کی مختلف سماجی اور ادبی تنظیموں نے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ ان کی تصنیفات میں مکالمات اقبال، نعتوں کا مجموعہ نور و نکہت، عکس رنگی، پرتاپ گڑھ کی ادبی یادیں، نازش شخصیت اور شاعری، میری ترجمہ نگاری کا سفر، امتیاز الدین نامہ کے علاوہ ان کا رامائن کا اردو میں ترجمہ بھی قابل ذکر ہے۔ حسن الدین احمد کے ذریعہ شائع کیے جانے والے 'ساز مغرب' میں امتیاز الدین خاں کے انگریزی نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ان کی کئی تصنیفات غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ انھوں نے ایک مترجم کی حیثیت سے اردو، انگریزی اور ہندی کی تخلیقات دوسری زبانوں میں منتقل کی ہیں۔

جب براک اوباما پہلی بار امریکہ کے صدر منتخب کیے گئے تو امتیاز الدین خان نے ان پر ایک نظم لکھی۔ جب وہ نظم انھوں نے اوباما کے پاس بھیجی تو وہ بہت متاثر ہوئے اور اسے وہاں کے یادگاری مجلّہ میں شامل کیا گیا۔ امریکی صدارتی محل سے مذکورہ مجلّہ کی ایک کاپی امتیاز الدین خان کو بھیجی گئی تھی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2014

خراج عقیدت

وارث علوی

اردو کے معروف ادیب پروفیسر وارث علوی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر وارث علوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر سید رضا حیدر نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ پروفیسر وارث علوی اپنی معیاری تحریر کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ادارے نے اپنے اعزاز 'غالب انعام' برائے اردو تنقید و تحقیق 2004 سے انھیں سرفراز کیا تھا۔ اللہ ان کے درجات میں اضافہ کرے اور ان کے احباب کو صبر جمیل عطا کرے۔

اردو کے نامور ادیب اور نقاد وارث علوی کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ نشست کے آغاز میں انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے وارث علوی کی وفات کو اردو تنقید کا بڑا خسارہ قرار دیا۔ شاہد ماہلی نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے نامور نقاد، انشا پرداز اور دانشور وارث علوی کا انتقال اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ وارث علوی ایک بیباک اور جرأت مند نقاد تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ اردو کے نامور ادیبوں کی صف میں ایک زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا ان کی موت سے ہم نے اردو کا ایک بیش قیمتی جواہر کھو دیا ہے۔ انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے زبانوں کے مرکز میں مایہ ناز ناقد پروفیسر وارث علوی کی رحلت پر ایک تعزیتی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر اخلاق احمد آہن نے کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں اخلاق آہن نے بتایا کہ اردو کے مایہ ناز ادیب و ناقد وارث علوی کے چلے جانے سے ادبی دنیا ایک عہد کی نمائندہ ادبی شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ فکشن تنقید کے حوالے سے وہ ایک طویل عرصے سے اردو ادب کی رہنمائی کر رہے تھے۔ شعبۂ ہندی کے پروفیسر گوبند پرساد نے کہا کہ ان کی کتابیں 'راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ' اور 'منٹو: ایک مطالعہ' فکشن تنقید میں ایک نئی راہ متعین کرتی ہیں اور ان کی تحریروں سے متاثر ہوکر لوگوں نے بیدی اور منٹو کو نئے سرے سے دریافت کیا۔ شعبہ اردو سے وابستہ ماہر سرداریات ڈاکٹر عمر رضا نے ان کی رحلت پر افسوس کا اظہار کیا۔ جلسے کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر منتظر قائمی نے کہا کہ وارث علوی نے بیدی فہمی اور منٹو فہمی کے حوالے سے جو تنقیدی خطوط کھینچے ہیں اس سے فکشن کے افہام و تفہیم میں ایک نیا باب وا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد ہادی رہبر نے کہا کہ ڈاکٹر وارث علوی نے موجودہ دونوں تنقیدی دبستان سے الگ اپنی راہ نکالی اور شعریات کے مقابلے فکشن تنقید کو اپنایا فکشن کی تنقید میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر خان عبدالرافع نے وارث علوی کو جدید فکشن تنقید میں ایک سنگ میل قرار دیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2014

مظفر حسین برنی کے انتقال پر تعزیتی جلسے

نئی دہلی: ہریانہ کے سابق گورنر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی سید مظفر حسین برنی کے 7 فروری 2014 کو

ہوئے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ سید مظفر حسین برنی کے انتقال سے ہماری علمی، ادبی اور سیاسی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے پر کرنا بہت مشکل ہے۔ شاہد ماہلی نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم سید مظفر حسین برنی ایک سرپرست کی حیثیت سے ہماری ہمیشہ رہنمائی کرتے رہے۔ ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ سید رضا حیدر نے اس موقعے پر کہا کہ مرحوم برنی کا علمی و ادبی دنیا میں خصوصاً خطوط اقبال کے تعلق سے جو کام ہے اس سے ہمیں ہمیشہ روشنی ملتی رہے گی۔ دوسری جانب اراکین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے سید مظفر حسین برنی کے سانحۂ ارتحال پر اظہار تعزیت اور مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے کہا ہے کہ برنی صاحب کو علم و ادب سے خصوصی رغبت تھی۔ انھوں نے سخت محنت اور لگن سے علامہ اقبال کے خطوط تلاش کیے اور ان کی چار جلدیں کلیات مکاتیب اقبال کے نام سے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیں جن کا برصغیر میں خیر مقدم ہوا۔ اقبال پر انگریزی میں ان کی کتاب Iqbal Poet Patriot of India کی بھی علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔

روزنامہ 'عالمی سہارا'، دہلی، 12 فروری 2014

رفعت سروش کی یاد میں

نئی دھلی: رفعت سروش اپنی تحریر اور دلکش آوازوں میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ وہ ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار رفعت سروش کے 88 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ادیب و دانشور نے کیا۔ رفعت سروش کی حیات و خدمات سے روشناس کرانے اور ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے 'پرواز شاہین رفعت سروش اکادمی' رشین سینٹر آف سائنس اینڈ کلچر کے اشتراک سے فیروز شاہ روڈ پر بی ایس آر ایس اے کی ڈائریکٹر پروفیسر شاہین خان کی سربراہی میں اس پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پرواز شاہین، رفعت سروش اکادمی کے مینیجنگ ڈائرکٹر اور رفعت سروش کے نواسے احمر خان نے دس منٹ کا موسیقی پر مشتمل پروگرام پیش کیا۔ ساتھ ہی رفعت سروش کے حالات زندگی اور ان کی کامیابی و کامرانی پر مشتمل 11 منٹ کی ڈاکومنٹری فلم بھی دکھائی گئی جس کو رفعت سروش کی صاحب زادی پروفیسر شاہین خان اور پرواز شاہین رفعت سروش اکادمی کی ٹیم نے مل کر بنایا ہے۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی ایم پی وچھتیس گڑھ ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس فخر الدین اور دیگر مندوبین نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ دن آج بھی بہت اچھی طرح یاد آتے ہیں جب ہم آل انڈیا ریڈیو سے رفعت صاحب کی آواز سنتے تھے۔ اس وقت ہمیں لگتا تھا کہ جیسے صحیح معنوں میں 'آکاش وانی' سن رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2014

ڈاکٹر عبیدالرحمٰن

نئی دھلی: اردو سوسائٹی دیال سنگھ کالج کے زیراہتمام مشہور شاعر اور سائنس داں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، اس میں مولا بخش نے کہا کہ بستر مرگ پر اسپتال میں ہر ملاقات میں وہ اپنے گھر بار اور بال بچوں سے زیادہ زبان و ادب اور ثقافت کی فکر کرتے نظر آئے۔ کوثر مظہری نے اس موقعے پر کہا کہ ہم نے ایک سچا دوست اور شاعر کھودیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کمی کا احساس ہمیشہ رہے گا۔ مشتاق صدف نے کہا کہ عبیدالرحمٰن نے یہ ثابت کیا کہ ایک اچھا انسان ایک اچھا ادیب بھی ہوتا ہے۔ ساجد حسین نے کہا کہ عبیدالرحمٰن کے چلے جانے کے بعد اب ان کی اچھائیاں روشنی دکھائیں گی۔ ابوظہیر ربانی نے کہا کہ عبیدالرحمٰن کی شاعری کے مختلف گوشوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علاء الدین نے کہا کہ عبیدالرحمٰن کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ ہے، ان کے سائنسی مضامین کو ازسرنو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ عبیدالرحمٰن کے اب تک تین شعری مجموعے اور اردو میں سائنس کے موضوع پر دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ حال ہی میں اردو میں سائنسی ادب کے حوالے سے اردو اکادمی سیمینار پر مبنی ایک کتاب ان ہی کی مرتب کردہ شائع ہوئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2014

مولانا عبدالقدوس حمادالقاسمی

نئی دھلی: مشہور و معروف صحافی، مصنف مولانا عبدالقدوس حمادالقاسمی ایڈیٹر ماہنامہ ندائے سنت دارالمبلغین لکھنؤ کے انتقال پر اظہار رنج و ملال کرتے ہوئے مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی چیرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ نے کہا مولانا عبدالقدوس حمادالقاسمی بڑے باغ و بہار و منجا مرنج اور سیاسی، صحافتی و سیاحتی ذوق و مزاج رکھنے والے بزرگ تھے۔ موصوف مدت العمر صحافت، تدریس اور تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے۔ آپ نے مختلف عصری موضوعات پر مضامین و رسائل قلمبند کیے اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو بھی بحسن خوبی نبھایا۔ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے مزید کہا کہ مولانا عبدالقدوس حمادالقاسمی مرحوم، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے مجاز بیعت، حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم مفتی بنارس کے چھوٹے صاحبزادے اور مولانا جنید احمد بنارسی کے حقیقی چچا تھے۔

پریس ریلیز، آنس سکریٹری، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 8 جنوری 2014

محمد علی جوہر کو خراجِ عقیدت

کانپور: مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی تحریک آزادی کے صرف ایک عظیم رہنما ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ صحافی، مفکر، ادیب اور ساتھ ہی ایک کامیاب ماہر تعلیم بھی تھے۔ ان کے 83 ویں یوم وفات پر ہفتے کو موومنٹ فار مسلم امپاورمنٹ کے دفتر میں منعقدہ مذاکرے میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا۔ تنظیم ہذا کے جنرل سکریٹری عشرت صدیقی نے بتایا کہ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے فکر و عمل سے برصغیر ہند و پاک کی سیاسی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کی سیاسی خدمات کا جائزہ کسی خاص جماعت کے منشور یا کسی مکتبۂ فکر کی روایات کے آئینے میں نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اس عہد کے گرد و پیش اور اس کے حالات پر دیکھنا چاہیے۔ مولانا نے 9 نومبر 1930 کو لندن کی گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو مجھے یہاں ایک قبر دینی پڑے گی۔ یکم جنوری 1931 کو وزیر اعظم انگلستان کے نام ایک خط لکھوایا۔ پانچ بجے آرام کرنے کے لیے گئے دو گھنٹے بعد فالج کا دورہ پڑا۔ 4 جنوری کو انتقال ہوگیا اور 24 جنوری کو بیت المقدس میں تدفین ہوئی۔ انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے سوشل ورکر فورم کے زیراہتمام محمد علی پارک واقع جوہر لائبریری میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں عرفان انصاری، غفران احمد چاند، شاکر علی عثمانی، حاجی اشتیاق احمد نظامی، دلشاد قریشی، توحید عالم، منا اور ڈاکٹر مصطفیٰ طارق نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا قابل تقلید شخصیت تھے۔ ہمیں ان کے اصولوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 جنوری 2014

بھارت کے دیہی علاقوں میں لوگوں کے لیے
پینے کے صاف پانی کی فراہمی کو یقینی بنا رہے ہیں

پینے کے پانی کا
قومی دیہی پروگرام

محفوظ ذخائر کا انتظام

سماجی شراکت

پینے کے پانی کا قومی دیہی پروگرام مہیا کرائے گا
بھارت کے دیہی علاقوں میں پینے کا صاف پانی ہر وقت

پانی کے معیار کی جانچ

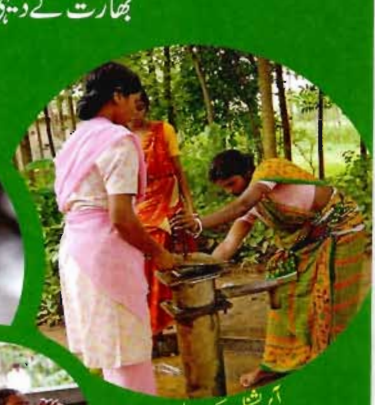

آپریشنل دیکھ بھال

اسکولوں میں پینے کا صاف پانی

قومی ہدف
دیہی علاقوں میں ہر شخص کو پینے، کھانا پکانے اور دیگر گھریلو بنیادی ضرورتوں کے مطابق مستقل طور پر صاف وشفاف پانی کی فراہمی

unicef

یونیسیف کے ذریعے تکنیکی مدد

सत्यमेव जयते

صفائی اور پینے کے پانی کی وزارت
حکومت ہند

davp 35301/13/0008/1314

सत्यमेव जयते

وزارت اطلاعات و نشریات

حکومت ہند

تنہا تو یہ ملک بنا نہیں ہے

ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا

تبھی تو بنا یہ بھارت

کچھ یوں ہی ہم نے مل کر بڑھایا

ملک کو ترقی کی راہ پر

تو کیوں نہ کہیں، ہم سب نے مل کر

بنایا یہ بھارت

65 واں یوم جمہوریہ

davp 22202/13/0101/1314